فقیر بستی میں تھا
علی اکبر ناطق
عکس
AKSPUBLICATIONS

فقیر بستی میں تھا

علی اکبر ناطق

کتاب	فقیر بستی میں تھا
مصنف	علی اکبر ناطق
صفحات	240
اشاعت	2019
تعداد	500
قیمت	600

AKSPUBLICATIONS

Book Street, Data Darbar Market, Lahore.

Ph:042-37300584,Cell # 0300-4827500-0348-4078844

E-mail:publications.aks@gmail.com

انتساب

آغا سلمان باقر

کے نام

فہرست

پیش لفظ

اِس کتاب کی تیاری میں جن احباب کی شکر گزاری لازم ہے، اُن میں ڈاکٹر مختار احمد عزمی صاحب سرفہرست ہیں کہ میری ہر قدم پر دل و نظر کے ساتھ حوصلہ افزائی کی۔ دوسری شکر گزاری آغا سلمان باقر کی ہے۔ یہ دو طرفوں سے میرے محسن ہیں، اول مولانا آزاد کے نبیرہ ہیں، دوم میرے کام کو بھرپور تعاون دینے والے بھی ہیں۔ یہاں مجھے عکس کے پبلشر محمد فہد کا بھی شکر گزار ہونا چاہیے جس نے اِس کتاب کو چھاپنے میں روشنی کی رفتار سے کام لیا۔ اِس کے علاوہ مجھے کچھ نہیں لکھنا۔ جو کچھ لکھنا تھا، وہ کتاب میں لکھ چکا ہوں، احباب خود فیصلہ کریں گے، کہاں تک کامیاب ہوا ہوں۔

علی اکبر ناطق

ہفت اقلیم ہر گلی ہے کہیں
دلی سے بھی دیار ہوتے ہیں

مولانا محمد حسین آزاد

ایک تھا جہان آباد

احباب، زمانہ گزر جاتا ہے، تصویریں رہ جاتی ہیں۔ اگر ان تصویروں میں پہچانی ہوئی صورتوں کی نیک روحیں بستی ہوں تو کلیجہ کیسا کیسا خون ہوتا ہے، یہ بات کلیجے والے جانتے ہیں۔ دیکھ لو، یہ ہے وہ شہروں کا شہر، شاہجہان آباد، جس کا نقشہ سب سے پہلے مغلوں والے بادشاہ شہاب الدین کی آنکھوں میں تحریر ہوا اور اسی کے دل کے گوشے پر آباد بھی ہوا۔ یہ بادشاہ ہندوستان بھر کے اطراف میں شہر بساتا تھا، باغ لگاتا تھا۔ یہاں بھی اس نے جوت جگائی اور دہلی بسائی۔ کئی پرانی دہلیاں یہاں آس پاس کھنڈرات پڑی تھیں، ایک مہرولی تھی، جہاں التمش اور قطب الدین شمسی تال بچھا کے سو گئے، عجوبے مینار بنا کے سو گئے۔ ایک تغلق کی دلی تھی، ایک شیر شاہ کی دہلی تھی، ایک دلی چندر گپت موریہ کی تھی، سب آس پاس جمنا کے برباد پڑی تھیں، بے آباد پڑی تھیں۔ تب یہ دہلی شاہ جہان آباد کی بسی۔ پھر یہ ہماری آپ کی دلی ہو گئی، جس سے ہم مرزا اور میر اور غالب اور ذوق اور محمد حسین آزاد کی نیک سیرتوں اور پیاری صورتوں کے سبب بہت واقف ہیں۔ یہی شاہ جہان آباد، جس کے گل پھول پر نغمے کہتے کئی بلبلیں دہر کے چمن سے اڑ گئیں اور دلوں کے باغ ویران کر گئیں۔

اصل اِس شہر کی کچھ اس طرح ہے کہ یہ علاقہ پہلے پہل ایک بھرا پُرا جنگل تھا۔ جنوروں سے کھچا کھچ، پھول پتوں سے لدا پھندا۔ ہر وقت ہرے ہرے پانیوں کی پھیریاں رہتیں۔ روشن گھاس کے قطعے اور چکنے درختوں کی ڈالیاں لہلہاوٹیں لے کر مسکراتیں اور بلبل و مینا ایک ہی ڈالی پر بیٹھ کر چہچہے لگاتیں۔ جس وقت جمنا بہاؤ پر ہوتی، یہاں آب حیات بہا کر گزر جاتی۔ اِس سبب سارا جنگل کِھلا کِھلا رہتا، جہاں بن باسیوں کا بسیرا اور جوگیوں کا پھیرا رہتا۔

صاحبقراں نے اِس باغ و بہار خطے کو دیکھا تو آنکھوں میں خواب جاگنے لگے اور جی میں ایسا شہر بسانے کی آئی، جس کی مثال پورب پچھم کے پھیلتے جہانوں میں کسی نے نہ پائی۔ جو سمرقند و بخارا کی شہرت گرد میں ملا دے اور بغداد کے نام پر ہل چلا دے۔ دُور دُور کے سخن نصیب اور کاریگر جمع ہو کر شیراز و اصفہاں کی رونق کو فق کر دیں اور فرنگ کے ملکوں کا سینہ شق کر دیں۔ تاجر پیشہ دیس دیس کا مال یہاں لا کر پھیلا دیں اور اِس شہر کو نگار خانۂ چین بنا دیں۔ یہ خیال جی میں آنا تھا کہ بادشاہ سلامت نے جمنا کے پاٹ کو پچھواڑے رکھ کر لال قلعے کی فصیل کھینچ دی۔ فلک نشان دیوار پر بڑے بڑے بُرجوں کے پہاڑ رکھ کر فصیل کی ہیبت کو دوچند کیا اور چوڑے کنگروں اور اُونچے میناروں سے اس کو مزید رونق دی۔ جب یہ سب ہو چکا تو اس سُرخ قلعے کے سامنے کئی سینکڑے گز کھلا میدان چھوڑا، جس کے آگے شہر دلی کا نقشہ اس طرح جمایا کہ جمنا کی طرف قلعہ اور قلعے کے آگے شرقی غربی شہر کی چارکونی طشت رکھ دی اور نام اُس کا رکھا شاہجہان آباد۔

قلعے کی عمارت کا مختصر احوال اِس طرح ہے کہ خاص محلات کی ایک قطار جمنا رُو سن دیوار کی چھاتی پر جما کر دی اور اُن محلوں کے اندر پانچ ہاتھ چوڑی اور ایک ہاتھ گہری نہر بہا دی۔ نام اُس کا نہرِ بہشت رکھا، جو محلوں کے بیچوں بیچ سے ہو کر قلعے کے باغوں کا چکر بھرتی، پھر جھروکا کے سامنے والے مرمریں حوض میں جا گرتی، جہاں فوارے پھولتے اور اُن کے

اندر مہتابیاں جگمگاتیں اور حوض کے پانی کو زرد رنگوں سے شرماتیں۔ اس نہر کا پانی دریائے جمنا سے قلعے کی بلندی پر چڑھانے کا بندوبست کچھ یوں تھا کہ دریا سے قلعے کی اونچائی تک تانبے اور کانسی کی ٹینڈوں کی ایک مہال تھی، جسے قلعے کے اُوپر ایک بڑے چرخ کے ساتھ چلا دیا گیا تھا۔ اس چرخ کو چکر دینے کے واسطے چار بیل سارا دن جُتے رہتے، جو چرخ کو پھیرے دے دے کر مہال کو اوپر کھینچتے اور پانی چرخ کے نیچے بنے حوض میں گر گر کر آگے نہر کی طرف چلا جاتا۔ دریا کا پانی گدلا ہوتا تھا اس لیے یہ نہر اُس پانی کو پاس ہی ایک چبوترے پر موجود کنوئیں میں گرا دیتی۔ یہاں اُس میں قلعی اور ابرق ملا کر پہلے اُسے شیشے کی طرح صاف اور ٹھنڈا کیا جاتا، اُس کے بعد اِس نہر میں چلایا جاتا تھا، جو اُسے محلوں تک لے جاتی محلوں کے اندر اور نہر کے اُوپر گاہ گاہ سنگ مرمر کے سفید تختے بچھے رہتے تھے۔ جن پر چاندی کی پلنگڑیاں اور صندل کے تخت لگے پڑے رہتے۔ ساری گرمیاں بیگمات، شہزادیاں اور بادشاہ سلامت انہی پلنگڑیوں پر چوکڑی مار کر بیٹھتے اور اِس پانی کی شفاف نہر میں پاؤں رکھے آرام فرماتے اور زعفران کے شربت پی کر سینہ ٹھنڈا رکھتے۔

محل کے دائیں جانب جمنا کی طرف سنگ مرمر کی جالیاں اور جھروکے تھے۔ جن کے اُوپر شہزادوں کے سفید کبوتر محل کے جھروکوں سے جمنا اور جمنا سے جھروکوں تک پھریریاں لے کر اُڈاریاں بھرتے اور ہم مزاجوں کو سبز باغوں کے سفید پھول دکھاتے۔ انہی جھروکوں سے جمنا کی ہوائیں چھن چھن کر اندر آتیں اور محل کو ہر وقت سردیوں کی طرح ٹھنڈا رکھتیں۔ جاڑے کے دنوں میں نہر بہشت بند کر دی جاتی اور اس میں پانی کی جگہ پارے کے بڑے بڑے طشت رکھے جاتے تھے، جن کے بیچ لوبان اور کستوری کے جوہر دہکا کر پڑے رہتے اور شراب کے شیشے بھی سونے چاندی کے ورقوں میں یہیں لگے سجتے۔ اسی خواب گاہ کے ساتھ ایک بڑا مسقف دالان تھا۔ جہاں بادشاہ سلامت حرم، شہزادے اور شہزادیوں کے ساتھ مل کر خاصہ تناول فرماتے اور نذریں وصول کرتے۔ اسی نہر والے محل

چوک تھا، جس کے ایک کونے پر برگد کا درخت تھا۔ اُس کی چھاؤں میں میر صاحب اکثر آرام فرمایا کرتے تھے اور یہیں بیٹھے بیٹھے جہان آباد کے بلوریں لونڈوں، آتے جاتے ترک امردوں اور سبزہ رخوں کی زیارت کرلیا کرتے اور جی بہلالیا کرتے تھے اور یہ بھی سنا ہے، جب وہ خود بھی خوش رُو تھے اور باپ کے مرنے کے بعد ورثے میں ملی ہوئی کتابوں کی درستی کرکے بیچتے تھے، وہ بھی یہی جگہ تھی کہ قلعہ کے سامنے اور اُمرا کے آنے جانے کے راستے پر یہ اچھا ٹھکانا تھا۔ وہ برگد کا درخت اب بھی وہاں موجود ہے۔

چوک میں کوتوالی چبوترہ بھی تھا۔ اس سے چار سو گز آگے ایک اور ہشت پہلو چوک تھا، جسے چاندنی چوک کہتے ہیں۔ یہیں پر بیرم خاں کا وہ تراہا ہے، جس کے بائیں ہاتھ ایک چھوٹی سی مسجد تھی، اِسے سنہری مسجد کہا جاتا تھا۔ اِسی تراہے کے درمیان کھڑے ہو کر نادر شاہ نے دہلی کی عوام کے قتل کا حکم صادر فرمایا تھا۔ اس چوک کے گرد بہت خوبصورت دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ بیرم خاں کے تراہے سے شمال کی طرف ایک باغ تھا، جس کو صاحب آباد یا بیگم کا باغ کہتے تھے۔ اس کے آگے چار سو ساٹھ گز لمبا بازار ہے اور درمیان میں یہی نہر بہتی تھی جو آگے فتح پوری مسجد تک جاتی تھی۔ یہ وہی مسجد ہے، جس کے بارے میں مرزا غالب نے کہا تھا، امراو بیگم نے گھر کو فتح پوری کی مسجد بنا رکھا ہے۔ یہ بازار ہی دلی کا مرکزی بازار تھا ،جو فتح پوری مسجد تک پورے کا پورا چھوٹے چھوٹے سُرخ پتھروں سے چارپائی کی طرح بُن کر شاہی سواری کے لیے بنایا گیا تھا تاکہ سواری کے گزرتے ہوئے مٹی کے ذرے نہ اُڑیں اور عوام بازار کے گرد دو رویہ کھڑے ہو کر بادشاہ سلامت کی سواری کا نظارا کر سکیں اور اسکی زندگی اور بادشاہت کو دعا دے سکیں۔ سُرخ پتھروں کو ٹھنڈا رکھنے کے واسطے کئی کئی ماشکی نہر سے مشکیزے بھر بھر کر سڑک پر چھڑکاؤ کیا کرتے اور شام ہوتے ہی پورے بازار میں لالٹینیں جگمگا اُٹھتیں، جن کے سائے سائے تُرک اور ایرانی پریزاد ٹہلا کرتے تھے۔ چاندنی چوک سے تھوڑا پہلے روک کر اُس میں سے بائیں ہاتھ کی طرف ایک چھوٹا بازار اور بھی نکال

میں ہی جہاں پناہ خاص خاص لوگوں سے اور شہزادوں کے ساتھ ملاقات فرماتے تھے۔ جیسے مرزا فخرو، حکیم احسن اللہ خان یا استاد ذوق اور مولوی محمد باقر۔ بعد میں کچھ دنوں کے لیے مرزا نوشہ نے بھی یہاں کی حاضری دی اور بادشاہ کی اقبال مندی کا قصیدہ کہا۔

اس نہر کے علاوہ ایک اور نہر تھی۔ چاندنی چوک بازار میں بہنے والی اس نہر کو سب سے پہلے شہاب الدین محمد شاہجہاں سفیدون تک صاف کرا کے پہلے قلعہ شاہجہاں تک لایا، جب لال قلعہ بن چکا تو نہر کو آگے چاندنی چوک بازار میں جاری کر دیا۔ یہ نہر جمنا سے قلعے کی بیرونی دیوار کے ساتھ ساتھ گھسیٹ کر شمال کی طرف سے شہر میں داخل کی گئی تھی اور پاٹ سے لے کر کناروں تک سراسر سُرخ پتھروں سے بنی تھی۔ حقیقت میں شاہجہاں آباد کا وجود اسی نہر کے پانی سے گُندھ کر تیار ہوا تھا، جس کی مٹی میں وہ وہ سورج اور ماہتاب تارے دفن ہیں کہ اُن کی نور سے ہمارے آپ کے دلوں کے چراغ منور ہیں۔ یہ دوسری نہر شہر میں داخل کر کے اور لال قلعے کے سامنے سے گزار کر چاندنی چوک کے بازار میں بہا دی گئی۔ یہ وہی چاندنی چوک کا بازار ہے، جس کو شاہجہاں بادشاہ کی بیٹی جہاں آرا بیگم نے بنوایا۔ کیفیت اس بازار کی یہ ہے کہ قلعہ کے سامنے چار سو اسی گز کا میدان چھوڑ کر شہر کے حدود شروع ہونے سے پہلے اسی گز قطر کا ایک چوک ہے، جہاں بے شمار شہتوتوں کے تنکیے ہری چھاؤں کے ساتھ میٹھی اور لمبی گوہلوں کو بکھیرتے۔ یہیں جھنڈ کے جھنڈ لگے پیپلوں کی چھاؤں میں شہر کے اُمرا کی سواریاں جھولتیں، شُرفا کی پالکیاں اُٹھتیں، عوام الناس کی اُونٹ گاڑیاں چلتیں اور پیدل چلنے والوں کی چہل پہل رہتی۔ شربت بیچنے والوں کی چوکیاں، مُرغ اور بٹیر لڑانے والوں کی پالیاں بھی اسی چوک میں جمتیں۔ پتلی تماشے، بانک اور بنوٹ کے کھیل بھی یہیں لگائے جاتے یا پھر کبھی کبھی جامعہ مسجد کے سامنے اکھاڑے لگتے۔ نقارچی اور دمامے پیٹنے والے اپنے دماموں اور نقاروں کی اوٹ میں یہیں بیٹھتے۔ اسی چوک میں میلاد النبی اور محرم کے جلوس نکلتے اور امام کے ماتم داروں اور زنجیر زنوں کے حلقے جمتے۔ یہی وہ

دیا گیا تھا، جو جامع مسجد کے شمالی دروازے کو سلام کر کے وہیں رک جاتا تھا۔ وہ بازار وہاں آج بھی ہے۔ بائیں ہاتھ جامع مسجد صاف نظر آتی ہے۔ جامع مسجد سب کی سب سرخ پتھر سے بنائی گئی تھی اور اس کا صحن ایک پوری بستی کے برابر رکھا گیا تھا۔ پہلے یہاں ایک مٹی کی چھوٹی پہاڑی تھی، جس پر یہ مسجد بنائی گئی۔ اس کے گنبد اور مینار ایک زمانے تک دنیا والوں کو شاہجہان آباد میں منادی کر کر کے بلاتے رہے۔

چاندنی چوک بازار کی نہر ڈیڑھ ہاتھ گہری اور چھ ہاتھ چوڑی ہوتی تھی اور اس کے گرد دو رویہ گھنے سایہ دار درخت تھے۔ بعد میں نہر کم زیادہ ہوتی رہی اور درخت کٹتے اور لگتے رہے۔ اس شہر کی زیادہ عمارتیں پتھر ہی کی تھیں اور خاص چاندنی چوک بازار کے ساتھ ساتھ جو مکانات تھے، وہ سب کے سب بھی پتھر کے اور سفید رنگ کے تھے، جن میں ایرانی اور ترک اُمرا رہتے تھے۔ کسی دوسرے کو اِس شاہی بازار میں سکونت کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ عام لوگ دوسرے اور چھوٹے کوچوں میں رہتے تھے اور سوائے ہاتھی اور گھوڑے کے، دوسری سواری اس چاندنی چوک والے بازار میں نہیں چل سکتی تھی۔ ہاں پیدل کی اور بات تھی۔ پورے شہر میں پیپل، برگد، نیم، شہتوت اور بیریوں کے بے شمار درخت تھے، جن کے درمیان شہر کی عمارتیں چھپی چھپی تھیں۔ شہر میں ہزاروں تکیے اور شہتوتوں کے باغ بھی تھے، جن میں بھنگ پینے والے اور درویش ہر وقت بسیرا کیے بیٹھے رہتے۔ اکثر علما، شاعر اور درباری پہلے پہل اسی بازار کی زینت بنے۔ بعد میں جب زمانہ آگے پھیلتا گیا تو یہ لوگ بھی پورے شہر میں پھیلتے گئے۔ پھر تو دلی کے سب کوچے اسی طرح کے ہو گئے تھے، دوستو ہمارے، آپ کے میر صاحب یوں ہی تو نہیں فرما گئے تھے،

دلی کے نہ تھے کوچے، اوراق مصور تھے
جو شکل نظر آئی، تصویر نظر آئی

لو دیکھ لو، سرخ پتھروں سے سجی ہوئی عمارتوں کے ساتھ ساتھ جامع مسجد دہلی، مسجد

فتح پوری، کئی سو حویلیاں، کٹڑے اور سرائیں شامل تھیں، جو آج آپ اور ہم اِن تصویروں میں تو دیکھ سکتے ہیں اور خواب کے قدموں سے اس کے کوچوں میں چل پھر سکتے ہیں لیکن مادی جسموں سے اِن میں چلنے پھرنے کی ہمیں نہ اجازت ہے اور نہ ہی قدرت، کہ وہ زمانہ اُن کا تھا ہمارا نہیں۔ اس لیے اب اِن کوچوں کو نہ تلاش کیجیے کہ آپ کو نہ تو اب یہ دلی ملے گی اور نہ یہ اوراق مصور والے میر صاحب کے کوچے۔

شاہجہان آباد کے شمال مغرب کی فصیل کے ساتھ ساتھ بھی ایک نہر جاتی تھی، جو مضافات سے ہوتی ہوئی مہرولی میں جا نکلتی۔ یہ نہر سنا ہے، سلطان التمش نے شاہی باغات کو سیراب کرنے اور شمسی تالاب کو بھرنے کے لیے جاری کروائی تھی۔ آس پڑوس کے جاٹ اور زمیندار گاہے گاہے اس کا پانی چُرا کر فصلوں کو لگا لیتے، پھر بادشاہ کی طرف سے سزا پاتے۔ اسی مہرولی میں آپ لوہے کی لاٹھ اور قطب کا مینار دیکھ سکتے ہو۔ وقت نے ابھی اِن چیزوں کے دیکھنے کی اجازت دے رکھی ہے۔ یہ وہی نہر ہے، جس کا ذکر (پھول والوں کی سیر) میں ہوا ہے۔ مہرولی میں پھسلن پتھر، جھرنے، آموں کے شاہی باغ اور شمسی تالاب اسی نہر کی دین تھے۔ غالب نے اسی آموں کے باغ سے آم کھانے کا لطیفہ گھڑا تھا۔

شاہجہان آباد کے جنوب مشرق میں ایک کھنڈر ہے، یہ تغلق آباد ہے۔ اس سے تھوڑ آگے جنوب مغرب کی طرف جایئے تو بستی نظام الدین میں جا نکلو گے۔ وہاں ایک درویش کی سرا ہے، جہاں سے کبھی امیر خسرو کی پہلیاں، دوہے اور کہہ مکرنیاں نکل نکل کر مہرولی کے گھروں گھروں پھرتی تھیں۔ اسے نظام الدین کی بستی کہتے ہیں، خلقتِ عالم کا یہاں دن رات کے آٹھوں پہر گزر رہتا ہے۔ یہیں آس پاس ہمایوں اور بیرم خاں کے مقبرے کھڑے ہوئے گزرنے والوں کو پکارتے ہیں کہ آؤ اور شاہوں کی عبرتیں جھولیاں بھر بھر لے جاؤ۔

بجلی سے اِک تجلی آئی تھی آسماں سے

یہ وہی جہان آباد ہے، جو صدیوں شاد رہا، صدیوں آباد رہا، ہزاروں نابغوں نے نزول کیا، اِس شہر کے درو دیوار و بام پر سینکڑوں نام آوروں نے اپنا نام کیا۔ شاہ جہان بادشاہ کے وقتوں سے منزلیں ناپتا آخر وہاں پہنچا جہاں زمانہ ۱۸۳۰ کا آتا ہے اور اِس خوش بخت سال میں زبانِ اردو کا آفتاب دائرہ حمل میں جاتا ہے یعنی محمد حسین آزاد عالمِ ارواح سے جہانِ آب و گل میں ظہور فرماتا ہے اور جہان آباد کو اپنا مسکن بناتا ہے۔

یہ وقت کمپنی بہادر کی ہندوستان میں طاقت کے عروج کا تھا۔ زمانہ تب کا تھا، جب دہلی میں مغلوں کا آخری بادشاہ سلامت کمپنی کی طرف سے وظیفے کا نشہ کھاتا تھا، اشرافِ دہلی اُس نشے سے اپنی افیم کی پیالیاں گھماتے تھے، کبوتر اُڑاتے تھے اور آنے والی آندھیوں سے آنکھیں چھپاتے تھے۔ عوام الناس سب ہنگاموں سے بے خبر شاہِ دہلی اور اشرافِ دہلی کی تعظیم بجالاتے تھے۔ بلاشبہ یہ دہلی کے اُن ادبی اشراف کا آخری دَور تھا جنھیں دنیا مولوی احسن اللہ خان اور مفتی صدرالدین کے نام سے یاد کرتی ہے اور شاہ سلامت بہادر شاہ ظفر ہوا کرتے تھے۔ وہیں غالب و ذوق کے طغرے لہراتے تھے اور دنیا اُن کی نظم و نثر کی مالا جپتی تھی۔ کسے پتا تھا اِس زمانہ تغیر میں ایک ایسا نابغہ پیدا ہو چکا ہے جس کی لفظوں نے آبِ حیات کے کٹورے پی رکھے ہیں، جو اپنے نثری قطعوں سے عرضِ مشارق و مغارب میں نثر کے گُل بوٹے پھیلائے گا اور اُن کی شاخیں طویل ہوں گی، ہری بھری ہوں گی، پھلوں سے لدی ہوں گی اور وہ پھل ایسے شیریں ہوں گے کہ اُن میں ترشی کا احساس تک نہ ہوگا۔ یہ قلم کا دیوتا نثر کا بادشاہ ہوگا۔ اُس کی آبِ حیات مرنے والوں کو زندہ کر دے گی اور موجود کو مرنے نہ دے گی۔ اُس کے قلم کی روشنائی شعر کے انجم کو ماہ کرے گی اور ماہ کو ماہتاب تابناک بنائے گی۔ جی ہاں یہ معجز بیان، نثرِ اردو کا سلطان اور صدیوں پر آب قلم سے حکمرانی

کرنے والا شمس العلما مولانا محمد حسین ہی تو ہے۔ محمد حسین کی تاریخِ ولادت مولوی محمد باقر کے دوست اُستاد ابراہیم ذوق نے کہی۔ مولوی محمد باقر اُستاد ابراہیم ذوق سے کیا نسبت رکھتے تھے؟ اور دونوں کی آپس میں کیسی مہر و مروت تھی، اس سلسلے میں آگے چل کر گرہیں کھلیں گی۔ فقط اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ ابراہیم ذوق محمد حسین آزاد کے فقط اُستاد نہ تھے، اُن کے جسم کی روح تھے کہ بچپن ہی سے آزاد کے اندر وہ روح حلول کر گئی پھر اُن کی کربلا گاے شاہ میں چارپائی کے ساتھ اُٹھی۔ پھر اب یوں سمجھ لو اُن کا رشتہ ایک طرح سے چچا بھتیجے کا بھی تھا۔ اور یہ اُن کی ولادت سے پہلے ہی اتنا اُستوار ہو چکا تھا کہ زمانے کی نظر اُس میں دراڑیں نہ ڈال سکتی تھی۔ اُستاد ذوق کا آزاد کی تاریخِ ولادت کہنا فقط شاعر کی حیثیت سے نہ تھا بلکہ روح نے ایک جسم کی کہی تھی۔

میر بھی تھے اُس کے ہی یاروں کے بیچ

جہان آباد جانتا ہے دہلی کالج کیا تھا، دہلی کالج پرانے وقتوں کے شفا خانے میں نئے مسیحا کا ورود تھا۔ جہاں جہل کے بیماروں کو علم کی پُڑیاں باندھ کر کھلائی جاتی تھیں۔ یہ شفا خانہ مغرب سے آئے اُن نئے حکیموں نے قائم کیا تھا، جن کے شفایاب ہاتھ زمانوں کی نبضوں پر تھے۔ وہ بیماریوں کے علاج جانتے تھے، بیماروں کے سینوں کے ایکسرے اُنھوں نے کر رکھے تھے۔ جانتے تھے نئے مرض پُرانی تدبیروں سے شفا نہ پائیں گے۔ اِدھر عقل مند بیماروں کی نگاہیں نئے حکما کی پُڑیوں پر خوب تھیں، وہ سمجھ گئے تھے، دَور جس طرح کا آیا ہے، یہی حکمت کارگر ہوگی۔

یہی سبب ہے محمد حسین آزاد نے دہلی کالج میں تعلیم پائی۔ اِسی دہلی کالج میں اُن کے والد مولوی محمد باقر نے بھی تعلیم پائی تھی اور یہیں وہ اُستاد بھی مقرر ہوئے تھے مگر جلد اُس کالج کی راہ سے الگ ہو گئے کہ اُنھیں اِس راہ سے یافت کے امکان کم تھے جبکہ ارادے فلک کے

آگے خم ٹھونکنے کے تھے۔ مولوی محمد باقر کی اُس زمانے میں اردو شعروادب سے خاص نسبت بھی اُستاد ذوق کے سبب ہوئی تھی۔ یہی خاص سبب اس راہ کو سیدھا کرنے والا بنا کہ آزاد نے شعروادب میں اُسی اُستاد ابراہیم ذوق کی شاگردی فرمائی جو بہادر شاہ ظفر کا بھی اُستاد تھا اور اشراف دہلی میں سے اکثریت اُسی کی شاگردی کو تمغہ عزت خیال کرتی تھی۔

معاملہ اصل میں اُستاد ذوق اور مولوی محمد باقر کے ہم درس و دوست قریبی اور راز دان و ہم زباں ہونے کا وجود میں یوں آیا تھا کہ دہلی شہر کی فصیل کے چودہ دروازوں میں سے ایک کابلی دروازہ ہوتا تھا۔ اِس دروازے کا رُخ کابل کی طرف ہونے کے سبب اِسے کابلی دروازہ کہا جاتا تھا۔ بعد میں جب نادر شاہ کی فوجوں نے شہر کا قتلِ عام کیا تو اُس دروازے کے آگے بہت قتلِ عام ہوا۔ خون کے تالاب بن گئے، تب اِس کا نام خونی دروازہ پڑ گیا۔ ۱۸۵۷ کے غدر میں یہیں انگریز سرکار نے باغیوں کو باندھ کر پھانسیاں دیں۔ کابلی دروازے کے باہر نیم اور پیپل کے ہزاروں سایہ دار درخت ہوتے تھے۔ اکثر مسافر شہر سے باہر جانے والے یا شہر میں داخل ہونے والے اِسی دروازے کے سامنے پہروں آرام کرتے اور سائے میں سفر کے بند کھولتے تھے۔ یہاں سینکڑوں سال پرانے درختوں کے علاوہ ایک باولی اور دو کنویں بھی تھے۔ اِن کنوؤں اور باولی کا پانی نہایت ٹھنڈا اور میٹھا ہوتا تھا۔ دروازے کے باہر اور اِن درختوں کے سائے میں اکثر دنیا والے تماشا کرتے، مگد چلاتے، اکھاڑے لگاتے اور داستانیں سناتے۔ یہاں سے تھوڑے فاصلے پر آگے جمنا بہتی تھی، ساونیاں چڑھتیں تو باولی ہو جاتی، کنارے چھوڑ کھلیانوں میں پھیل جاتی ورنہ ریت میں پڑی اونگھا کرتی۔ لوگ باگ دروازے کے باہر سائے میں چارپائیاں بچھا لیتے اور خوب راحتیں لیتے تھے۔ کہیں اونٹوں کے پالان کھلے پڑے ہوتے تھے اور اونٹ بیٹھے جگالی کر رہے ہوتے تھے، کہیں گھوڑے اور گدھے یہاں بندھے ہوتے تھے جن کے مسافر شہر سے سودا سلف لے کر اپنے اپنے قصبوں دیہاتوں میں جانے والے ہوتے تھے۔ یوں دیکھ

لیں کہ یہ دروازہ ایک سرائے بھی تھی اور دروازہ بھی تھا۔

اسی کابلی دروازے کے پاس حافظ غلام رسول شوق کی مسجد ہوتی تھی۔ یہاں میاں عبدالرزاق کا درس چلتا تھا۔ یہ میاں عبدالرزاق دہلی کے بڑے عالم تھے اور شہرہ ان کے علم و ادب کا دہلی سے باہر عرب تک پھیلا تھا۔ میاں صاحب دہلی کے مشہور فاضل، زبان دان اور عالم کے علاوہ سیاسی اثر رسوخ کے چلتے پُرزے بھی تھے۔ اشراف میں اِن کا نام اور پہچان معتبری کی دلیل تھی، شاہ سے لے کر گدا تک اِن کے علم کا دم بھرتا تھا اور درس سُننے کے واسطے دوڑا چلا آتا تھا۔ زمانہ بہت سادہ تھا، وہ جو کچھ کہتے تھے، لوگ یقین کے ساتھ اُن کے درسی نصائح کی جھولی بھر کر لے جاتے تھے۔ ذوق متواتر اُن کے درس میں حاضر ہوتے اور احباب کو شامل ہونے کی تلقین کرتے تھے۔ یہیں مولوی محمد باقر کبھی کبھی چلے آتے تھے۔ مولوی محمد باقر کا میاں عبدالرزاق کے درس میں داخل ہونا اُن کے علمی وقار کے سبب نہ تھا کیونکہ میاں عبدالرزاق سُنی مشرب تھے جبکہ مولوی محمد باقر شیعہ تھے۔ چنانچہ اس درس میں شامل ہونے کی وجہ اُس کی صلح کُل اور شیعہ سُنی ہم آہنگی کو فروغ دینا تھا۔ دہلی کی فضا اُس وقت آپ یوں سمجھیے کہ شاہ ولی اللہ کے جانشینوں اور ہم مشربوں کے زیرِ اثر تھی اور میاں عبد الرزاق بھی اُنھی کے حلقہ میں بندھے ہوئے تھے۔ چنانچہ مولوی محمد باقر کا وہاں جانا ایک وسیع المشربی کے دائرے میں آتا تھا کہ یہی ایک گھر اجتہاد کے درجے کے سبب ہر مشرب کے درمیان معاشرتی اور سماجی راہیں پیدا کرنے کا مدعا رکھتا تھا۔ وہیں اس سبب سے ابراہیم ذوق سے اور مولوی محمد باقر سے دوستی چل نکلی اور خوب نبھ گئی۔ مولوی محمد باقر جانتے تھے، ابراہیم ذوق کا مزاج صلح جوئی اور وسیع المشربی ہے، لیکن اس سے زیادہ اُستاد ذوق پر رفض ہونے کا بھی الزام تھا، اُن کی حضرت علیؑ سے محبت بے انتہا تھی، اور سُنی سے زیادہ تفضیلی مزاج رکھتے تھے، مولا کی شان میں اُن کے کئی قصیدے ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ دوسری طرف تمام اشراف شہر میں اُنھی کی علمی ادبی حیثیت کا نقارہ بجتا تھا۔ دوستی کا یہ تسلسل ایسے چلا

کہ پھر دونوں ایک دوسرے کے بھروسامند اور خیر خواہ ہو گئے۔

صنعت گریاں ہم نے کیں سینکڑوں یاں لیکن

۱۸۴۳ میں مولوی محمد باقر صاحب نے دہلی کالج کا نیلام کردہ پریس خرید لیا۔ یہ ایک قسم کا لیتھو پریس تھا اور کالج پر بار تھا کہ حفاظت اس کی بہت کرنا پڑتی تھی اور چھپائی کم ہوتی تھی، خرچہ آمد سے بڑھ گیا تھا۔ مسٹر ٹیلر اس سے جان چھڑانا چاہتے تھے، ادھر وہ مولوی محمد باقر کے دوست تھے۔ انھوں نے مولوی صاحب سے پریس کے سفید ہاتھی کو بیچنے کا ذکر کیا، مولوی صاحب نے فرمایا میاں ہماری طرف سستے داموں پھیر دو، ہم اِسے کالے ہاتھی میں بدل دیں گے اور اس پر اخبار چھاپا کریں گے۔ مسٹر ٹیلر نے پریس مولوی محمد باقر کے ہاتھ فروخت کر دیا۔

ڈاکٹر محمد صادق (آبِ حیات کی حمایت میں) لکھتے ہیں،

''جب مولوی محمد باقر نے اخبار نکالنے کا فیصلہ کیا تو اُنھیں ایک پریس کی ضرورت تھی۔ اتفاق سے اُنھیں ایک عمدہ پریس ہاتھ آ گیا۔ جس کے باب میں عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ اُسے مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج نے نصابی کتابیں چھاپنے کے لیے خریدا تھا لیکن ڈکشنری آف نیشنل بائیوگرافی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ پریس ڈاکٹر سپنگر، پرنسپل دہلی کالج کے زمانے میں خریدا گیا تھا اور اس میں وہ کتابیں چھاپی جاتی تھیں جو کالج کے نصاب میں داخل تھیں لیکن یہ کام زیادہ عرصہ نہ چل سکا، وجہ یہ تھی کہ ان کتابوں کے لیے کالج سے باہر مانگ نہ تھی۔ اس لیے ان پر بہت لاگت آتی تھی۔ چنانچہ یہ پریس بہت عرصہ بے کار پڑا رہا اور مسٹر ٹیلر کی، جو ان دنوں پرنسپل تھے، یہ خواہش تھی کہ اونے پونے داموں بیچ کر اس سے چھٹکارا حاصل کیا جائے مولوی باقر کے لیے اس سے بہتر موقع کیا ہو

سکتا تھا مسٹر ٹیلر سے اُن کے گہرے اور دیرینہ مراسم تھے لہذا انھوں نے
یہ پریس خرید لیا اور اپنے مشہور اخبار (دہلی اردو اخبار) کی بناڈالی"

جس وقت مولوی محمد باقر دہلی اردو اخبار کے مالک بنے ، اسی اخبار میں مولوی صاحب اُستاد کی غزلیں، قصاید اور بہادر شاہ ظفر کی غزلیں چھاپا کرتے تھے۔ خاص کر جلوسِ شاہی کے وقت یہ اخبار بادشاہ کی مدح وتوصیف میں وقف ہوتا تھا۔ اُستاد ابراہیم ذوق جب بہادر شاہ کے اُستاد ہوئے تو یہ دوستی مزید اس طرح گہری ہوگئی کہ بادشاہ سلامت دونوں کو اکثر قلعہ میں مہمان بلایا کرتے تھے اور یہ پالکیوں میں بیٹھے اُس عزت وتوقیر کے سہرے باندھے دربار میں حاضر ہوتے، جس کی حسرت ہمارے مرزا نوشہ کو بہت تھی مگر ابھی قسمت نے اُنھیں اس فخر کے قلاوے سے دُور رکھا تھا۔ وہ صاحب کمال آگرہ سے تھے اور دہلی والے کب اتنی آسانی سے اُسے فصیلِ قلعہ کے بُرجوں پر سر بلند ہونے دیتے تھے۔ اِدھر مرزا نوشہ بھی مادر النہری افراسیابی تھے۔ کہاں نچلے بیٹھ سکتے تھے، غالب اپنے کو نواب خیال کرتے تھے، باپ دادا کے سپاہی پیشہ ہونے پر فخر رکھتے تھے۔ اُنھیں باور تھا کہ اُن کے باپ اور چچا کے قبضے میں تلوار تھی۔ اِدھر بچارے ابراہیم ذوق کے باپ کے ہاتھ میں اُسترا تھا۔ وہ غریب پیشے کے نائی، معاش کے تنگ دست اور مزاج کے مسکین تھے۔ غالب اپنی جوانی کے دِنوں میں ابراہیم ذوق کو اِسی نسبت سے نیوتا کہتے اور مذاق اُڑاتے تھے۔ غالب کے بھائی بند اور یار بیلی، جن میں دہلی کے اکثر شغل پیشہ نواب اور بانکے تھے، دن رات میں اُستاد ذوق پر پھبتیوں کے پتھر گٹھلیں بھر بھر کر برساتے تھے۔ چنانچہ اُستاد ذوق اور اِن سے خاموش جنگ کا طبل بجا، سرد حملوں کا آغاز ہوا جس میں مولوی محمد باقر نے اپنے اخبار کے پرچے اور قلم کا زور ابراہیم ذوق کی معاونت میں بڑھائے۔ مولوی محمد باقر اور غالب کا مذہب اگر چہ ایک تھا مگر مزاج میں فرق آتش وآب کا تھا۔ دوسری اہم بات اِس میں یہ تھی کہ دہلی کے ایک نواب صاحب حامد علی خاں کی دوستی غالب کے ساتھ تھی اور یہ نواب صاحب

بھی سخت شیعہ تھے اور یہ وہی نواب تھے جنھوں نے اُس وقت مولوی محمد باقر کے خلاف مولوی محمد جعفر صاحب کا بھر پور ساتھ دیا تھا جب دونوں کے درمیان اجتہاد کی بنیاد پر سخت اختلاف ہو گیا تھا۔ چنانچہ مولوی محمد باقر غالب کے ہم مشرب ہونے کے باوجود اُستاد ذوق کے معاملے میں اُن کی مخالف صف میں کھڑے ہو گئے۔ بات یہاں تک پہنچی، کہ جب مرزا صاحب پر قمار بازی کا مقدمہ ہوا تو دہلی اردو اخبار نے یوں مرزا صاحب کے قلب پر حملہ کیا،

> ''سنا گیا ہے کہ ان دنوں گزر قاسم جان میں مرزا نوشہ کے مکان سے اکثر نامی قمار باز پکڑے گئے۔ مثل ہاشم خان وغیرہ کے، جو سابق بڑی علتوں میں دورہ تک سپرد ہوئے تھے۔ بڑا قمار ہوتا تھا لیکن بہ سبب رعب وکثرت مردماں کے یا کسی طرح سے کوئی تھانے دار دست انداز نہیں ہو سکتا تھا۔ اب تھوڑے دن ہوئے یہ تھانے دار قوم سے سید اور بہت جری سنا جاتا ہے مقرر ہوا ہے۔ یہ مرزا نوشا ایک شاعر نامی رئیس زادہ نواب شمس الدین قاتل ولیم فریزر کے قرابتِ قریبہ میں سے ہے۔ یقین ہے کہ تھانے دار کے پاس بہت رئیسوں کی سعی وسفارش بھی آئی لیکن اس نے دیانت کو کام فرمایا۔ سب کو گرفتار کیا، عدالت سے جرمانہ اعلیٰ قدر مراتب ہوا۔ مرزا نوشہ پر سو روپے، ادا نہ کریں تو چار مہینے قید لیکن ان تھانے دار کی خدا خیر کرے، دیانت کو تو کام فرمایا لیکن اس علاقے میں بہت رشتہ دار متمول اس رئیس کے ہیں، کچھ تعجب نہیں کہ وقت بے وقت چوٹ چھینٹ کریں اور یہ دیانت اُن کی وبالِ جان ہو۔ حکام ایسے تھانے دار کو چاہیے کہ بہت عزیز رکھیں۔ ایسا آدمی کمیاب ہوتا ہے''

درج بالا تحریر میں جس متمول رئیس کا ذکر موجود ہے وہ یہی نواب حامد علی خاں صاحب ہیں، جو دراصل مولوی جعفر صاحب کے نصرت کاروں میں بھی تھے۔

مولوی محمد باقر اسی اخبار میں کہیں کہیں اپنے تشیع کی طرف داری کی خبر بغیر کسی جھجک

کے شائع کرتے نظر آتے ہیں۔ جس میں بلا شبہ احساس ہوتا ہے کہ ایک طرف شاہِ دہلی کی رواداری کہاں تک عوام الناس کے ساتھ بلا تفریق مذہب موجود تھی اور دوسری طرف اظہار کی آزادی کا افسانہ سنایا جا سکتا تھا۔ اس معاملے میں مولوی محمد باقر کسی قسم کی مصلحت کے قائل نہیں تھے۔ مثلاً ۱۸۵۳ میں ایک خبر شیعہ طرفداری میں ایک لطیف طنز کے ساتھ یوں چھپتی ہے۔

> "اعلیٰ حضرت (بہادر شاہ ظفر) بدھ کے دن مرزا عالی بخت کے مکان میں شریکِ مجلس ہوئے اور دیر تک مرثیے سُنے اور آپ بھی فضیلتِ آئمہ بیان کرتے رہے اور جمعرات کو علم جو حضور والا نے تیار کروایا ہے اور وہ بہت خوبصورت بن کے آیا ہے، حضور والا نے کمال آداب و قرینہ سے اپنے سر مبارک پر رکھا اور صاحب عالم مرزا نور الدین بہادر کو وہ علم سپرد کر کے بر سبیلِ ڈاک لکھنؤ کو رخصت کیا۔ ہر چند علم مبارک کے بنانے پر اکثر آلِ تیمور مغفور مانع بھی آئے اور جب تیار ہو چکا تو بھیجنے پر لکھنؤ کے بھی مانع رہے مگر حضور نے کسی کی نہ سُنی اور جو ذہن مبارک میں آیا وہی کیا۔ بعض لوگ اس بات پر بہت رنجیدہ ہوئے کہ "حضور والا سے اُن کے برخلاف یہ امر جلیل ہوا ہے بلکہ حضور والا نے اکثر اپنی زبانِ مبارک سے حاضرین دربارِ معلّیٰ سے فرمایا کہ اکثر آلِ تیموری اور اشخاص نے مجھ سے عرض کی کہ اس علم مبارک بنانے اور لکھنؤ بھیجنے میں آپ رافضی مشہور ہوں گے۔ مَیں نے جواب دیا کہ مجھ کو اُلفتِ پنج تن پاک میں سب باتیں منظور ہیں اور اُن کی محبت سے آدمی رافضی ہوتا ہے تو جس کا جی چاہے کہے۔ کہنے والے اپنا سا منہ لے کر رہ گئے"

دہلی کے کوچہ و بازار اور مولوی محمد باقر کا مکان

دلی کے نہ تھے کوچے اوراقِ مصور تھے

شاہ جہان آباد کے بازاروں اور کوچوں اور سڑکوں کا حال سنانے کے لیے ہمیں اُس زمانے کی تعمیر اور طرزِ بود و باش کا اندازہ لگانا ضرور چاہیے۔ چاندنی چوک کا حال اُوپر بیان ہو چکا ہے مگر دہلی کی سب سڑکیں چاندنی چوک نہ تھیں، بعض کوچے چھوٹی اینٹ سے پختہ کیے گئے تھے، جن پر گرمیوں میں بہشتی چھڑکاؤ کیا کرتے تھے۔ بعض بڑے بازار سُرخ پتھر سے پختہ تھے اور یہ بازار اُمراوا شراف کی حویلیوں میں کُھلتے تھے اور بعض کچے تھے۔ اِن کچے بازاروں میں اکثر وقت دھول اور گرد کے پھریرے لہراتے تھے اور راہی پاندھیوں کو گرد پھنکواتے تھے مگر یہ وہ بازار اور کوچے تھے جن میں حرفت پیشہ یا چھوٹے طبقوں کے لوگ بسا کرتے تھے۔ اِن بازاروں میں اور کوچوں میں بڑے بوڑھے نیم کے درخت ہوتے تھے، پیپلوں اور شرینہوں کے درخت ہوتے تھے۔ اکثر کہیں شہتوتوں کے تکیے ہوتے تھے۔ اِن تکیوں میں سائیں لوگ اور ملنگ اور پاندھی بسیرا رکھتے تھے۔ اکثر جگہ نیم کے بوڑھے درختوں اور پیپلوں اور برگدوں کے سائے میں بڑی حویلیوں کے چوبارے چھپے ہوتے تھے اور اِن درختوں کی شاخیں اُن کی چھتوں پر بھی سایہ کیے رکھتیں اور بازاروں میں بھی چھاؤں پھیلائے رکھتیں۔ شاہ جہان آباد میں درختوں کی اِس قدر بہتات اور چھاؤں کے اسباب یہ تھے کہ دہلی شہر کے قریب راجستھان کے علاقے پڑتے ہیں اور راجستھان سے آندھیاں بہت اُٹھتی تھیں۔ یہ آندھیاں سیدھی دہلی کا رُخ کرتیں اور اپنے ساتھ ریت اور گرد و غبار

کے جھکڑ اُٹھائے لاتیں، جس کے سبب جہان آباد کے کوچہ و بازار گرد و غبار سے بھر جاتے، گھروں کی چھتوں اور حویلیوں کے صحن ریت مٹی سے پُر ہو جاتے۔ اس کا علاج یوں کیا کہ لوگوں نے ہزاروں ہی نیم اور پیپل کے درخت گھر آنگنوں، گلیوں بازاروں اور میدانوں میں لگا دیے۔ دوسرا ادارویہ برتا کہ ماشکیوں کو صبح شام چھڑکاؤ پر رکھ لیا۔ وہ جمنا سے مشکیں بھر بھر لاتے اور گلیوں میں ترونکا لگاتے۔ یوں مٹی اور گرد سے دہلی بچا رہتا۔ مگر یہ اُن وقتوں کی باتیں ہیں جب شاہ جہانی حکومتیں عروج پر رہیں بعد میں یہ انتظام ذرا کم پڑ گیا۔ پھیری لگانے والے، کھیل تماشا دکھانے والے یا ڈولیاں اُٹھانے والے کہاروں سے یہ کوچہ و بازار پر رونق رہتے۔ ہر بازار اور کوچے کی راہ گھوم پھر کر کسی نہ کسی شہر کی فصیل کے بڑے دروازے کی طرف کھلتی تھی۔

مولوی محمد باقر صاحب جس مکان میں تکیہ رکھتے تھے، وہ دہلی کے کشمیری محلے کے مرکزی بازار میں تھا اور وسیع رقبے پر تعمیر ہوا تھا۔ یہ بازار پختہ چھوٹی اینٹ سے تیار ہوا تھا اور اکثر اشراف دہلی کے اِس میں بستے تھے۔ واقعہ اِس مکان کی خرید کا یہ تھا کہ مولوی محمد باقر نے گورا اعتقاد خاں میں ایک بہت بڑا زمین کا ٹکڑا خریدا۔ اُس وقت یہ جگہ بہت کھلی خالی پڑی تھی۔ پُرانے نیم اور پیپلوں کے درختوں سے گھری ہوئی تھی۔ ایک کھجور بھی یہاں تھی اور بہت پرانی تھی۔ اُدھر مولوی صاحب کا کاروبار ترقی کرتا جاتا تھا، اُس کے پھیلاؤ کو زمین کی وسعت چاہیے تھی جو ذاتی ہو اور مرکزی بھی ہو۔ زمین کا یہ قطعہ کشمیری دروازے کے علاقے میں تھا۔ یہ منطقہ کشمیری محلہ اس لیے کہلاتا تھا کہ یہاں اکثر آباد ہونے والے خاندان کشمیری رؤسا اور اشراف میں سے تھے۔ چونکہ مولوی محمد باقر کے والد اخوند محمد اکبر کے دادا ایران سے کشمیر میں داخل ہوئے تھے، وہاں کچھ عرصہ رہنے کے بعد جب مولوی محمد باقر پیدا ہوئے تو وہ اُنھیں دنیاوی تعلیم کی سیرابی کے واسطے نادر شاہ کے حملے کے وقت دہلی میں لے آئے اور خود بھی مستقل دہیں آن براجے اور اسی محلے میں بس گئے۔ یاد رہے

پرانے وقتوں میں شہر کے ہر بڑے دروازے کے قریب ایک چھوٹی کھڑکی بھی ہوتی تھی جو ایک گلی میں کھلا کرتی تھی۔

آغا محمد باقر دہلی میں اُن کے گھر اور جائداد کے متعلق ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔

''مولانا محمد باقر (دہلی میں) کشمیری دروازہ کے علاقے میں کھڑکی ابراہیم علی خاں میں سکونت رکھتے تھے۔ یہیں اُنھوں نے ایک نیلام گھر بھی جاری کیا تھا۔ کہتے ہیں شمالی ہندوستان میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ تھا۔ اس میں دور دراز کے تاجر اپنا مال لے کر آتے اور قیام کرتے۔ مال ہفتے میں ایک بار سجایا جاتا اور پھر نیلام ہوتا۔ اس نیلام گھر میں بڑے بڑے رؤسا اور اُمرا آتے اور بیرونِ ممالک کے عجائبات خریدتے۔ مولانا مرحوم نے ایک امام باڑہ بہ نیتِ وقف اسی محلے میں تعمیر کیا تھا۔ ''تعزیت گاہِ امام دارین'' ذوق نے اس کی تاریخ تعمیر کہی۔ یہ مکان اب میرے تصرف میں ہے۔ اس کے ساتھ اور بھی سات مکانات تھے جو مستورات، منشی جی اور موذن کے لیے مخصوص تھے۔ اب اِن میں سے دو ہمارے پاس ہیں۔ باقی غدر میں ضبط ہو کر نیلام ہو گئے۔ یہ بھی والد مرحوم نے خریدے تھے ورنہ غدر کے بعد نیلام ہو کر کسی اور کے پاس چلے گئے تھے۔ اسی مکان کے قریب ایک مسجد بھی ہے جو مولوی محمد باقر کی مسجد کے نام سے مشہور ہے۔ یہ بھی مولانا کی وقف کردہ ہے اور ابھی تک قائم ہے۔ یہ مکان اب تک مولوی محمد باقر کا امام باڑہ کہلاتا ہے، جو وسعت کے لحاظ سے محلے میں سب سے بڑا ہے۔ پہلے یہ عمارت یک منزلہ تھی۔ اب مَیں نے دو منزلہ کرالی ہے۔ اس کا نقشہ قریباً ایسا ہی ہے جیسا کہ مغلیہ سلطنت کے دور میں بڑی بڑی حویلیوں کا ہوا کرتا تھا۔ دالان در دالان، پہلوؤں میں صحنچیاں اور ان کے ساتھ کوٹھڑیاں، دالانوں کے آگے چبوترہ پھر حوض اور اُس میں فوارہ، دو سیڑھیاں نیچے اُتر کر بہت بڑا صحن۔ اس میں کنواں،

صحن کے دونوں طرف دو دالان، سامنے ڈیوڑھی، ڈیوڑھی کے برابر ایک طرف پائخانہ، دوسری طرف حمام اور باورچی خانہ تھا۔ اِس مکان کی چھتیں بہت خوبصورت تھیں۔ پچی کاری کا کام اور اِس میں شیشے جڑے ہوئے تھے۔ اب چھتیں تبدیل کر دی گئی ہیں۔ سنگین ستونوں پر نہایت خوبصورت نقش و نگار تھے، جو امتدادِ زمانہ نے محو کر دیے۔" اِس مکان کے ساتھ ایک اور چھوٹا سا مکان ہے۔ جس کا راستا علیحدہ بھی ہے اور ڈیوڑھی میں سے بھی جاتا ہے۔ یہ مکان ایک کوٹھڑی ہے۔ اِس کے آگے دالان اور چھوٹے سے صحن پر مشتمل ہے۔ اِس دروازے پر "لنگر خانہ" کا کتبہ لگا ہوا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ محرم کے زمانے میں اِس میں نیاز کے لیے کھانا تیار ہوتا تھا۔ اِسی مکان میں مولانا کی نشست تھی۔ اُن کا کتب خانہ اور لیتھو پریس بھی اِسی عمارت میں تھا۔ اِس مطبع کی چھپی ہوئی ایک کتاب ہمارے پاس بطور یادگار محفوظ ہے"۔

مولوی محمد باقر نے یہاں اپنا ایک مدرسہ جو پہلے کہیں اور موجود تھا اور بہت چھوٹا تھا، اُسے وسیع طور پر قائم کرلیا۔ اِس جگہ تشیع مکتبہ فکر اور مذہبیات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ اخوند محمد اکبر کی شرافت اور پاکبازی کے سبب اُن کا نام جلد دہلی کے معتبرین میں معروف ہوا۔ مولوی محمد باقر کی ابتدائی تعلیم خود اخوند محمد اکبر نے کی، بعد ازاں دہلی کالج میں داخل کیا۔ یہاں کے منظروں نے مولوی صاحب کی نظر کو وسیع کیا۔ وہ اجداد کی روشِ کہنہ کے برعکس مذہب کے ساتھ گوناگوں معاملات میں دلچسپی لینے لگے۔ دہلی کالج کی زندگی نے اُن میں کاروبارِ دنیا سے منسلک ہونے کی ہوا دی۔ اگرچہ باپ کے مدرسے کو جان سے لگائے رکھا اور مجتہد کا درجہ بھی اپنی لیاقت سے پالیا اور اُسے زندگی بھر نبھائے رکھا مگر اس کے ساتھ معاشی طور پر ایسے ذرائع پیدا کیے کہ وسیع فارغ البالی کا پروانہ ہاتھ میں لے لیا۔ مولوی محمد باقر مجتہد ہونے کے ساتھ ایک بڑے کاروباری آدمی تھے۔ اُنھوں نے بہت سرائیں اور کاروباری

منڈیاں بھی قائم کر رکھی تھیں۔ کشمیری محلہ، جواب کشمیری بازار کہلاتا ہے، وہیں مولوی محمد باقر کا وہ امام باڑہ اور کٹڑہ تھا، جہاں ۱۸۵۷ کے ہنگامے میں مولانا نے پرنسپل دہلی کالج کو پناہ دے رکھی تھی۔ مولوی محمد حسین آزاد دادا کے مکان میں پیدا ہوئے مگر جب مولوی محمد باقر نے اپنا نیا مکان بنالیا تو اُن کے والد یعنی اخوند محمد اکبر بھی وہاں آن بسے۔ آزاد نے والد ہی کی طرح ابتدائی تعلیم اپنے جد اخوند محمد اکبر سے پائی۔ مولوی محمد باقر کی شادی برخلاف خاندانی روایت کے، دہلی میں ایک ایرانی نژاد معزز شیعہ گھرانے میں ہوئی تھی۔

اس سلسلے میں آغا محمد باقر نبیرہ آزاد لکھتے ہیں:

''مولانا محمد شکوہ کی زوجہ محترمہ بھی ایران سے اُن کے ساتھ آئی تھیں۔ مولانا نے اپنے فرزند محمد اشرف کو علوم دینی کی خود تعلیم دی اور اُن کے انتقال کے بعد اُن کے جانشین ہوئے اور مجتہد کہلائے۔ مولانا محمد اشرف کی شادی بھی ایران میں ہوئی۔ اسی طرح یہ بھی اپنے صاحبزادے محمد اکبر کی شادی ایران سے کر کے لائے۔ مولانا محمد اکبر بھی اپنے والد کے بعد مجتہد اور عالمِ دین ہوئے۔ یہ بات ابھی تک مشہور ہے کہ محمد اکبر صحیح اردو نہ بول سکتے تھے۔ آبِ حیات میں لکھا ہے کہ،، آزاد ہندی نہاد کے بزرگ فارسی کو اپنی تیغ زبان کا جوہر جانتے تھے مگر تخمیناً سو برس سے کل خاندان کی زبان اردو ہوگئی ہے۔ آبِ حیات پہلی مرتبہ 1880 میں چھپی تھی۔ اس بیان کے مطابق اس خاندان کی تیسری پشت کی زبان اردو ہو گئی تھی۔ یہ بالکل ممکن ہے کہ کل خاندان کی زبان اُس وقت اردو ہوگئی ہو لیکن مولانا محمد اکبر پر فارسی زبان کے اثرات باقی ہوں۔ ایسا ہونا قرین قیاس بھی ہے کہ اُس وقت تک سلسلہ ازدواج ایران سے رہتا تھا۔ مولانا محمد اکبر نے اس رسم کو پہلی مرتبہ توڑا اور اپنے صاحبزادے محمد باقر کی شادی دہلی کے ایک ایرانی نژاد خاندان کی دختر بلند اختر سے کی جس سے محمد حسین پیدا ہوئے''

جس راہ سے وہ دل زدہ دلی میں نکلتا

اِس روایت کے ٹوٹنے سے آزاد کا رشتہ دو زبانوں سے بندھ گیا۔ والدہ محترمہ کی طرف سے ٹھیٹھ اردو کے ساتھ اور دادا جان کی طرف سے فارسی کے ساتھ۔ یوں دونوں زبانوں کی تعلیم محمد حسین آزاد کو لاشعوری طور پر ملتی رہی۔ اِس طریق میں ایک طرح سے آزاد میاں کی اردو اور فارسی پہلی زبانیں تھیں۔ فارسی جو اُس وقت تمام اشرافِ دہلی کی زبان ہونا ضروری سمجھا جاتا تھا، محمد حسین آزاد کے لیے دادا جان کی تربیت اور تعلیم کا ثمر ہوگئی اور اردو ماں کے دودھ کا آبِ حیات۔ محمد حسین ابھی بچے تھے کہ اُن کی والدہ داغ دے گئیں۔ چھوٹی عمر میں ماں کی قربت کا جنازہ دیکھنا پڑا، یہ زمانہ مولوی محمد باقر اور محمد حسین آزاد کے لیے برابر آزمائش کا تھا۔ مولوی محمد باقر کا کاروبار روز بہ روز پھیلتا جاتا تھا۔ فرصت ایسی نہ تھی کہ بیٹے کی طرف آٹھ پہر توجہ کا کرم اور شفقت کا ثمر بڑھایا جاتا۔ اِن خلا کے لمحوں کو آزاد کے دادا محمد اکبر نے اپنے جلوت وصحبت سے معمور کیا۔ پوتے کے لیے ماں کی شیرینی اور باپ کی رفاقت کا امتزاج بنے۔ یہی زمانہ تھا کہ فارسی ادب کی متداول کتابیں اور عربی زبان کا تاریخی اور علمی ورثہ اُن کے سینے میں راہ پانے لگا۔ گھر کا صحن وسیع اطراف سے علم کی ندا بنا پھیلا تھا۔ دادا جان کا علمی مقام ومرتبہ چونکہ مجتہد کے درجے کا تھا اس لیے پوتے کو تحقیق کی وادیوں کی سیر میں لے جاتے تھے۔ آلِ محمد کے علم ومودت کے خزانوں سے شناسائی کراتے تھے اور دل میں اطمنان کا چراغ جلاتے تھے۔ اس عالم میں اکثر اُن کے باپ مولوی محمد باقر جب دوست کی طرف چلتے، اِن کی اُنگلی پکڑ لیتے اور خراماں خراماں کابلی دروازے کی طرف جا نکلتے، جہاں اُستاد ابراہیم ذوق کا مکان تھا۔ اُستاد وہیں مکان کے باہر چوکی پر شاگردوں کے پرے جمائے عروض ومحاورہ وشعر کی گتھیاں سلجھانے میں بندھے ہوتے تھے۔ ابراہیم ذوق بچے کو دیکھ کے ایسی شفقت سے پیش آتے جس میں

مانوس دل بستگی کے تمام سامان موجود ہوتے۔ یہ دَور محمد حسین آزاد کے لیے نئی کائنات کی دریافت کا تھا، جس میں شعروادب کے بحرِ بیکراں کی سیر یابی کی کشتیاں چلتی تھیں اور زبان و بیان، محاورہ اور روزمرہ کی باریکیاں اور لفظ و معنی کی لطافتیں سمجھ میں آتی تھیں۔ یہ صحبتیں بہت عرصہ جاری رہیں۔ میاں آزاد وہیں شعری نزاکتوں کے نکتے پاتے گئے۔ زبان صیقل ہوتی گئی کہ صاف ہوتے ہوتے تیغ تیز ہوگئی۔ آہستہ آہستہ آزاد میاں والد صاحب کے بغیر ہی اس صحبتِ شیریں سخنی میں چلے آتے تھے اور اُن معنی آفرینیوں کے غازے غمازے سمجھنے کی کوشش کرتے تھے جسے قدرت نے اُن کے نام لکھ دیا تھا۔

آباد کم رہا ہے یاں کوئی خانوادہ

مولانا محمد حسین آزاد کے اجداد ایران کے پروردہ تھے۔ خاندان کا حلقہ فارس کے شہروں ملکوں سے وابستہ تھا۔ حسب و نسب کی کڑیاں ایک کے بعد ایک چلتی ہوئی حضرت سلمان فارسی تک جاتی ہیں اور آگے آزاد تک آتی ہیں۔ اِس بارے میں ایک جگہ مولوی محمد باقر (والد آزاد) کے متعلق آغا محمد باقر نبیرہ آزاد لکھتے ہیں:

> ''مولوی محمد باقر کے بزرگ ایران کے باشندے تھے اور سرورِ کائنات محمد کے جلیل القدر صحابی حضرت سلمان فارسی کی اولاد ہونے کا فخر اُن کی مبارک دستاروں کا طرہ امتیاز ہے۔ ایران میں ہمدان جیسا مردم خیز خطہ اُن کا وطن مالوف تھا۔ اس خاندان کا ہر فرد اپنے علم و فضل کی بدولت اخوند اور خلیفہ کہلاتا تھا اور علمائے دین میں مجتہد کا درجہ رکھتا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنا شجرہ نسب اخوند محمد ابراہیم الہمدانی کے نام نامی سے شروع کیا ہے۔ اِن کے بیٹے اخوند محمد یوسف ہوئے اور اخوند محمد یوسف کے فرزند اخوند محمد عاشور ایران کو خیر باد کہہ کر دورہ نادری میں جبکہ یہاں محمد بادشاہ کی حکومت تھی، کشمیر جنت نظیر میں آکر آباد ہوئے''۔

وہ مزید لکھتے ہیں:

''کشمیر میں اخوند محمد عاشور کے ہاں محمد اشرف پیدا ہوئے۔ مولوی محمد باقر نے اخوند محمد اشرف کو مولد الکشمیر و مدفن الہند لکھا ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ کشمیر سے شاہ جہان آباد آئے۔ پھر وہیں پیوند خاک ہوئے۔ شاہ جہان آباد میں مقیم ہونے کے بعد خداوند کریم نے انھیں ایک فرزند کرامت فرمایا اور وہ اپنے زمانے میں اخوند محمد اکبر کے نامِ نامی سے مشہور ہوا۔ والدِ دیبیہ کا مصنف لکھتا ہے، کہ اخوند محمد اشرف اور اخوند محمد اکبر صاحب تصنیفات تھے۔ مولوی صاحب نے اپنی تحریر کے آخر میں اپنے والد صاحب کو اخوند محمد اکبر ہندی تحریر فرمایا ہے''۔

اس بیان کو مدنظر رکھیں تو مولانا کے اجداد کا سلسلہ کچھ اس طرح سے سامنے آتا ہے۔

اخوند محمد ابراہیم (ہمدان ایران)

اخوند محمد یوسف

اخوند محمد عاشور (ایران سے کشمیر ہجرت)

اخوند محمد اشراف (کشمیر سے دہلی ہجرت)

اخوند محمد اکبر (دہلی)

مولوی محمد باقر (دہلی)

مولوی محمد حسین آزاد (دہلی سے لاہور ہجرت)

مولوی محمد باقر اپنے والد کے اکلوتے بیٹے تھے اور اُن کے اکلوتے بیٹے محمد حسین آزاد تھے۔

چاہیے اہلِ سخن میر کو اُستاد کریں

آزاد کی تعلیم کا سلسلہ اپنے دادا سے شروع ہو کر دہلی کالج تک جاتا ہے۔ اُن کے والد مولوی محمد باقر بھی دہلی کالج سے تعلیم لیے ہوئے تھے اور ایسٹ انڈیا کمپنی میں بطور تحصیلدار کام کر رہے تھے مگر اخوند محمد اکبر کو اُن کی یہ ملازمت کھٹکتی تھی۔ بیٹے نے والد کی خواہش کو ایمان میں رکھا اور استعفٰی دے دیا اور اخوند محمد اکبر کا مدرسہ سنبھالا۔ 1836 میں جب پریس آزاد ہوا تو مولوی محمد باقر نے دہلی کالج کا وہ پریس خرید لیا جو کالج پر بار ہو گیا تھا اور اُسے چلانے میں کالج انتظامیہ کو شدید مشکلات کا سامنا تھا۔ مولوی محمد باقر کی طبیعت طالع آزما اور گونا گوں تھی، اِس لیے اُنھیں یہ پریس چلانے میں نئی دنیا سے اور نئی نظر سے نظر ملانے کا موقع ملا۔ یہ پریس مولوی محمد باقر نے کشمیری بازار میں اُس مکان میں لگایا جس کے ایک حصے میں امام باڑہ تھا اور یہ مکان اُنھوں نے عامۃ الناس کے وقف کے لیے خرید کیا تھا۔ اُسی کے ایک حصے میں وہ گھر بھی تھا، جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔

آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> "1836 میں جب پریس کو آزادی ملی تو اُنھوں نے دہلی سے پہلا اردو اخبار جاری کیا۔ اس کے ساتھ ہی ایک مطبع بھی جاری کیا۔ اُس مطبع میں مولانا کی تالیفات اور دوسری کتابیں شائع ہوا کرتی تھی۔ اِس پریس کا نام پہلے مطبع جعفریہ اور پھر اردو اخبار پریس رکھا۔ اِسی کے لیے مولانا مرحوم نے کشمیری دروازہ کے اندر ایک بہت بڑا مکان بہ نیت وقف تعمیر کرایا تھا جس کا ذکر ہم پہلے گزار آئے ہیں، اُستاد ذوق نے اُس کی تاریخ سعادت گاہ امام دارین، کہی۔ اِسی مکان میں مولانا مرحوم کا مدرسہ اور کتب خانہ تھا"۔

اگر محمد حسین آزاد کی ولادت ۱۸۳۰ میں ہوتی ہے تو آپ اندازہ لگائیں کہ اُن کے

بچپن کی پرداخت میں علم و ادب کی کتنی شاخیں حصہ لے رہی تھیں۔ اُس زمانے میں کسی کے ہاں پریس اور اخبار کا لگنا ایسا عمل تھا جو دہلی کے اِسی گھرانے کو نصیب تھا۔ اِس طرز سے دیکھا جائے تو آزاد اپنے جد سے فارسی اور مذہبی تعلیم کے چمن زار سے گزرتا ہوا پریس، کتب خانہ اور اخبار کے معاملات کو بھی سمجھ رہا تھا۔ یہی وہ دور تھا جب ابراہیم ذوق کے پاس آنا جانا شروع ہوا تھا۔

اگر شاہ جہان آباد کا پرانا نقشہ دیکھیں تو پتا چلے گا کہ کشمیری دروازے کے اندرون سے کابلی دروازے کے اندرون تک، دونوں کا فاصلہ ایک سے ڈیڑھ کلومیٹر تھا۔ ابراہیم ذوق کا مکان وہیں تھا۔ محمد حسین آزاد پہلے پہل والد کے ساتھ اور بعد ازاں اکیلے اُستاد ذوق کی خدمت میں حاضر ہونے لگے اور یہ معمول اِس قدر متواتر رہا کہ اُستاد ذوق کی وفات 1856 تک جاری رہا۔ 1856 میں مولوی صاحب کی عمر ۲۶ برس بنتی تھی۔ آپ اندازہ لگایے ایک لڑکا اپنی ولادت سے بچپن، وہاں سے لڑکپن اور اُس کے بعد جوانی تک کیسے کیسے نابغوں کے ہاتھ میں رہا۔ ہم نے بہت کچھ مولوی صاحب کے متعلق کھوجنے کی کوشش کی، کہیں معلوم نہیں ہوا کہ مولانا نے کسی وقت زندگی کا کچھ بھی حصہ دہلی کے لونڈوں کے ساتھ خوش گپیوں یا چہل بازیوں میں صرف کیا ہو یا کنکوے اور کبوتر اُڑانے میں کھپایا ہو۔ تب دہلی میں جمنا کنارے ہزار کھیل تماشے ہوتے تھے۔ پیراکی، ڈنڈ، بنوٹ، گھڑسواری اور اِسی طرح کی بہت شغل بازی دہلی کے بازاروں میں بھی اور قلعہ کے سامنے والے وسیع میدان میں ہوتی تھی۔ جامعہ مسجد کی سیڑھیاں تو بنی ہی گویا کھیل تماشے کو تھیں۔ عمر رسیدہ پیپلوں اور برگدوں کے سائے میں سینکڑوں تماشا گر اور تماشا بین جمع رہتے تھے۔ جمنا کے کناروں میں تیراکیوں کے ہُنر آزمائے جاتے تھے، کوئی گھڑے پر تیرتا جاتا، کوئی سرکنڈوں کے جھتے پر، کوئی اُلٹا تیرتا، کوئی سیدھا۔ جامعہ مسجد کی سیڑھیوں پر گزری تماشے لگتے، شطرنج اور چوسر کی بساطیں سجتیں۔ نوعمر لڑکے بالے، گوری تماشے، کنکوا اُڑانے اور کینچے کھیلنے کا کام سیری سے

کرتے تھے۔ غرض دہلی والے تماشوں کے شوقین ہر قسم کی کھیلوں کے باغ لگاتے تھے، اپنے ہنروں کے گل ثمر لٹاتے تھے مگر اس سب جوان دل کو بھانے والے تماشوں کے باوجود بھی مولانا آزاد کی نظر ہمیشہ گلگشتِ علم کی سیر کی اسیر رہی۔

کیا کوچہ کوچہ پھرنا عنوان ہے ہمارا

اُس وقت شُرفا کے لڑکے سفید مخمل کی چوگوشیا یا گول بناوٹ کی ٹوپیاں سر پر رکھتے تھے۔ ذرا جو شوقین مزاج ہوتے، اُن کی ٹوپیوں کے کنارے ریشمی گوٹے سے کاڑھے ہوتے۔ پاؤں میں بیشتر سلیم شاہی جوتے رکھتے۔ چُست اور چوڑی دار پاجامے کے اُوپر تنگ گھیری کا کُرتہ زیب تن کیا جاتا تھا۔ یہ لباس دہلی کے متموّل گھرانوں کے لڑکوں کا ہوتا تھا اور یہی لباس اُن دنوں محمد حسین آزاد کا تھا۔ محمد حسین میں ایک بات تب کے لڑکوں سے انوکھی تھی کہ اِن کی بغل میں ہمیشہ حافظ اور سعدی کے دیوان کے منقش نسخے ہوتے تھے۔ چلتے جاتے تھے اور پڑھتے جاتے تھے۔ وہ کشمیری محلّہ میں موجود اپنے گھر سے جس دم کابلی دروازے کی طرف نکلتے، نظر زمین میں دبائے ہوئے جاتے۔ کبھی حافظ نابینا کا ساتھ بھی ہوتا تو اُن سے مصرعے لڑائے ہوئے جاتے۔ یہ ایک دوسرے کو شعر سنائے جاتے اور مصرعوں کے چوکھٹے جمائے ہوئے جاتے۔ دہلی کے چوڑے بازاروں اور محلوں میں جہاں جہاں حویلیاں ہوتیں یا کٹڑے ہوتے، اُن کو چھوڑ کر بازاروں کے سامنے دورویہ دکانیں بجی ہوتی تھیں، یہ دکانوں کے چبوتروں پر ہر قسم کی مٹھائی، ربڑی، فالودہ، شربت، سبزی اور دیگر ضرورت کی اشیا سے بھری رہتیں۔ پھیری والے بھی ہر وقت آوازے لگاتے ہوئے گزرتے ،لے لو دمڑی کی لال مُوریاں، دو دمڑی کی قلفی لے لو، ایک دمڑی کا لچھا لے لو۔ غرض گرمی ہوتی تو فالودے اور قلفیوں اور شربتوں والے پھیریاں پاتے اور آوازے لگاتے جاتے۔ سردیاں ہوتیں تو کبابوں کے سیخ سُرخ انگاروں پر چڑھ جاتے، دودھ جلیبیوں کے

کڑاہ تندوروں پر رکھے جاتے۔ قہوے کے تانبے آگ سے بھڑک جاتے۔ اِدھر دہلی کے بانکے اور لڑکے بالے ٹولیاں باندھے کبابوں اور جلیبیوں پر پل پڑتے اور ادھیڑ عمر، بوڑھے قہوے خانوں کا رُخ بھرتے۔ دہلی کے بازاروں اور خاص چاندنی چوک میں شُرفا کی ڈولیاں کہار اُٹھائے لیے پھرتے۔ کوئی اُدھر سے آ رہا ہے کوئی اِدھر سے جا رہا ہے۔ اکثر شرفا ہاتھی اور گھوڑوں چڑھے ہوئے نکلتے۔ اونٹ گاڑی کی سواریاں بیشتر عوام کے واسطے تھیں۔ قلعے کے سامنے بڑے میدان میں اِن سواریوں کے ٹھڑے لگتے تھے۔ یہاں چھاؤں کے ہجوم ہوتے تھے جن کے نیچے سواریوں والے پڑے اونگھتے تھے۔ شُرفا بازاروں میں یا قہوہ خانوں میں جا کر قہوہ پینے سے گریز کرتے تھے۔ البتہ لڑکوں کو یہ بات عیب نہ تھی۔ جس طرح دہلی کے لڑکوں کو ضروری تھا کہ ٹوپی سر پر رکھیں، اِسی طرح مردوں کو ضروری تھا، وہ پگڑی باندھے رکھیں۔ پگڑی بہت بڑے گھیر کی ہوتی تھی۔ ننگے سر بازار میں چلنا سخت عیب کی بات تھی اور کم ذاتوں کا شیوہ خیال کیا جاتا تھا۔ اُستاد اُن دِنوں دہلی میں بہت تھے۔ جب کوئی شاگرد اُستاد کی طرف نکلتا تھا، اپنے ساتھ کچھ نہ کچھ تحفہ ضرور لیے جاتا تھا۔ محمد حسین بھی جب اُستاد کی طرف جاتے، اُستاد کی رغبت کی کوئی شے ضرور بغل میں دبائے جاتے اور بازار میں گزرتے عالم خود اُن تمام چیزوں سے پرے رہتے جن کی لت دہلی کے لونڈوں کو پڑ جاتی تھی۔ شُرفائے شہر کی عورتیں بازاروں میں نہ نکلتی تھیں۔ اگر کبھی نکلتیں تو ڈولیوں میں کہاروں کے سروں پر یا تانگہ میں جاتیں اور اونٹ گاڑیوں میں بھی سواری کرتی تھیں مگر یہ سمجھو ڈولیوں اور تانگوں اور اونٹ گاڑیوں کو اردگرد سے سات پردوں میں لپٹا جاتا تھا۔ البتہ کم ذاتوں کی عورتوں کو کوچہ و بازار میں پھرنے کی مکمل آزادی تھی۔ وہ بے دھڑک بے پردہ ڈنگے مارتی پھرتیں اور کوئی اُنھیں ٹوکنے والا نہ ہوتا تھا بلکہ اُن کا پردہ کرنا بُرا خیال کیا جاتا تھا۔

شاہ جہان آباد کے مکانات کا جائزہ لیں تو آپ کو اندازہ ہو گا، تب مکان میں ڈیوڑھی کے باہر بھی دائیں بائیں بیٹھنے کو چوکیاں بنائی جاتی تھیں۔ گرمیوں میں شرفا اپنی ڈیوڑھیوں

میں بیٹھتے تھے اور سردیوں میں دھوپ سینکنے کے واسطے باہر چوکیوں پر آبیٹھتے تھے۔ باہر کے بڑے گیٹ یا دروازے کے دائیں بائیں بنی ہوئی ان دونوں چوکیوں کے نزدیک مونڈھے رکھ دیے جاتے۔ وہیں صاحب خانہ اپنے احباب اور شاگردوں کے ساتھ پرے جما کر بیٹھتے اور ساتھ میں دھوپ بھی سینکتے۔ اُستاد ذوق کا بھی یہی معمول تھا۔ وہ اکثر بان کی کھری چارپائی باہر چوکیوں کے پاس رکھ لیتے، حقہ پہلو کے توبنے پر دھرا ہوتا، تمباکو ایسا کڑوا پیتے تھے کہ ناک کا دھواں سامنے بیٹھے شاگردوں کی آنکھوں سے پانی نکال دیتا۔ حقہ اُس وقت چھوٹے بڑے سب ہی پیتے تھے مگر اُستاد کا حقہ پینے کی اجازت، ادب سے یا وضع سے، شاگرد کو نہ ہوتی تھی، فقط برابر عمر اور علم کے احباب ساتھ نبھاتے تھے۔ شاگرد پیشہ وہیں آن جمتے اور باتیں خوب چلتیں، شعر پڑھے جاتے اور مصرعے چڑھائے جاتے۔ یہ چسکا ہی مولوی آزاد کو ایسا لگا کہ ویسا دوسرا چسکا پھر اُن کی طبیعت کو راس نہ آیا۔ دل کی صحبت پہلے دن ہی سے وضع داروں کے ساتھ تھی، اپنے تو ایک طرف، اغیار کی دل آزاری مقصود نہ تھی۔ اس لیے مولانا آزاد کے سینے میں علم کے ساتھ مجلسی صحبت اور وضع و اخلاق نے وہ گھر کیا کہ مرنے پر ساتھ دفن ہوا۔ مولوی صاحب نے دہلی کالج میں داخل ہونے اور وہاں سے فراغی کے بعد سے لے کر اپنے والد کے پریس میں کام کرنے تک برابر اُستاد ذوق کی قربت کا اور اُن سے تعلیم کا ثمر حاصل کیا۔ غرض محمد حسین آزاد کی مروجہ دہلوی تعلیم اور اجداد کی مذہبی تعلیم کے سلسلے کے بعد جیسے ہی مولانا کی عمر اس قابل ہوئی کہ اُنھیں انگریزی تعلیم کی سوجھ بوجھ اور ہوا لگے۔ مولوی محمد باقر نے اپنے ایک اور دوست مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کی ایما پر اُنھیں کالج میں داخل کرا دیا۔

یہ تھی وہ تعلیمی تثلیث جو دیگر اشراف و ساکنانِ دہلی کے کم ہی لوگوں کے حصے میں آئی اور جو مولوی محمد حسین آزاد کے زنبیلِ علم میں شامل تھی۔ یہاں مولانا مضمون نویسی میں ہمیشہ اول آتے تھے۔ انعام پاتے تھے اور جوش میں مزید آگے بڑھتے تھے۔ کالج کے زمانے میں

اُن کے ہم سبقوں میں ڈپٹی نذیر احمد، ماسٹر پیارے لال، اور منشی ذکا اللہ جیسے بڑے آدمی شامل تھے"

اور غبار کسو کے دل کا کس انداز سے نکلے آہ

مولانا محمد اکبر کی وفات کے بعد مولوی محمد باقر کا اجتہاد ایک متنازع شکل اختیار کر گیا۔ جس کی بنیاد نواب حامد علی خاں کی ایما پر مولوی جعفر نے ڈالی۔ معاملہ یہ ہوا کہ مولوی محمد باقر کی حیثیت دہلی میں ایک شیعہ مجتہد سے ہٹ کر وسیع المشربی کی طرف مائل تھی۔ وہ تمام مسالک کا احترام واجب جانتے تھے۔ جس کی ایک وجہ اُن کی دہلی میں کامیاب کاروباری حیثیت ہونا بھی تھا۔ بادشاہ سلامت سے تعلقات بھی مضبوط تھے۔ ظاہر ہے، شاہِ دہلی سُنی عقیدہ تھے اور بہت اِس میں راسخ تھے اور مولوی صاحب اُنھیں کسی طور سے مشکل میں مبتلا نہ کرنا چاہتے تھے۔ اِدھر اُستاد ذوق سے تعلقات بھی ایسے گہرے تھے کہ مولوی صاحب اُن کو بھی تکلیف نہ دے سکتے تھے۔ پھر یہ کہ دہلی بہر حال لکھنؤ نہ تھا۔ یہاں کا سماج سُنی اکثریتی آبادی کے سبب کھلے عام تبرا بازی کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ وہ ایک اخبار بھی نکال رہے تھے اور مطبع الگ سے چلاتے تھے۔ کئی سراؤں اور کاروباری منڈیوں کے مالک بھی تھے۔ اِن سماجی، معاشرتی اور معاشی دروبست کے ساتھ مولوی محمد باقر کا فتویٰ تبرے کے خلاف تھا اور صوفی ازم والی صلح جوئی کی راہ پر قانع تھا۔ مولوی محمد جعفر اور دوسرے راسخ العقیدہ شیعہ حضرات اِس بات کو اپنے عقیدے اور مزاج کے خلاف جانتے تھے۔ خاص کر نواب حامد علی خان اِس بات کو اُبھار رہے تھے اور اُن کی زبان مولوی جعفر صاحب تھے، مولوی جعفر صاحب کسی قسم کی مصلحت کو نہیں مانتے تھے۔ وہ شیعہ عقاید کو صلحِ کُل پر قربان کرنے کے قائل نہیں تھے۔ چنانچہ دہلی کے شیعہ دو طبقوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک باقری کہلانے لگے اور دوسرے جعفری۔ اِسی مناقشت میں ایک شخص نے مولوی محمد باقر پر چھریوں سے وار بھی کیے۔ وہ اُن

زخموں کے سبب مرنے سے بال بال بچے۔ اس حملے کے پیچھے بھی اکثر زعما کا خیال تھا کہ نواب حامد علی خاں کا ہاتھ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب دہلی اردو اخبار کی ادارت مولوی محمد حسین کو سپرد کردی گئی تھی۔ محمد حسین آزاد اپنے اخبار میں اداریہ بھی لکھنے لگے۔ یہاں اُن کی نثر صیقل ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ ۱۸۵۷ آ گیا۔

یہ بستیاں اُجڑ کے کہیں بستیاں بھی ہیں

یہ زمانہ دنیائے رنگ و بو اور باغ گل و خو پر صرصر کا وہ بگولا تھا جس کے زور نے کا خ نہ چھوڑا، کو نہ چھوڑا۔ اس کے قوت واختیار نے پست و بلند سب ہموار کردیے اور ایسے کیے کہ پھر قیامت تک اپنے مقام ہمد. نہ پہنچے۔ دہلی کے اشراف کیا، رذیل کیا، اُمرا کیا، حرفت پیشہ کیا، تمام چوباروں کے کنگرے گر گر کر پاتالوں کا رزق ہوگئے۔ شیشہ و جام کنکر پتھر ہوئے۔ لعل و گوہر خزف و خراب ہوئے، مکان و محل ٹیلوں میں بدل گئے اور شاہ جہان آباد کا نام خراب آباد کے وجود سے رونق پانے لگا۔ جہاں صبا پرور خوشبوئیں مہکتی تھیں وہاں لُو کے جھونکے برسنے لگے، کوچوں اور کٹڑوں میں صرصر اور آگ کے بگولوں نے گرداب باندھے۔ گلیوں چوراہوں میں ویرانی کے ہونکوں کا راج ہوا، جن آسنوں پر تُرک اور ایرانی پریزادوں کی محفلیں بار پاتی تھیں وہاں لاشوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ چوکیاں سنسان ہوگئیں۔ سڑکوں پر دھول اُڑنے لگی، مسجدوں کے گنبدوں سے کبوتر اُڑ گئے۔ مضافات شہر سے فاختاؤں نے ہجرت کرلی۔ باغوں اور تھکیوں کے دروازے گر گئے۔ بارود نے خوشبوؤں کے دامن چاک کردیے۔ آدھے سے سوا دہلی کھنڈرات کا ڈھیر ہوگیا۔ اس عالم میں مولوی محمد باقر کا گھر ایسے اُجڑا کہ پھر دہلی میں نہ بسا۔ اس ہنگامے میں شاہ دہلی کے ساتھ برابر جس کو خرابی آئی وہ مولوی محمد باقر کا گھر تھا۔ اس کی کئی وجوہات تھیں جس کی شرح یہاں ضروری خیال کرتا ہوں۔ مولوی محمد باقر وہ شخص تھے جس کے تعلقات انگریز سرکار اور بادشاہ دہلی

سے ایک جیسے تھے۔ مسٹر ٹیلر اُن کا دوست وہم نوا تھا اور بہت قربت رکھتا تھا۔ اکثر باہم کاروباری معاملات اور علمی مباحث میں یک قالب و دو جان تھے۔ دہلی والے اور اطراف دہلی کے مکین اس بات کو خوب جانتے اور سمجھتے تھے کہ مسٹر ٹیلر، جس کی رسائی کمپنی بہادر کے بڑوں سے بھی تھی اور چھوٹوں سے بھی تھی، وہ مولوی محمد باقر سے مشاورت کیے بغیر قدم نہیں بڑھاتا تھا۔ کالج کی تعمیر و ترقی کے لیے مسٹر ٹیلر کا وجود نعمت تھا اور وہ مولوی محمد باقر سے اس ضمن میں مشورہ و مصاحبت کا ذوق رکھتا تھا۔ اُن دنوں کسی انگریز کے ساتھ دیسی آدمی کا شیر و شکر ہونا مقامیوں کے لیے دو طرح کا طعن تھا۔ اول یہ کہ مقامی لوگ، عام آدمی ہی نہیں، علما تک خیال کرتے تھے کہ نصارا سے میل جول اور ہاتھ ملانا کفر کے نزدیک ہے اور مذہب سے خارج ہونا اِس دلیل بن جاتا ہے۔ دوسری بات یہ تھی کہ مولانا کی بڑھتی ہوئی کاروباری اور معاشی کشادگی ہم عصروں کو کھٹکتی تھی۔ تیسری اور سب سے اہم وجہ دہلی میں شاہ ولی اللہ گروپ یعنی اُن کے مدرسے کے پالے پوسے مذہبی مُلّاوں کو مولوی صاحب سے اُن کے شیعہ مسلک کی نسبت پہلے ہی بہت شکایات تھیں کہ سواری اُن کی ایک طرف قلعے تک جا پہنچی اور دوسری طرف کمپنی بہادر کے معاملات تک۔ یہ تمام باتیں اندر ہی اندر دہلی کے بہت لوگوں کو مولوی صاحب کے خلاف کینے پر اُٹھائے بیٹھی تھیں۔ جس وقت ۱۸۵۷ کا غدر مچا تو یہی تعلقات نہایت نزاکت اختیار کر گئے۔ اب مسئلہ یہ ہوا کہ مولوی محمد باقر اخبار بھی نکالتے تھے اور قلعے میں اثر رسوخ بھی رکھتے تھے۔ اِس لحاظ سے اِن پر دونوں طرف سے کڑی نظر تھی۔ جس وقت پوربیوں نے دہلی میں دھاوا بولا، تب حالات ایسے مشکل ہوئے کہ پوربی اور دہلوی مشٹنڈے انگریزوں کو تو چُن چُن کر قتل کر ہی رہے تھے، اُس کے ساتھ یہ بھی کرتے تھے کہ جہاں کسی متمول آدمی کو دیکھا کہ روپے پیسے رکھتا ہے اور کھاتا پیتا ہے، وہیں اُس پر انگریزوں کا مخبر ہونے کا الزام دھر کر اُس کا مال لوٹ لیتے اور اُسے جان سے مار دیتے۔ دہلی میں پوربیوں نے ایسے سینکڑوں گھر لُوٹا اور بے گناہوں کو قتل کیا۔ خود حکیم

احسن اللہ خان پر انگریز کا مخبر ہونے کا الزام دھر کر اُن کی حویلی کہ نگار خانہ چین تھا، کو لوٹ لیا، درو دیوار منہدم کر دیے اور اُن کی جان کے درپے ہو گئے۔ وہ تو خدا نے خیر کی کہ خود بہادر شاہ ظفر نے اُنھیں اپنی پناہ میں لے کر اُن کی جان بچائی ورنہ تو اُسے بھی جان سے مار دیتے۔ اِس صورت کو مولوی محمد باقر خوب دیکھ رہے تھے۔ اب اُن کے سامنے دو صورتیں تھیں کہ مکمل غیر جانبدار ہو جائیں اور پوربیوں سے اپنا گھر بار لٹا کر جان سے ہاتھ دھوئیں، یا پھر ظاہری طور پر انگریز کمپنی بہادر کے خلاف خبریں اپنے اخبار میں چھاپ کر پوربیوں کا ساتھی ہونے کا بھروسا دیں اور اُن سے جان کی امان پائیں۔ چونکہ فی الحال دہلی پوربیوں ہی کے ہاتھ میں تھی۔ غیر جانبدار ہونے کی شکل میں فوری موت یقینی تھی چنانچہ اُنھوں نے دوسری راہ اختیار کی اور انگریزوں کے خلاف اپنے اخبار میں خبریں چھاپنے لگے۔ اِس سے بڑا قہر یہ ہوا کہ خود بہادر شاہ ظفر نے اُن کے اخبار کا نام بدل کر اخبار ظفر رکھ دیا۔ یہ نام اُنھوں نے دو نسبتوں سے رکھا تھا، ایک اپنے نام کی نسبت سے اور دوسرا فتح و ظفر کی نسبت سے آغا محمد باقر نبیرہ آزاد لکھتے ہیں:

> ''جہادِ آزادی کے دوران میں اخبار کے نام میں پھر تبدیلی آئی، اچانک دہلی اردو اخبار سے اُس کا نام اخبار الظفر کر دیا گیا۔ اخبار میں اِس تبدیلی کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ بہادر شاہ بادشاہ نے اپنے نام کی نسبت سے اِس اخبار کا نام از راہِ کمال و رافت و ظرافت کے (اخبار الظفر) بہ دستخط خاص مرحمت فرمایا''۔

اخبار کا نام اخبار الظفر رکھنے کے بعد اس کے محض دس پرچے نکل سکے۔ اُس کے بعد دہلی کو دوبارہ کمپنی نے فتح کر لیا اور اخبار ضبط کر لیا گیا۔

ہم یہاں چاہیں گے کہ غدر کے حوالے سے اخبار میں چھپنے والے ۱۷ مئی ۱۸۵۷ کے اُس مضمون کو پیش کریں جسے مولوی محمد باقر نے لکھا تھا۔ مولوی محمد باقر کے بارے میں یہ

بات مشہور تھی کہ وہ مسٹر ٹیلر کے دوست ہیں۔ اس مضمون میں وہ کسی طرح اس الزام کو بھی دھونا چاہتے ہیں تاکہ بلوائیوں کے غضب کا نشانہ نہ بنیں۔ لکھتے ہیں:

''۱۷ مئی ۱۸۵۷ مسیحائی کو بباعث موسم گرما اول وقت کچہری ہو رہی تھی صاحب مجسٹریٹ محکمہ عدالت میں سرگرم حکمرانی تھے اور سب حکام اپنے اپنے محکموں میں سرگرم اجرائے احکام تھے اور حکم قید و حبسِ سزائے جسمانی و طلبی مجرمین وغیرہ جاری ہو رہی تھی، کہ سات بجے کے بعد میر بحری یعنی داروغہ پل نے آکر خبر دی کہ صبح کو چند ترک سوار چھاؤنی میرٹھ کے پل سے اتر کر آئے اور ہم لوگوں پر زیادتی کرنے لگے۔ اور محصول مجتمعہ کو لوٹنا چاہا۔ میں نے بلطائف الحیل اُن کو باتوں میں لگایا اور کشتی لب پل کی قفلی کھول دی کہ آگے نہ آسکیں۔ وہ لوگ جو آئے تھے، اُنھوں نے محصول گھر اور بنگلہ صاحب سڑک کا کہ واقع سڑک سلیم پور ہے، پھونک دیا۔ صاحب سُن کر متامل ہوئے اور اُٹھ کر جنٹ مجسٹریٹ کے پاس کہ دوسرے کمرے میں اجلاس کرتا تھا، چلے گئے اور کچھ غٹ پٹ کر کے خزانے کے کمرے میں گئے اور صاحب خزانہ سے مصلحت کر کے گارد متعینہ خزانہ کو حکم کمربندی دیا۔ اُنھوں نے فی الفور حسب الحکم گولیاں بندوقوں میں بھر لیں اور تیار ہو گئے اور ایک ایک پہرہ جنگی دروازہ کچہری پر کھڑا ہو گیا اور تمام کچہری اور اہلِ عملہ میں کھل بلی پڑ گئی۔ صاحب مجسٹریٹ معلوم ہوا کہ کمشنر کے پاس گئے۔ اس اثنا میں معلوم ہوا کہ وہ ترک اسوار اب زیرِ قلعہ مبارک پیش جھروکہ جمع ہیں اور حضور والا حضرت ظلِ سبحانی سے مستدعی و خواستگار ہیں کہ عرضِ معلی میں بار پاویں۔ اس عرصے میں صاحب مجسٹریٹ بھی آگئے اور اپنی میم اور بچوں کو کوٹھی سے کہ زیرِ دیوار کچہری ہے، طلب کر لیا اور بعد تھوڑی دیر کے نیم گارد کشمیری دروازے میں کہ وہاں بھی کمربندی تھی، بھجوا دیا۔ اسی اثنا میں لباس

صاحب سیشن جج بھی آگئے اور کچھ دیر تک گرد کچہری کے گردش کر کے کوٹھی میں چلے گئے۔ اور کچہری کو برخاست کا حکم دیا۔ اور ادھر قلعہ دار خدمت حضرت ظلِ سبحانی میں حسب الطلب حاضر ہوا۔ تمام حال وہاں کا بھی سن کر اور ہجوم سپاہیاں و سواریاں دیکھ کر چاہا کہ اُن لوگوں کو زیرِ قلعہ جا کر فہمائش کرے۔ مگر حضور اقدس از راہِ رحم و کرم منجملہ صفاتِ عطیہ الٰہی سے ہے، نیچے جانے کو مانع آئے۔ انجام کار قلعہ دار رخصت ہوا۔ اور تھوڑی دیر میں سُنا کہ قلعہ دار و بڑے صاحب و ڈاکٹر صاحب و میم لوگ وغیرہ دروازے میں مارے گئے اور سوار قلعے میں چلے آئے۔ حضور اقدس بھی دستار مبارک زیب سر اور شمشیر ولائتی زیب کمر فرما کر تشریف فرمائے دربار ہوئے۔ شہر میں اول چند سوار آئے اور دریا گنج کے انگریزوں کو مارتے ہوئے اور دو بنگلہ جلاتے ہوئے پیش ہسپتال زیرِ قلعہ آئے اور چمن لعل ڈاکٹر کو بھی دار الشفائے اصلی میں پہنچا دیا۔ کہتے ہیں کہ بڑے صاحب و قلعہ دار و ڈاکٹر وغیرہ چند انگریز کلکتی دروازے پر کھڑے ہوئے اور دوربین لگائے سڑک میرٹھ کا حال دریافت کر رہے تھے کہ دو سوار آئے۔ اس میں سے ایک نے طپنچہ اپنا جھاڑا اور ایک انگریز کو مار گرایا اور باقی جو بچ کر آئے حسب التحریر مذکورہ الصدر دروازہ قلعے میں مارے گئے اور پھر اور سوار بھی آ پہنچے اور شہر میں غل ہو گیا کہ فلاں انگریز وہاں مارا گیا اور فلانا انگریز وہاں پڑا ہے۔ راقم آثم بھی یہ چرچا دیکھ کر اور آواز بندوقوں کی سن کر بہ پاس دین وحمیت اپنے کلبہ احزان سے نکلا تو بازار میں عجب عالم دیکھا کہ جانب بازار کشمیری دروازے سے لوگ بے تحاشا بھاگے چلے آتے ہیں۔ مگر چونکہ حقیر کو تفریحِ طبع اور بپاس خاطر اپنے ناظرین کا جان عزیز سے عزیز تر تھا لہٰذا بے تکلف واسطے دریافتِ حال کے سیدھا اسی طرف روانہ ہوا کہ زیر کوٹھی سکندر صاحب پہنچ کر ایک آواز بندوقوں کی

باڑی کی سامنے سے سنائی دی۔ آگے چلا تو دیکھا کہ صاحب بہادر جو شمشیرِ برہنہ در کف سراسیمہ و بدحواس بے تحاشا بھاگے چلے آتے ہیں اور پیچھے پیچھے اُن کے تلنگے بندوقیں سر کرتے چلے آتے ہیں اور عوامِ شہر بھی کسی کے ہاتھ میں لکڑی اور کسی کے ہاتھ میں پلنگ کی پٹی، کسی کے ہاتھ میں بانس کا ٹوٹا اُس کے درپے چلے آتے ہیں۔ بلکہ بعضے بعضے آدمی شہر کے جی چلا کر دور سے مار بھی رہے ہیں۔ وہ سب انگریز کو لیے ہوئے جانب زینت باڑی سے نہر کی طرف لے چلے اور فقیر بجانب میدان نصیر گنج چلا۔ وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فخر المساجد کے آگے بیس پچیس تلنگے متفرق کھڑے ہیں اور لوگ اُن کو طرف مسجد کے اشارا کرتے ہیں۔ غرض دیکھا کہ چند تلنگے مسجد میں گئے اور پیہم بندوقیں مار کر سب کو وہاں سے بندوق کی راہ سے سیدھا ملکِ عدم کو پہنچادیا۔ آگے بڑھ کر پیش گرجا گھر اور زیر کوٹھی کالنس صاحب دیکھا کہ دو تین سو ترک سوار اور تلنگہ کھڑے ہوئے ہیں اور اُن میں سے متفرق ہو کر اِدھر اُدھر پھیلتے جاتے ہیں اور ایک ایک سے سوال ہے کہ بتلاو انگریز کہاں ہے اور جو کوئی نشان پتا بتلاتا تھا اُن میں سے دو چار سپاہی فوراً اُس کے ساتھ ہو لیتے تھے اور ایک آناً فاناً میں دیکھا گیا کہ جس کوچہ میں دیکھو دو تین انگریز مرے ہوئے پڑے ہیں۔ ایک ایک کوٹھی میں گھس گھس کر انگریزوں کو مع زن و فرزند تہ تیغ کیا اور جو بچ کر کسی کے گھر یا کوچہ و بازار کی موریوں میں جا گھسا وہ اُس وقت بچ رہا۔ تمام کوٹھیوں کا مال و اسباب لٹ گیا۔ گرجا گھر اور کچہری کی تمام کرسیاں اور میزیں بلکہ فرشِ زمین وغیرہ سنگِ مرمر تک بھی لوگ اُٹھا لائے۔ بعد تھوڑی دیر کے حقیر بہ طرف میگزین گیا تو مسجد نواب حامد علی خاں سے آگے بڑھ کر دیکھا کہ نکسن صاحب سر دفتر کمشنری کا لاشہ پڑا ہے اور کسی ظریف نے ایک بسکٹ بھی اُس کے منہ کے پاس رکھ دیا ہے۔ میگزین کی بارک میں عمل

مجاہدین کا ہو گیا تھا۔ اور سنا کہ اندر میگزین کے چند انگریز مع اکثر خلاصیوں کے دروازہ بند کیے بیٹھے ہیں۔ جانب مدرسہ جو نظر کی تو دیکھا کہ تمام اسباب میز کرسی و تصاویر و صدہا و ہزار ہا روپے کے آلات و ادویات تجربہ اور ہزار ہا روپے کا کتب خانہ، انگریزی و فارسی و نقشہ جات سب لوگ لوٹے چلے جاتے ہیں۔ انجام کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ شطرنجی وغیرہ اور چوکھٹ دروازہ تک نکال لے گئے۔ غرض یہ تمام حالات بدیدۂ عبرت دیکھتا ہوا حقیر غریب خانہ آیا اور ہر دم چاروں طرف سے آواز بندوق کی چلی آتی تھی کہ بعد تین بجے کے ایک آواز توپ کی آئی۔ اہلِ جلسہ متامل تھے کہ دوسری آواز آئی۔ حقیر فی الفور برائے دریافت حال کوٹھے پر گیا کہ دفعتاً ایک زلزلۂ عظیم بہ آواز مہیب اس قدر صدمہ سے معلوم ہوا کہ میں نے جانا حضرت اسرافیل نے صورِ قیامت پھونک دیا۔ غرض دیکھا تو معلوم ہوا میگزین اُڑ گیا۔ غبارِ تیرہ و تاریک تا سطح کرہ ہوا چھا گیا۔ اور اس میں پتھر اور سنگ ہائے دیوار مثلِ طیور و برگ ہائے درخت کہ آندھی میں اُڑتے ہیں معلوم ہوتے تھے۔ حقیر بہ دین خوف کہ مبادہ پتھر اُس کے یہاں بھی گر کر صدمہ پہنچے اسمائے متبرکہ ورد زبان کرتا ہوا نیچے اتر آیا۔ انجام کو معلوم ہوا کہ پچیس تیس انگریز مع زن و بچہ جو اندر بند تھے، اُن کو مارنے کو غازیان پلٹن سیڑھی وغیرہ کے وسیلے سے دیوار میگزین سے جانب فصیلِ شہر سے چڑھے۔ اندر سے محصورین نے بھی گولیاں ماریں اور اس اثنا میں دو فیر گراب کے نشست باندھ کر محصورین نے مارے مگر چونکہ افسر لوگ بجز قواعد و ضوابط کے مشاق و آزمودہ کار نہیں ہوتے لہٰذا ان سے چنداں کام نہ نکلا۔ انجام کو جب کہ دروازے پر توپیں لگا دیں اور ارادہ دروازے کے توڑنے کا کیا۔ محصورین نے اس عرصے میں جو جانب فصیل سرنگ لگا رکھی تھی اُسے اُڑا دیا۔ کچھ سپاہی بھی اِن میں ضائع ہوئے

اور اِسی شور و شغب میں اندر سے محصورین نکل، بھاگ نکلے۔ چند آدمی شاید مارے گئے اور باقی نکل گئے۔ اغلب ہے کہ بعد اس کے متفرقاً مارے گئے ہوں۔ سنا گیا ہے کہ ٹیلر صاحب پرنسپل مدرسہ بھی یہیں بند تھے۔ اُس دن تک کچھ آب و دانہ باقی تھا اور کوئی دن دنیا کی ہوا کھانی تھی کہ دوسرے دن یوم شنبہ قریب دو پہر اسی تھانے کے علاقے میں مارے گئے۔ "یہ شخص مذہب عیسوی میں نہایت متعصب تھا اور اکثر ناواقف لوگوں کو اغوا کیا کرتا تھا۔ چنانچہ چمن لال کا خون اسی کی گردن پر رہا۔ عجیب شانِ ایزدی ہے کہ یہ شخص نہایت مالدار تھا۔ قریب دو لاکھ کے روپیہ اس کا بنک کلکتہ و دہلی میں جمع تھا اور چند بنگلہ وغیرہ کرایہ کثیر کے چھاونی میں تھے اور یہ روپیہ بھی اس قدر سعی و کوشش سے جمع کیا تھا کہ صرف ڈیڑھ آنا یا چار پیسے روز اپنی ذات کے صرف طعام میں لاتے تھے اور باقی سب داخلِ بنک۔ دن رات میں جو وقت فرصت ہوتا تھا۔ اُسے حساب کتاب زرِ بنک میں صرف کرتے تھے۔ کپڑے بھی ضرورتاً قابلِ جلسہ اہلِ جلسہ کے پہنتے تھے لیکن قابلِ عبرت ہے حال دنیائے دوں کا کہ باوجود زرِ کثیر کے دن بھر لاشہ برہنہ خاک و خون میں پڑا رہا دیکھنے والے کہتے تھے کہ فقیری لباس اُس وقت تھا اور منہ پر خاک ملی ہوئی تھی"۔

اِس اقتباس سے مولوی صاحب کی ذہنی کشمکش کے کئی دروازے کھلتے ہیں۔ سر دست ہم ایک کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ سب کو معلوم تھا کہ مسٹر ٹیلر مولوی صاحب کے دوست خاص ہیں اور انھوں نے اُس کو اپنے امام باڑے میں چھپا رکھا تھا مگر وہ اس بات سے مسلسل انکار کرنے اور چھپانے کی کوشش میں تھے۔ اسی لیے جب لوگوں نے مولوی صاحب کے امام باڑے کا محاصرہ کیا تو وہ گھبرا گئے اور اس بات سے مشوش ہوئے کہ اگر مسٹر ٹیلر اُن کے ہاں پکڑے گئے تو سب کچھ ایک دم میں راکھ ہو جائے گا۔ اُدھر یہ بھی نہ چاہتے تھے کہ ٹیلر

صاحب مارے جائیں۔ اس کی ترکیب مولوی محمد باقر نے یہ نکالی کہ ٹیلر کو اپنا مولویانہ لباس پہنا کر اور جب و دستار باندھ کر امام باڑے کے تہہ خانے والے پچھلے دروازے سے نکال دیا اور خود سامنے والے دروازے سے نکل کر کھجور والی مسجد میں آگئے اور وضو کر کے نماز پڑھنے لگے کہ لوگ سمجھیں انھیں اس پورے قضیے کا کچھ معلوم نہیں۔ اُدھر جب مسٹر ٹیلر مولوی محمد باقر کا لباس زیب تن کر کے شہر سے باہر نکلنے کا ٹھکانہ ڈھونڈنے لگے تو چاندنی چوک کے پاس انھیں لوگوں نے پہچان لیا اور وہیں لاٹھیاں مار مار کر مار دیا۔ اب مولوی محمد باقر کے لیے مسئلہ یہ تھا کہ جو لباس وہ ٹیلر صاحب کو دے چکے تھے، وہ اگر پہچان لیا جاتا تو ایک اور مصیبت تھی۔ اس کو دور کرنے کے لیے مولوی محمد باقر نے اپنے اس مضمون میں خاص طور پر ایک پیرا مسٹر ٹیلر کے خلاف لکھ کر دراصل اپنے آپ کو اُس سے بری کرنے کی کوشش کی ہے اور اس کے بعد جس قدر بھی ۵۷ کے غدر کے متعلق مولوی صاحب کے اخبار میں مضامین چھپے ہیں وہ ایک طرح سے بلوائیوں کی حمایت ہی میں تھے لیکن یہی کوشش مولوی محمد باقر کے لیے مصیبت کا پھندہ بن گئی۔ ہوا یہ کہ کمپنی نے چار ماہ کی مسلسل کوششوں اور لڑائیوں کے بعد دہلی فتح کر لیا۔ یہاں تک کہ ۱۴ ستمبر کو انگریزوں نے مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ اس فتح کے بعد کمپنی نے بلا رو رعایت دہلی اور مضافاتِ دہلی کے مکینوں کا احتساب شروع کر دیا۔ غدر میں جس قدر انگریز عوام کا قتل ہوا تھا، اُن کا انتقام کمپنی کی اولین ترجیح تھی۔ اس انتقام کے لیے اُن لوگوں کی فہرستیں تیار ہونے لگیں جنھوں نے کسی بھی طرح سے دامے درمے یا سخنے کمپنی کی مخالفت میں ہاتھ دراز کیا تھا اور بلا کسی تاخیر کے فوری سزاؤں کے حکم جاری ہونے لگے۔

مولوی محمد باقر خوب جانتے تھے کہ اُن کا نام چھپا نہیں رہے گا اور کچھ ہی دنوں میں پکڑے جائیں گے۔ انھوں نے اپنی پیشی کے ڈر سے چاہا کہ خود حاضر ہو کر کچھ عذر خواہی کریں۔ مولوی محمد باقر کے پاس مسٹر ٹیلر کے دیے ہوئے کچھ کاغذات تھے، جن میں کالج کے متعلق دستاویزات اور بنک کے ڈاکومنٹ اور کچھ اُس کے ملکیتی کاغذات تھے اور ایک خط تھا۔

مولوی محمد باقر خیال کرتے تھے کہ کمپنی بہادر کے سامنے اگر وہ ان کاغذات کے ساتھ پیش ہو گئے تو شاید اُن کے جرم کو ہلکا خیال کر کے درگزر کر دیا جائے۔ ویسے بھی عملی طور پر جنگ میں حصہ لینے کا کمپنی کے پاس کچھ اور ثبوت نہیں تھا، سوائے اس کے کہ اخبار میں اُن کے کمپنی پر تنقیدی مضامین چھپتے رہے تھے۔ کہتے ہیں کچھ احباب نے مولوی محمد باقر کو منع بھی کیا کہ اس وقت کمپنی کے لوگ بردباری سے سوچنے کی صلاحیت کھوئے بیٹھے ہیں اور جوش کے ساتھ فیصلے صادر کر رہے ہیں اور دیکھ رہے ہو کس طرح دہلی کے درختوں کی شاخیں پتوں کی بجائیں لٹکی ہوئی لاشوں سے سجی پڑی ہیں۔ ذرا دم لو، اگر خطرہ ہے کہ کمپنی بہادر کے سپاہی گھر میں آن گھسیں گے تو کچھ زمانے کے لیے دہلی سے باہر کہیں روپوش ہو جاؤ اور پنجاب کی سیدھ لو یا پورب کی راہ کا ٹھکانہ لو مگر مولوی محمد باقر ان باتوں سے درگزر رے۔ اُن کو خیال اس امر میں یہ تھا کہ ایک تو مسٹر ٹیلر سے اُن کی دوستی، پھر اُن کی امانت واپس کرنے کے سبب کمپنی کے فیصلہ کار اُس کے عذر کو درخورِ اعتنا خیال کریں گے اور جان بخشی کا حکم دیں گے۔ یہ سوچ کر مولوی محمد باقر نے ٹیلر کے کاغذات کی گٹھڑی باندھی اور سیدھے کمپنی کے میجر کے پاس جا پہنچے۔ اُن دِنوں اُنھیں مجسٹریٹ کے اختیارات بھی تفویض ہو چکے تھے۔ جیسے ہی مولوی محمد باقر مجسٹریٹ کے سامنے آئے اور اُن کو ٹیلر کو کاغذات دکھائے۔ اُس نے کاغذات دیکھ کر ایک دم سوال کیا، مسٹر ٹیلر کہاں ہے؟ یہ سوال اتنا اچانک تھا کہ مولوی محمد باقر اس کا کوئی عذر خواہانہ جواب نہ دے پائے اور فوراً اُن کی زبان سے نکلا، وہ تو قتل کر دیے گئے ہیں۔ مجسٹریٹ اِس جواب سے بہت غضبناک ہو گیا اور فوراً مولوی محمد باقر کے خلاف وہیں بیٹھے بیٹھے سزائے موت کا حکم جاری کر دیا اور اُنھیں گرفتار کرنے کا آرڈر دے کر کہا کہ اس کے گھر کو کھود دیا جائے اور تمام جائداد قبضہ میں لے لی جائے۔ اس حکم کے سُنتے ہی سپاہیوں نے مولوی محمد باقر کو گرفتار کر لیا اور سپاہی مولوی محمد باقر کے گھر کی طرف کشمیری بازار چل دیے۔

آغا محمد باقر ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اُن کے پاس مسٹر ٹیلر کا لکھا ہوا خط موجود تھا۔ حاکم نے مولوی صاحب سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو انھوں نے مسٹر ٹیلر کا لکھا ہوا خط اُن کے سامنے پیش کر دیا۔ اُنھوں نے خط ایک طرف رکھ کر کہا، مسٹر ٹیلر کہاں ہے، مولوی صاحب نے جواب دیا، وہ تو مارے گئے۔'' یہی جواب دراصل حاکم کے لیے غصہ کا باعث بنا کہ ایک دوست ہوتے ہوئے بھی مولوی باقر اُسے کیوں بچا نہ سکا۔ اُس نے مولوی محمد باقر کے لیے سزائے موت کے آرڈر جاری کر دیے۔ اُن کی جائداد ضبط کر کے گھر کھودنے کا حکم دے دیا۔ اخبار اور پریس قبضے میں لے لیا اور آخر کار فصیلِ دہلی سے باہر برف خانہ کے میدان میں گولیوں کی باڑ مار کر شہید کر دیا''۔

یہاں تک کے حالات میں محمد حسین آزاد غدر کے ہنگامے میں کہیں نظر نہیں آتے کہ وہ اُن دنوں کن مصروفیات میں تھے لیکن یہیں سے آگے اُن کی داستان دلگداز شروع ہو جاتی ہے۔

کوئی ہو محرمِ شوخی ترا تو میں پوچھوں
کہ بزمِ عیشِ جہاں کیا سمجھ کے برہم کی

مولانا محمد حسین آزاد کے مساکن و اسفار

دہلی کے مسکن کی تباہی اور آزاد کا پہلا سفر

دہلی میں مولوی محمد باقر کی گرفتاری کا عمل اکیلے نہ تھا، بلکہ ہزاروں اشراف پکڑے آئے تھے اور سیاست پا کر موت کے انتظار میں سرِ میدان ستاروں کی طرح پڑے تھے۔ ان سیاست پانے والوں میں ہر طرح کے باغی تھے، یعنی کمپنی بہادر کے خلاف بندوق سے لڑنے والے، فتاوئ سے لڑنے والے، تقریروں کے واسطے سے دنیا کو مشتعل کرنے والے، مالی اور اخلاقی تعاون کرنے والے اور وہ بھی جن کی ذرا برابر ہمدردیاں باغیوں کے ساتھ ثابت ہوتی تھیں، سب ہی ڈھونڈ ڈھونڈ کر گرفتار کر لیے گئے تھے، جو گرفتار نہ ہو پائے تھے ان کے وارنٹ نکال کر اشتہار کر دیے گئے۔

> ''اخبار الظفر کا آخری پرچہ ۳۱ ستمبر ۱۸۵۷ کو شائع ہوا اگلا پرچہ ۳۰ ستمبر کو شائع ہوتا مگر ہوا یہ کہ ۱۴ ستمبر کو انگریزی فوج نے کشمیری بازار کو اپنے قبضے میں لے لیا۔''

مولوی محمد باقر کو جیسے ہی سزا کا حکم ہوا، گھر میں ایک کہرام مچ گیا۔ عورتوں کی چیخ و پکار اور نوحہ و بکا فضاؤں میں گونجنے لگا۔ سب جانتے تھے بغاوت میں ماخوذ ہونے کے کیا معنی

ہیں۔ گھر کے کسی ایک فرد کا بغاوت کے الزام میں سزا ہو جانا فقط ایک ہی فرد کی سزا پر ختم نہیں ہوتا تھا بلکہ پورے گھر کی تباہی اور بربادی کا پیغامِ قیامت آ جاتا تھا۔ ادھر گھر کا واحد سہارا محمد حسین آزاد تھے اور ان کے لیے بھی خطرہ سر پر منڈلانے لگا تھا۔ کوئی وقت تھا کہ آزاد کے لیے بھی سرکار کی طرف سے حکم سیاست نمبر ہو جاتا اور یہ بھی پکڑے جاتے اور موت کے بہانے کے واسطے یہی کافی تھا کہ یہ مولوی محمد باقر کے وارث ہیں۔ ابھی تو یہاں یہ رنج والم کے نوحے تھے اور آہ و بکا کی صدائیں تھیں کہ انگریزی پیادے گھر کا قبضہ لینے آن وارد ہوئے۔ عورتیں بچے سب سہم گئے۔ آزاد ہونق کھڑے دیکھتے تھے، کہاں جائیں مگر خوش بختی ابھی یہ تھی کہ سپاہیوں کے پاس فی الحال آزاد کی گرفتاری کا حکم نامہ نہیں تھا ورنہ خدا جانے یہ بھی باپ کے ساتھ بندھے جاتے اور سزا پاتے۔ آزاد نے ایک جگہ "آبِ حیات" میں ابراہیم ذوق کے باب میں لکھا ہے۔

> "فتح یاب لشکر کے بہادر دفعتاً گھر میں گھس آئے اور بندوقیں دکھائیں کہ جلد یہاں سے نکلو۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ بھرا ہوا گھر سامنے تھا اور مَیں حیران تھا کہ کیا اُٹھا کر لے چلوں۔ اُستاد کی غزلوں کے جنگ پر نظر پڑی، یہاں خیال آیا کہ محمد حسین، اگر خدا نے کرم کیا اور زندگی باقی ہے تو سب کچھ ہو جائے گا مگر اُستاد کہاں پیدا ہوں گے۔ جو یہ غزلیں پھر آ کر کہیں گے۔ اب اُن کے نام کی زندگی ہے اور ہے تو اِن پر منحصر ہے۔ یہ ہیں تو وہ مر کر بھی زندہ ہیں۔ یہ گئیں تو نام بھی نہ رہے گا۔ وہی جنگ اُٹھا بغل میں مارا، بے سجائے گھر کو چھوڑ کر ۲۲ نیم جانوں کے ساتھ گھر سے بلکہ شہر سے نکلا۔ ساتھ ہی زبان سے نکلا کہ حضرت آدم بہشت سے نکلے تھے۔ دلی بھی ایک بہشت ہے۔ اُنھی کا پوتا ہوں۔ دہلی سے کیوں نہ نکلوں؟"

آیئے ذرا مولانا کی پہلی غریب الوطنی کا حال اُنھی کی زبانی سنتے ہیں جب وہ شہر سے

نکلے تو کیسے نکلے اور کہاں کہاں گردش کرتے ہوئے لکھنؤ پہنچے۔ یہاں سے آزاد کی ایک دوسری زندگی کا جنم ہوتا ہے۔ آزاد خالی ہاتھ بے گھر ہو کر ایک بنجارے کی طرح انجان راہوں کے مسافر بنے۔ سر پر پورے کنبے کی گٹھڑی تھی جسے اُٹھائے اُٹھائے پھرتے تھے۔

ایک جگہ حالتِ جنوں کی ایک تحریر میں لکھتے ہیں:

''۲۱ نیم جانوں کو لے کر شہر سے نکلا۔ وہ بھی تباہ ہو جاتیں، گھر جب آ کر خالی دیکھا، جان ہی نکل گئی، ہے ہے ننھے ننھے بچے ساتھ ہیں، عورتیں ہی عورتیں ہیں، ایک مَیں، باپ تو شہید ہوئے، وہ مجھے کیونکہ پائیں اور مَیں انھیں کیونکر، سپاہی تین چار ساتھ تھے۔ اُن کے آگے ہاتھ جوڑے، منت کی۔ سر سے ٹوپی اُتار کر پاوں میں گر پڑا۔ تب وہ ساتھ لے کر سکندر سنگھ کی کوٹھی میں لائے۔ سردار بہادر بچارے نے رحم کیا۔ کہا لے جاو چھاونی میں ہمارے بنگلے پر۔ وہ عورتیں گھر سے کبھی نہیں نکلیں۔ اِن میں اکبر علی، ان میں امداد حسین، وہ کہیں ہائے ہائے مرے جاتے ہیں۔ مَیں کہتا ارے بھائی ہمت کا وقت ہے، یہ تو اللہ کی مدد ہے، کجا سردار بہادر، کجا مَیں۔ کجا ہم تم اور کجا یہ سپاہی حفاظت کو۔ وہ کہے بھائی تمھاری ہمت ہے، وہ کہے تمھاری ہمت ہے ہماری نہیں۔ خدا خدا کر کے پہنچے، وہاں سردار بہادر کا بھائی موجود تھا۔ اُس نے کہا بٹھا دو اِدھر ایک طرف۔ میدان میں بٹھا دیا۔ علی نقی بیگ کی جورو بولی، ہے ہے یہاں بیٹھیں کہاں کوٹھی تو وہ ہے۔ وہ لگاتار سناتی تھی کہ ہم ایسے اور وہ ایسا۔ وہ نہ سمجھا گھبرا کر بولا، مرحمت شما است، جائے کہ حکم فرمائید می نشیند حجرہ باشد کہ در دو سر خود فرو بر بند بہ نشیند، دعائے کنند۔ اُس کے پاس ایک اور شخص کھڑا تھا اُس نے پوچھا کیست؟ اس نے کہاں از کلاں تران این جا است۔ اُس نے پھر پوچھا ایں (آزاد)؟ اس نے کہا آغا ئش۔ سامنے ایک چھپر تھا، اُس نے کہا اس میں بٹھا دو۔ وہاں گھوڑے بندھے تھے اور لید کوئی نکالتا نہ تھا۔ اوپر گرد جم گئی تھی

، اکبر علی اندر گھسا، پاؤں کی جگہ گدگدی محسوس ہوئی۔ ہاتھ سے اور ٹھوکر سے ٹٹولا۔ معلوم ہوا کہ اندر لید ہے۔ گھبرا کر نکل آیا، سب کو کہا باہر ہی رہو، اندر تو یہ حال ہے۔ عورتیں ڈر کر تھم گئیں، اُن سے سیدھا کھڑا نہ ہوا جاتا تھا۔ کئی جھکی جھکی آئیں اور جھکی کھڑی رہیں۔ اُس نے کہا پاؤں اندر دھنسے جاتے ہیں۔ ایک کا منہ ایک دیکھنے لگیں۔ پروفیسر آزاد نے کہا! بھئی اکبر علی جگہ کو تم صاف کرلو۔ ایک پرانی سنگین سامنے پڑی تھی۔ وہ چپکے سے اُٹھا لایا، (اکبر علی نے کہا) دیکھو تو کیا لایا ہوں۔ تم ذرا اِن کے نوکروں سے کہو بھئی یہ صاف کر دو۔ اے لو یہ ہے، اِس سے خوب کھدے گا۔ پروفیسر آزاد دق ہو کر اُٹھا، میاں اکبر علی تمھاری قصہ خوانی بھلا یہاں کہاں۔ ارے بابا خدا کا شکر کرو غنیمت سمجھو کہ یہاں پہنچ گئے۔ وہ امداد حسین ٹل کر عورتوں کے پیچھے جا بیٹھا کہ ضعف کے مارے کھڑا نہ ہو سکتا۔ بیبیاں حیران کہ مردوں کا یہ حال ہے، خدا جانے ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ پروفیسر آزاد نے پھوپھی سے کہا تم اندر جا کر دیکھو تو سہی۔ یہ نعمت الٰہی، یہ رحمت الٰہی گھر سے اس حالت کے ساتھ نکل کر اس حمایت الٰہی کے سائے میں آنا کچھ بات ہے، میرا تو منہ اِس قابل نہیں۔ یہ کہہ کر پھر ان کے پاس گیا اور کہا۔ مرحمت شما زیاد نشستند مگر حیران کار ہستم، بولے ندارد چہ کنند، وہ مسکرایا اور کہا، ما ہم ندارید، اُس نے کہا خدا خیر می دہد، حالا ہر چہ، سردار صاحب فرمودہ اند مرحمت شود کہ برادرم ہیرم۔ اُس نے کہا برادر یہ۔ یہ لیکر آپ چلا۔ اُنھیں خدا کے حوالے کیا۔ اِس نے کہا یہ بھوکی مر جائیں گی۔ خدا نے اُس کے دل میں رحم دیا۔

اُس نے روٹیاں پکوائیں اور دو دو روٹیاں سب کو دیں۔ اُس نے وہ لے جا کر چار اور دو دو سب کو دیں، کہا بھئی چار بجی ہیں۔ امداد حسین نے کہا، اِن کے ٹکڑے کر دو۔ دوا؟ پ لو ایک ایک سب کو دو۔ یہ چپ۔ بہن نے

کہامنہ کیا دیکھتا ہے، یہ انھی کی جوتیوں کا صدقہ ہے"۔

"ان نیم جاں افراد کو بیل گاڑیوں میں بٹھا کر رب العزت کی بارگاہ میں عاجزانہ دعائیں کیں۔ اور منشی امداد حسین کے ساتھ انھیں سونی پت روانہ کیا۔ خاندانی روایت یہ ہے کہ انھیں رخصت کر کے مولانا آزاد پھر سردار سکندر سنگھ کے پاس کشمیری دروازے چلے آئے اور بضد سردار بہادر سنگھ سے ساجت التجا کی کہ میں اپنے شفیق باپ کی آخری بار زیارت کرنا چاہتا ہوں۔ سردار بہادر نے جواب دیا حالات خطرناک ہیں، آپ کا دہلی میں ٹھہرنا خطرے سے خالی نہیں لیکن آزاد نہ مانے آخر سردار صاحب راضی ہو گئے۔ قرار یہ پایا کہ آزاد ان کے ساتھ سائیس کا لباس پہن کر چلیں۔ وہ گھوڑے پر سوار ہو گئے اور آزاد سائیس کے لباس میں ان کے پیچھے پیچھے بھاگے، دہلی دروازے کے باہر۔ میدان میں ایک ہجوم نظر آیا جو دن کی دھوپ سے نڈھال تھا۔ فوجی پہرے میں وہ اپنی زندگی کی آخری گھڑیاں گن رہے تھے۔ اسی ہجوم میں ایک طرف ایک مرد خدا نہایت خشوع و خضوع سے اپنے پروردگار کی عبادت میں محو تھا۔ وہ آزاد کے شفیق باپ مولوی محمد باقر تھے۔ آزاد گھوڑے کی باگ تھامے کچھ فاصلے پر کھڑے تھے اور منتظر تھے کہ کب آنکھیں چار ہوں۔ مولوی صاحب نے نماز ختم کر کے آنکھ اٹھائی تو سامنے اپنے پیارے بیٹے کو پایا۔ چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوئے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اِدھر یہی حالت بیٹے پر گزری۔ انھوں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے اور ساتھ ہی اشارا کیا کہ بس آخری ملاقات ہو چکی، اب رخصت۔ سردار صاحب نے اپنا گھوڑا موڑ لیا اور واپس چلے آئے۔ آزاد اس وقت تک سردار بہادر کے پاس مقیم رہے۔ جب تک شاہجہان آباد کی یہ بے گناہ روحیں قفس عنصری سے آزاد نہ ہوئیں۔ جب اعلان ہو گیا کہ انھیں باڑ مار کر شہید کر دیا گیا تو

آزاد دہلی سے پورب کی جانب پاپیادہ روانہ ہو گئے۔ وہ جب بھی دہلی
جاتے تھے۔ اسی مقام پر کھڑے ہو کر سورت فاتحہ پڑھتے اور اپنے شفیق
باپ کو یاد کر کے روتے رہتے"۔

آغا محمد باقر اپنے ایک مضمون میں دہلی کے بربادوں کی بربادی کا حال یوں لکھتے
ہیں۔

"یہ آشفتہ حال قافلہ رنج وغم اور بربادی سے تباہ حال تھا کہ اس حال میں
گھر سے نکل کر قریب کی ایک گلی میں بیٹھ گیا۔ یہ گلی آج تک دھوبی
واڑے کے نام سے موسوم ہے۔ یہ خانماں برباد لوگ یہاں سے اکٹھے ہو
کر شہر سے باہر نکل جانے کا ارادہ رکھتے تھے کہ یکا یک ایک گولہ زمین پر
آگرا۔ اس کے دھماکے سے مولانا آزاد کی ایک شیر خوار بچی جس کی عمر
تقریباً ایک سال تھی، دہل گئی اور اس پر سکتے کا عالم طاری ہو گیا۔ یہ
حالت کئی دن تک رہی۔ اور آخر اس حال میں وہ بھی انتقال کر گئی۔ قافلہ
دھوبی واڑہ سے روانہ ہو کر برف خانہ پہنچا۔ برف خانہ جنتر منتر کے قریب
واقع تھا اور جنتر منتر یہاں سے تقریباً تین میل پر تھا۔ یہ لوگ بڑی مصیبت
جھیل کر وہاں تک پہنچے اور جان میں جان آئی۔ اس وقت دلی کے برباد
شدہ لوگوں کو کوئی پانی پلانے کا بھی روادار نہ تھا کہ کہیں خود بھی بغاوت کے
الزام میں ماخوذ نہ ہو جائے۔ کسی درخت کے نیچے ڈیرے ڈال دیے اور
کھانے پینے کی فکر ہوئی کہ کئی دن سے چھوٹے بڑے فاقوں سے تھے۔
پیٹ بڑی دوزخ ہے جس کو ہر حال میں بھرنا ہی پڑتا ہے۔ جو کچھ کسی کے
پاس حسن اتفاق سے رہ گیا تھا وہ اس نے نکال کر پیش کیا۔ وہاں ہزار
دقتوں سونے کے تول آٹا ملا۔ ایسی حالت میں تو اچولہا کہاں سے ملتا۔ مٹی
کے ٹھیکرے میں آٹا گوندھا۔ اور پتھر جمع کر کے ان کا چولہا بنایا۔ ادھر ادھر
سے درختوں کے پتے اور ٹہنیاں جمع کر کے آگ جلائی۔ ٹھیکرے ہی سے

توے کا کام لیا اور کچی پکی روٹیاں پکائیں۔ کہیں سے مانگ تانگ کر لہسن مرچیں اور نمک مہیا کیا۔ اُسے بھی پتھروں پر پیسا اور چٹنی تیار کی۔ میری والدہ بیان کرتی ہیں کہ آزاد مرحوم کہا کرتے تھے، بیٹی اُس لہسن کی چٹنی اور ٹھیکروں پر پکی ہوئی روٹی میں ایسا مزا آیا کہ کبھی پلاو، زردے اور قورمہ بریانی میں نہیں آیا۔ اس مقام پر ایک عجیب لطیفہ ہوا، اول تو آٹا ہی اتنا نہ ملا کہ سب پیٹ بھر کر روٹی کھاتے۔ پھر پانی بھی ضرورت سے کم میسر آیا۔ روٹی کھانے کے بعد جس قدر پانی تھا، ختم ہوگیا۔ اور صرف ایک ٹھلیہ میں باقی رہ گیا۔ وہ ٹھلیہ مولانا آزاد کی پھوپھی کے پاس تھی۔ وہ اس میں سے کسی کو پانی نہ دیتی تھیں۔ اس بات پر آزاد کو غصہ آیا لیکن وہ پھوپھی تھیں ، کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ آخر جب ان سے نہ رہا گیا تو وہیں زمین پر لیٹ گئے اور جونہی پھوپھی کا دھیان دوسری طرف ہوا، ایک پتھر کی کنل سے ٹھلیہ کا نشانہ اُڑا دیا۔ ٹھلیہ ٹوٹ گئی اور پانی بھل بھل بہہ گیا۔ پھوپھی نے کہا میں تو اس لیے پانی نہ دیتی تھی کہ جب بہت پیاس لگے گی تو دوں گی۔ لو وہ ٹھلیہ ہی ٹوٹ گئی۔ یہاں بیٹھ کر یہ فیصلہ ہوا کہ تمام قافلہ منشی بشیر حسین کے ساتھ سونی پت روانہ ہو جائے۔ منشی صاحب چھاپا خانہ کے منتظم تھے۔ اور ان کے والد بھی ان سے پہلے یہی خدمت بڑی دیانت داری سے انجام دیتے رہے۔ اس لیے ان پر ہر قسم کا بھروسا تھا۔ بدقت تمام بیل گاڑی کرایہ پر کی گئیں اور تمام سواریاں منشی صاحب کی نگرانی میں سونی پت روانہ ہو گئیں۔ آزاد کو ہر چند سب نے کہا کہ ہمارے ساتھ چلو، اور اپنی جان کو مزید خطرے میں نہ ڈالو لیکن انھوں نے کہا کہ اللہ نگہبان ہے، میں ایک مرتبہ اپنے والد سے ضرور ملوں گا۔ آخر سب روتے پیٹتے روانہ ہو گئے۔ اور آزاد وہاں سے اپنے اُستاد کا کلام بغل میں دبائے سیدھے دہلی آئے۔"

سُنبل چمن کا مفت میں پامال ہو گیا

مولوی محمد باقر سے آزاد کا سامنا

محمد حسین آزاد دہلی پلٹے تو اُن کے لیے سب سے بڑا مسئلہ پناہ لینے کا تھا کہ کوئی ایسا ٹھکانہ ملے جہاں فلکِ ناہنجار کا سایہ نحس اُن پر نہ پڑے اور باپ سے ملاقات کی راہ کھلے۔ وہی باپ جو اسیرِ دشمن ہو کر ہوائے زمانہ کا شکار ہوا پڑا روتا تھا اور اپنی قسمت کے خانوں میں موت کا اسپ تلاش کرتا تھا جو انھیں جاپ فلک اُڑا لے جائے۔ اِسی حالت میں اُن کے خیال میں ایک نام آیا، یہ جرنیل سنگھ تھا اور بھلے بستے ہوئے زمانوں میں مولوی محمد باقر کا دوست رہ چکا تھا اور اِس میں اخلاص اُس کا ہمرکاب تھا۔ جرنیل سنگھ انگریزوں کی طرف سے دہلی کے باغی قیدیوں کا نگہبان تھا اور اُس کی کمپنی کے ساتھ وفاداری برابر تھی۔ محمد حسین آزاد سیدھا اسی کی حویلی میں روانہ ہوا۔ کئی دنوں کی بھوک پیاس اور بے چارگی کا ماندہ حال سے بے حال ہو چکا تھا۔ ایسے کہ ۲۷ برس کا جوان ۷۲ برس کا بوڑھا لگتا تھا۔ بال بڑھے ہوئے، منہ کی ہڈیاں جبڑوں تک نکلی ہوئیں۔ چہرہ گرد سے اٹا ہوا، پاوں جوتوں سے باہر اور کپڑے چیتھڑوں کا تماشا تھا۔ ایک گٹھڑی سر پر لدی تھی، یہ وہی اُستاد ذوق کا کلام تھا جسے پہلو میں دل کی طرح باندھے پھرتے تھے۔ وہیں روانہ ہوئے اور دہلی کے کوچہ و بازار میں باولوں کی طرح پھرنے لگے۔ کوئی پُرسانِ حال نہ تھا۔ کوئی عزاداری کرنے والا نہ تھا، یہ وہی دہلی تھا جہاں اُس کا دادا رہا، باپ رہا، اور ۲۷ برس تک وہ خود رہا۔ وہی دہلی جہاں کا پتہ پتہ بھی شناسائی کا فسانہ کہتا تھا۔ گلی گلی جہاں کی محبت کی آغوش رکھتی تھی اور آج یہی دہلی ایک سرائے بھی نہ تھی۔ ایک آسن کا جھما کا تک نہ دیتی تھی۔ یہ شہر جسے جہان آباد کہلانے کا دعویٰ تھا، آج ایک خرابے کا منہ چڑاتا تھا۔ آزاد دہلی کی گلیوں میں ایک کے بعد دوسری میں فقیروں کی طرح بھٹکتے جاتے تھے اور کسی جانب راہ نہ پاتے تھے۔ کبھی کسی ٹوٹی پھوٹی دکان میں پناہ لیتے، کبھی کسی قبر کی آڑ لے کر پڑ رہتے۔ ہر اُس گلی میں گئے جہاں پہچان دار رہا کرتے تھے مگر اب

کوئی نظر نہ آتا تھا، ہر اُس کوچے میں تو ماری جہاں بزرگ بسا کرتے تھے مگر اب وہ گلیاں مشفق نہ تھیں، کوئی واقف نہ تھا۔ ایک دن آزاد نے ایک ٹوٹی ہوئی دکان کے پٹ سہارد ے کر کھڑے کیے اور اُس کے ایک گوشے میں تکیہ بنا کر رہنے لگے اور جرنیل سنگھ سے ملاقات کا بہانہ سوچنے لگے اور وہ رستہ دیکھنے لگے جس رستے وہاں تک رسائی ہو۔ آخر ایک دن یہ لمبے چلے آئے۔ چاروں جانب سے امان کی خبر پا کر وہیں روانہ ہوئے اور جرنیل سنگھ کے پاس جا پہنچے۔

یہاں ہم آغا سلمان باقر کے ایک مضمون کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔

پے در پے حادثات اور انقلاب کی شدت نے آزاد جیسے حساس شخص کو ہر طرف سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا۔ جہاں اُن کا ذہن اِس سے متاثر ہوا وہاں اُس کے اثرات چہرے اور جسم پر بھی نمودار ہوئے۔ اِس بگڑے ہوئے حلیے میں سردار جرنیل سنگھ نے آزاد کو بڑی مشکل سے پہچانا اور جب پہچان لیا تو اُٹھ کر گلے لگا لیا۔ حالات معلوم کیے۔ آزاد نے اپنا ارادہ ظاہر کیا۔ سردار جرنیل سنگھ نے کہا شہر کی حالت تمھیں معلوم ہے۔ تمہارا ایک لمحہ بھی یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔ لیکن آزاد مصر رہے کہ میں اپنی آرزو ضرور پوری کروں گا۔ چاہے اِس کے لیے مجھے جان پر ہی کیوں نہ کھیلنا پڑے۔ آخر آزاد کی لگن اور اصرار کو دیکھتے ہوئے سردار نے حقِ دوستی ادا کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُس نے سب سے پہلے آزاد کو مشورہ دیا کہ اپنا لباس تبدیل کرو اور میرے سائیس کا لباس پہنو۔ اِس لیے کہ اپنی جان کو اِن حالات میں سلامت رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ آزاد نے اِس پر عمل کیا۔ کہتے ہیں کہ سردار نے پہلے خود دہلی دروازے جا کر باغی قیدیوں کا معائنہ کیا۔ قیدی لق و دق میدان میں پڑے تھے۔ نہ اُن کے پاس تن ڈھانپنے کو کپڑا تھا اور نہ پیٹ بھرنے کو روٹی تھی۔ بھوک اور پیاس سے ماہیِ بے آب کی طرح تڑپتے تھے۔ ہر شخص دن کی دھوپ اور رات کی سردی سے نڈھال بلکہ نیم جان تھا۔ یہی وہ لوگ تھے جو شاہجہان آباد کی روحِ رواں اور روسا کہلاتے

تھے لیکن آج ناگہانی موت اور بے اندازہ آلام نے اُن کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ چاروں طرف سنگین فوجی پہرہ تھا۔ سردار جرنیل سنگھ نے واپس آکر آزاد کو اِن حالات سے آگاہ کیا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ دوسرے روز جرنیل سنگھ صاحب اپنے گھوڑے پر چلیں اور آزاد بہ حیثیت سائیس اُس کے ساتھ ساتھ دوڑیں اور اِس طرح قیدیوں تک آسانی سے پہنچ جائیں۔

دوسرے روز اِسی تجویز پر عمل ہوا، آزاد سائیس کا لباس پہنے جرنیل سنگھ کے گھوڑے کے ساتھ ساتھ چلے اور آخر اُس مقام تک پہنچے جہاں باغی قیدی اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہے تھے۔ کوئی بھوک پیاس سے رو رہا تھا کسی کو موت اور بربادی کا الم نیم جان کیے ہوئے تھا۔ بہت سے بے فکرے اِس عالم میں بھی بے فکر تھے۔ اِنھی لوگوں میں ایک طرف کو ایک مردِ خدا خلوصِ دل سے عبادت میں مصروف تھا۔ چہرے پر سکون اور اطمنان کے آثار تھے۔ یہ آزاد کے والد مولوی محمد باقر تھے۔ بہت دیر کے بعد نظر اٹھائی تو تھوڑے فاصلے پر اپنا پیارا، لاڈوں کا پالا، جگر گوشہ سائیس کے لباس میں کھڑا ہوا نظر آیا۔ ایک دم چہرے پر پریشانی کے اثار ظاہر ہوئے اور آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اِدھر یہی حالت بیٹے پر گزری۔ دنیا آنکھوں کے سامنے اندھیر ہوگئی۔ جب نظر نے یاوری کی تو دیکھا کہ ہاتھ کے اشارے سے مولوی محمد باقر اپنے بیٹے آزاد سے کہہ رہے ہیں، کہ بس آخری ملاقات ہوگئی۔ اب رخصت ہو اور دیر نہ کرو۔ اِس اشارے کے بعد اُنھوں نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیے۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ ایسی حالت میں اپنے پیارے اکلوتے بیٹے کے لیے اُنھوں نے کیا کیا دعائیں مانگی ہوں گی۔ آزاد نے اِس وقت لاکھ ضبط کیا لیکن نہ ہوسکا۔ وہاں سے روتے ہوئے رخصت ہوئے۔ اور اُس وقت تک اُس وفادار سردار جرنیل سنگھ کی حفاظت میں رہے جب تک شاہ جہان آباد کی یہ مقدس اور معصوم روحیں قفسِ عنصری میں قید رہیں۔

آگے چل کر لکھتے ہیں:

''آزاد کو بچپن سے وظیفے اور ورد پڑھنے کا شوق تھا۔ انسان کی فطرت کا

قاعدہ ہے کہ جس ماحول میں وہ تربیت پاتا ہے وہ اُس کی طبیعت پر اپنا اثر ضرور دکھاتا ہے چونکہ اُن کا خاندان مجتہدین کا خاندان تھا۔ اسلیے وظائف اور اوراد کا شوق بھی قدرتی تھا۔ چنانچہ انھوں نے سردار جرنیل سنگھ کے مکان میں رہ کر دعائے صنم قریش کا ورد شروع کیا۔ یہ وظیفہ چودہ دن تک آدھی رات کے بعد پڑھا جاتا ہے اور چودہ دن کے بعد دلی مراد بر آتی ہے۔ آزاد کو اس وظیفہ پر بڑا بھروسا تھا۔ جرنیل سنگھ کے کمپ کے پاس ایک کھنڈر مکان تھا جو اس وظیفے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ آزاد چودہ راتیں برابر وظیفہ پڑھ کر کھنڈر میں سوتے رہے آخری رات کو آزاد نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص کہہ رہا ہے، محمد حسین اُٹھ لے، کنجیاں لے۔ یہ آواز تین مرتبہ کانوں میں آئی اور اُن کی آنکھیں کھل گئیں۔ اُٹھ کر ادھر اُدھر کنجیاں تلاش کرنی شروع کیں۔ آخر اس نتیجے پر پہنچے کہ قفل مراد کی کنجیاں ہاتھ آگئیں۔ آزاد اُٹھے اور چل دیے۔"

دہلی شہر میں یہ افواہ پھیلی کہ تمام قیدیوں کو گولی مار دی گئی۔ یہ خبر دہلی کے حیران و سرگرداں اور ویران مکانوں سے سر ٹکراتی کوچہ و بازار میں پھر گئی۔ جامعہ مسجد نوحہ کناں تھی۔ گھروں کے چوبارے گویا بانہیں پھیلا کر روتے تھے۔ مکانوں کی منقش چھتیں سینہ پیٹتی تھیں چھجوں پر سے کبوتر اُڑ گئے تھے۔ اُلو پھڑ پھڑاتے پھرتے تھے۔ آزاد عجب عالم میں دہلی سے نکلے صدمات اور پریشانیوں نے اُنھیں بڈھا کر دیا تھا۔ دنیا آنکھوں میں اندھیر تھی۔ کہیں جانے کا رستہ نہ ملتا تھا۔ اُستاد کے کلام کا پلندہ بغل میں تھا۔ سکھ سردار نے چلتے چلتے ایک دری اور آٹا گوندھنے کے لیے ایک لکڑی کا ٹکڑا بھی دے دیا تھا، وہ بھی ساتھ تھا۔ آزاد یہ سامان اُٹھائے، تھکے تھکے قدموں کے ساتھ شہر سے باہر چلے جا رہے تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی، بال بکھرے ہوئے اور اسباب کا بوجھ کندھوں پر تھا۔ ابھی جمنا کے پُل پر پہنچے ہی تھے کہ ایک فرنگی نے روک لیا اور ساتھ ہی اپنی بندوق کی سنگین سے پلندہ اُٹھا کر زمین پر دے مارا اور کہا

اوئے بڈھے اس میں کیا ہے؟ سنگین اور پاؤں کی مدد سے پلندہ کھولا، جب اس میں سے
پرانے کاغذات کے پرزوں کے علاوہ کچھ برآمد نہ ہوا تو بکتا ہوا چل دیا۔ آزاد نے بدقت
تمام کاغذات جمع کیے اور جلدی جلدی انھیں باندھ کر آگے روانہ ہو گیا اور یہاں تک کہ دہلی
شہر بہت پیچھے رہ گیا اور محمد حسین آزاد نامعلوم رستے پر چل دیے۔

اِن اُجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا

دہلی سے آخری رخصت

چونکہ آزاد کا کسی غیر دیار کا یہ پہلا سفر تھا اس لیے اور یہ بھی خبر نہ تھی دیار کون سا ہے۔اور سامان کیا ہے۔ کہیں جانے کا رستہ نہ ملتا تھا، نہ دماغ تھا کہ کہاں جائے پناہ ملے گی۔ وارنٹ جاری ہونے کے سبب ایسی جگہ مناسب نہ تھا جہاں ذرا سا بھی بے مروتی کا احتمال تھا۔ اُستاد کے کلام کا پلندہ سر پر تھا۔ اِس کے علاوہ سکھ سردار نے چلتے وقت ایک چھوٹی سی دری اور آٹا گوندھنے کے لیے ایک لکڑی کا کٹھوا بھی دے دیا تھا۔ وہ بغل میں تھا اور شہر سے باہر نکلنا چاہتے تھے کہ ایک فرنگی نے ٹوکا اور ساتھ ہی اپنی بندوق کی سنگین سے اُن کے سر کا پلندہ اُٹھا کے زمین پر دے مارا اور کہا اے بڈھا اس میں کیا ہے؟ سنگین اور پاوں کی مدد سے پلندہ کھول ڈالا۔ جب اِس میں سے سوائے پرانے کاغذ کے پرزوں کے اور کچھ نہ برآمد ہوا تو کچھ بکتا ہوا چل دیا۔ آزاد نے بدقت تمام کاغذات جمع کیے اور جلدی جلدی باندھ آگے روانہ ہوئے۔ یہاں تک کہ شہر سے باہر نکل گئے۔ آزاد نے ایک نقل مثنوی حب وطن میں بیان کی ہے۔

دلی کے جو ہمیشہ سیکاں کمال ہے
جو باکمال اِس میں ہے وہ بے مثال ہے
اِک شخص واں ستار نوازی کی جان تھا
پر جان سے عزیز تھا دلی کو جانتا

آیا دکن سے خلعت و زر اِس کے واسطے
اور نقد بہر ذات سفر اِس کے واسطے
ہر چند منہ تو دلی سے موڑا نہ جاتا تھا چ
تنہا پر ہاتھ سے یہ مال بھی چھوڑا نہ جاتا تھا
دلی کو یہ بھی چھوڑ کے سوئے دکن چلے
پر جیسے کوئی چھوڑ کے بلبل چمن چلے
اونچے مگر ابھی تھے در راج گھاٹ پر
جو دفعۃً نظر پڑی جمنا کے پاٹ پر
دریا کی لہریں دیکھ کر لہرایا اِن کا دل
اور دلی چھوڑتے ہوئے بھر آیا اِن دل
منہ پھیر نگاہ جونہی شہر پہ پڑی
جلوہ دکھاتی جامعہ مسجد نظر پڑی
تب وہ پیام برکہ جو آیا دکن سے تھا
اور اُن کو لے چلا وہ چھڑا کر وطن سے تھا
دیکھا نگاہِ یاس سے اور اُس سے یہ کہا
پیچھے چلیں گے پہلے مگر یہ تو دو بتا
ایسی تمھارے شہر میں جمنا ہے یا نہیں
منہ دیکھ کر وہ اس کا ہنسا اور کہا نہیں
پھر سوئے شہر اشارہ کیا اور یہ کہا
مسجد بھی اس طرح کی دکھا دو گے واں بھلا

وہ شخص مسکرایا کہ یہ کیا سوال ہے
اِس خانہ خدا کا تو ثانی محال ہے
ہے اپنی طرز میں یہ نرالی جہان سے
اُتری زمیں پہ جس کی شبیہہ آسمان سے
یہ بات اُس کی سنتے ہی چیں بر جبیں ہوئے
اور بولے خیر ہے کہ روانہ نہیں ہوئے
جمنا نہیں ہے، جامعہ مسجد جہاں نہیں
سنتے بھی ہوئے میاں ہمیں جانا وہاں نہیں"

کیا ترے کوچے سے اے شوخ وہ رنجور گیا

دہلی سے کوچ اور پورب کو روانی

جب تک باپ کی نیا کنارے نہ لگ گئی میاں آزاد دہلی سے نہ نکلے اور مضافات دہلی کے ویرانوں میں سر ٹکراتے رہے۔ اول جرنیل سنگھ کے گھر میں قیام چند دن رہا، پھر چھوڑ دیا کہ وہاں مخبروں کی کھیپ باغیوں کو تاڑتی پھرتی تھی۔ جہاں ذرا مشکوک آدمی کی بھنک پڑی، فوراً اطلاع ہوئی اور پل میں مشکیں کسی گئیں۔ آزاد کو جرنیل سنگھ پر تو پورا بھروسا تھا مگر اُن مخبروں کا کیا کرتے جو چند سکوں کے عوض انسانوں کی جانیں انگریزی باڑ میں جھونکنے سے آتے تھے۔ اِس سب کو دھیان میں لا کر وہاں سے آخر نکل لیے۔ چارہ کار اِس کے سوا کیا تھا کہ پورب کی طرف راہ پاتے اور لکھنؤ میں جا کر چند دن سر چھپاتے۔ سو وہیں کی طرف تیر ہوئے۔ اُن کے پاس سرمائے کے طور پر اُستاد کا کلام تھا جو ذہنی تسکین کا وجود تھا کہ اِسی ایک اُستاد کے کلام سے باپ کی یاد بھی بندھی تھی اور دل کی آواز بھی لگی تھی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے دلی دوست تھے۔ اب یہاں مسئلہ ایسا گڑ بڑایا ہوا تھا کہ غدر کا ہنگامہ محض دہلی تک نہ تھا کہ وہ کسی دوسرے قریے میں پناہ لیتے اور جان کی امان پاتے۔ آزاد کی گرفتاری کے اشتہار پورب، دکن، پچھم سب جگہ پھیل گئے تھے۔ ہاں مگر تب کے وقتوں میں یہ آسانی تھی کہ عکسی تصویر کا چکر نہ تھا، نہ اخبار قریہ ودیہات میں پڑھے سُنے جاتے تھے۔ تب کا اشتہار بس اشتہار ہی تھا کہ فلاں ولد فلاں حکومت کا باغی ہے، کسی کو خبر لگے تو مقامی تھانے میں اطلاع کرے۔ اول کسی کو خبر تھی اور کسی کو نہ تھی اور جن کو تھی وہ آزاد کو کیسے

پہچانتے کہ تب نہ شناختی کارڈ کا جھنجھٹ تھا، نہ اشتہار پر تصویر عکسی کا رواج تھا۔ اپنے شہر اور اُس کے گرد و نواح میں پہچانے جانے کا خوف تھا۔ پرائے دیس صورت سے کون واقف تھا ،اس لیے زندگی کی بچت تھی۔ آزاد بزرگوں کی تاریخ سے سُنتے آئے تھے اور دیکھتے آئے تھے کہ جو دہلی سے نکلتا تھا، پورب کی اور بھاگتا تھا اور گوہر زر و آسائش پاتا تھا۔ میر گئے، سودا گئے، میر حسن گئے، خلیق گئے، انشا گئے اور کیا کیا اُنھوں نے وہاں توقیر اور عزت نہ پائی، مگر ہائے اب وہ لکھنؤ بھی تو نہ رہا تھا۔ واجد علی شاہ کلکتہ مٹیا برج میں بند پڑے تھے، اور لکھنؤ توپوں کے دہانوں پر پڑا تھا۔ کوئی دن تھا کہ یہاں بھی باغ جنت خاک اور خاک سے راکھ ہو کر اُڑنے کی ہوا چلنا تھی۔ آزاد کی شکل و صورت سے کوئی واقف نہ تھا۔ ایک نام تھا جو وہ بدل بھی سکتے تھے۔ سو وہیں چل دیے۔

دہلی کے مشرق کی طرف قلعے کے پچھواڑے سفیدوں کی پہاڑی تھی۔ اس پہاڑی کے دامن میں دریا پر کشتی پل تھا۔ آزاد نے دریا کو کشتی پُل کے ذریعے پار کیا اور جمنا کے اُس طرف اُتر گئے۔ یہ علاقہ تب ایک کھلا جنگل تھا اور کوئی نشان آبادی کا یہاں نہیں تھا۔ اِدھر آزاد کے پاس نہ سفر کا سامان تھا، نہ مونس غمخوار ساتھی تھا اور نہ سواری کو جانور تھا۔ دہلی کے بالکل مشرق میں بیس میل پر غازی آباد کا قصبہ پڑتا تھا۔ یہ قصبہ خاص غازی الدین حیدر کی خیمہ گاہ ہوا کرتا تھا، جب وہ شکار کے لیے نکلتے تھے۔ محمد حسین آزاد نے یہاں سے سیدھا جنوب کی طرف سفر شروع کیا اور منزلیں مارتے علی گڑھ کی طرف چل نکلے۔ علی گڑھ تب ایک بہت چھوٹا شہر ہوا کرتا تھا اور اُس وقت جنگ یا غدر سے بچ رہا تھا۔ ابھی سر سید کے کالج کا کھکھیڑ بھی نہ پڑا تھا۔ آزاد میاں علی گڑھ سے بھون گاؤں، قنوج، بنگر ماؤ اور جگدیش پور سے ہوتے ہوئے دسمبر کے پہلے عشرے میں لکھنؤ پہنچ گئے۔

آپ یہاں کچھ لمحے ٹھہر جائیں تا کہ بتا دوں یہ لکھنؤ کیا تھا؟

ماضی کے اندھیروں میں ڈوبے لکھنؤ کو دیکھنے کے لیے ہمیں تصور کی آنکھ کھولنا پڑے

گی۔ یہ لکھن جی وہی ہے جہاں سے غنیم کی فوجیں خاک اڑاتی ہوئی بارہا گزری ہیں۔ اس دھرتی کا کشادہ سینہ گھوڑوں کے ٹاپوں اور لاکھوں پیدل چلنے والوں کے قدموں کی دھمک کو اپنے اندر جذب کر چکا ہے۔ تاریخ کے اوراق جب بھی اس کے اوپر پھڑ پھڑاتے ہیں تو وہ اپنے سارے راز اگل دیتا ہے۔ لکھنؤ کی سرزمین کو سیاہ زمانہ بار ہا روندتی ہوئی گزر گئیں۔ دریائے گھومتی کے دونوں کناروں پر بسا ہوا یہ خرابہ کتنا خوش نصیب تھا کہ اس کی زرخیزی، آب وہوا اور تیرائیوں میں سینکڑوں قوم قبیلوں نے پڑاؤ ڈالا، اور ارض لکھنؤ کو سینے سے لگا لیا۔ لکھنؤ اور کان پور کی کھدائی کے دوران نیچے سے پکی اور روغنی مٹی کے ایسے برتنوں کے ٹکڑے ملے ہیں جو موہنجوداڑو اور ہڑپہ سے مشابہ تھے۔ نواب آصف الدولہ نے فیض آباد چھوڑ کر اسی کو اپنا دارالحکومت بنا لیا تھا اور یہ تب ہی سے اودھ اور پھر بعد میں اتر پردیش کا مرکز مقام بنا رہا ہے لیکن ذرا روایات کی وہ سرگوشیاں بھی سن لی جائیں جن سے فتوحات، شکستوں اور متغیر ہونے والی تہذیبوں کی حیران کر دینے والی تصویریں آنکھوں میں تیر جاتی ہیں۔

یہاں اول زمانوں میں سورج ونشی راجپوت حکمران تھے اور خود کو سورج دیوتا کی اولاد مانتے تھے۔ یہ وہی آریہ اقوام کے لوگ تھے جو چار ہزار سال پہلے وسط ایشیا سے اٹھ کر قطب شمالی کے یورپی علاقوں اور ایران (فارس) وافغانستان اور شمالی ہندوستان کے وسیع وعریض مرغزاروں میں ہجرت کر گئے تھے۔ بارہ سو سال قبل مسیح اودھ کے اس علاقے کا نام کوشلا تھا اور اسی نام کی ایک قوم بھی یہاں آباد تھی۔ ہندوؤں کے قدیم شاستر بتاتے ہیں، یہاں منو نے سب سے پہلے اس علاقے کو بسایا تھا۔ اس زمانے میں اجودھیا ہی کوشلا کی راجدھانی تھی اور کوشلا اودھ کو کہتے ہیں اور اودھ ہی لکھن یا لکھنؤ ہے۔ اور یہ اجودھیا سرجو گھاگھرہ دریا کہلاتا ہے، کے کنارے پر آباد تھا۔ اس علاقے پر راجہ دشرتھ کی حکومت تھی اور وہ سورج ونشی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔ رمائن کے ہیرو رام اسی راجہ دشرتھ کے بیٹے تھے۔ تاریخ دان مرزا علی اظہر برلاس اپنے تاریخی شہ پارے میں اودھ کی اس زمانے کی تہذیب وتمدن کا ذکر کرتے

ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

رمائن میں لکھنؤ کے بارے میں ایک اعلیٰ ترقی یافتہ معاشرہ کا بیان ہے۔ اس وقت کے لوگ زیادہ تر زراعت میں مشغول تھے لیکن ایک ترقی پذیر تاجر طبقہ بھی وجود میں آ رہا تھا۔ اجودھیا کے آباد شہر کی ایک نہایت دلچسپ بات تاجروں کے مختلف طبقوں کے ذکر میں ہمارے سامنے آتی ہے جنہوں نے رام کی اس طویل جلاوطنی سے دارالحکومت میں فتح مندانہ واپسی پر خیر مقدم کیا۔ راج کنور رام کا خیر مقدم دوسرے لوگوں کے علاوہ بڑے تاجروں، جواہر تراشوں، نداقوں، اسلحہ سازوں، آرائشوں، شیشہ گروں، نجاروں، طبیبوں، چراغ سازوں، مے فروشوں، دھوبیوں، درزیوں، اداکاروں اور سر کی مالش کرنے والوں تک نے کیا۔ اداکاروں اور سر کی مالش کرنے والوں کی موجودگی ظاہر کرتی ہے کہ یہ معاشرہ بلاشبہ اعلیٰ درجہ کا ترقی یافتہ تھا۔

شری رام چندر جی نے بن باس بھگتنے کے بعد لکھنؤ کو اپنے بھائی لچھمن کے سپرد کر دیا تھا۔ لچھمن جی نے گومتی کے بہتے پانیوں کے کنارے ایک ٹیلے کو قیام فرمایا تھا۔ جب سے اس مقام کو لچھمن ٹیلہ کہتے ہیں۔ لچھمن ٹیلہ کے پاس ایک گاؤں آباد تھا۔ اس گاؤں کا نام لچھمن پور یا لکھن پور تھا اور اس میں برہمنوں کی آبادی تھی۔ اسی گاؤں کے نام پر اس شہر کا نام بھی لچھمن پور ہو گیا ہو۔ مرزا علی اظہر برلاس نے اس بات کو یوں کہا ہے۔

امام باڑہ آصف الدولہ کے شمال میں لب دریا جس ٹیلے پر عالمگیری مسجد ہے اور جس کو عام طور پر آج کل ٹیلے والی مسجد یا شاہ پیر محمد صاحب کا ٹیلہ کہتے ہیں، اس کا نام پہلے پہل لچھمن ٹیلہ تھا اور کہا جاتا ہے کہ یہاں لچھمن پور آباد تھا۔ یہاں پر پہلے راجپوتوں کی آبادی تھی۔ تب ایک زمانہ ایسا آیا کہ شیخ خاندان جو مسعود غازی کے ساتھ آئے تھے، اُنہوں نے لکھنؤ پر قبضہ کر لیا پھر وہی حکمرانی کرتے رہے۔ انہوں نے قلعہ بھی تعمیر کرایا۔ اس قلعہ کی تعمیر لکھنا اہیر کے سپرد تھی اس سبب سے لچھمن پور بگڑ کر لکھن ہو گیا۔ ہمایوں بادشاہ شیر شاہ سے

جنگ کے بعد کچھ دیر کے لیے لکھنؤ ٹھہرا اور یہاں اس کو روپیہ اور گھوڑوں کی مدد دی گئی۔

نواب برہان الملک، سلطنت اودھ کے بانی، اصل نام سید محمد امین، وطن نیشاپور کے تھے۔ خاندانی سلسلہ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام سے ملتا ہے۔

نواب آصف الدولہ نے وارث سلطنت ہو کر اپنا دربار لکھنؤ منتقل کر دیا جس کے سبب سے شرفا، تجار، علما و فضلا، صناع اور دیگر اہل کمال و فن، فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ چلے آئے۔ جس سے فیض آباد کی عظمت کو گہن لگنے لگا اور لکھنؤ کے تمدن کو عروج ہوا۔ مرزا مقیم ابوالمنصور بہادر صفدر جنگ جلال الدین حیدر نواب شجاع الدولہ بہادر کا دور آیا۔ مرزا امانی نواب آصف الدولہ بہادر کی بہار آئی، تب تو یہ بات شہرت میں آئی، جس کو نہ دے مولا، اُس کو دے آصف الدولہ۔ یمین الدولہ نواب سعادت علی خان کی نوبت بجی، نواب غازی الدین حیدر، نصیر الدین حیدر شاہ، فریدون بخت رفیع الدین محمد مہدی عرف مُنا جان، محمد علی شاہ، امجد علی شاہ، واجد علی شاہ عرف جان عالم (متخلص اختر، پیا) اودھ و لکھنؤ پر حکمرانی میں نام پا گئے اور ہزاروں علم و فن کے دیوتاوں کے سر پر تاج ہما کا پھریرا لہرا گئے۔ واجد علی شاہ لکھنؤ کے آخری تاجدار تھے۔ اُن کے نام کے ساتھ، رقص و سرود اور اندر سبھاوں کی سنگتیں آباد تھیں۔ پھر انگریز آئے اور لکھنؤ کی اینٹ بج گئی۔ اُنہوں نے رونق شہر کو ویران کر دیا۔ باغ اجاڑ دیے اور کوٹھیاں اور چبوترے بھری عمارتیں برباد ہو گئیں۔

اکبر کے عہد میں شیخ عبدالرحیم جونپوری نے جو اودھ کا صوبہ دار تھا، یہاں کی عمارتوں میں ردوبدل کرا کے اپنی پانچ بیویوں کے لیے پنچ محل تعمیر کرایا تھا، یہ محل بعد ایک زمانے کے صفدر جنگ کے عہد میں مچھی بھون کے نام سے موسوم ہوا۔ شہزادہ سلیم نے مرزا منڈی باغ کی بنیاد رکھی۔ اودھ کے صوبہ دار جوہر خان کے نائب قاسم محمود بلگرامی نے محمود نگر اور شاہ گنج محلے بسائے اور چوک چوراہوں کی کربلائیں آباد کیں۔ لکھنؤ کے کشادہ چوک کی داہنی طرف اکبری دروازہ بنوایا اور اُس کا اتنا بڑا نوکی دروازہ کھلوایا کہ اوپر تلے تین ہاتھی گزار لو۔

شاہجہان کے عہد میں اودھ کے صوبہ دار سلطان علی شاہ کے بیٹوں نے چوک کے مغرب میں فاضل نگر اور منصور نگر محلے آباد کیے۔ جب اورنگ زیب اجودھیا سے ہوتا ہوا لکھنؤ آیا۔ اُس نے یہاں چند دن قیام فرمایا اور اُسی ٹیلے کو اپنی سرائے بنایا جہاں کبھی لچھمن رُکا تھا۔ یہ بادشاہ مسجدیں بہت بنواتا تھا اور بھائیوں کے خون کا صدقہ دے کر اُن کے ماتھے پر لگاتا تھا۔ اُس نے لچھمن ٹیلہ پر ایک شاندار مسجد تعمیر کرائی جو ٹیلے والی مسجد کے نام سے اب بھی مشہور ہے۔ اورنگ زیب اپنے لقب عالمگیر کو کام میں لایا اور اُسی رعایت سے لکھنؤ میں ایک محلّہ اضافہ فرما کر اُس کا نام عالم نگر لکھایا۔ اس طرح اس شہر میں تاریخ کے ہر موڑ پر نئے محلوں، نئی عمارتوں کا اضافہ ہوتا گیا۔ نواب آصف الدولہ بہادر کا دور آیا تو اُس نے امام باڑہ، دولت کدہ، ریزیڈنسی اور عیش باغ کی عمارتیں بنوائیں۔ بی بی پور اور چھت کی بے مثال کوٹھیاں بسائیں۔ شاہ زمن غازی الدین حیدر نے دو محلے حیدر آباد اور بادشاہ نگر آباد کیے۔ ان کے سوا مقبرہ سعادت علی خان، مبارک منزل، شاہ منزل، چھتر منزل، ولایتی باغ اور نجف اشرف کی تعمیریں اُٹھائیں۔ ایک نہر گومتی کے پانیوں سے نکال کر شہر میں بہائی۔ اس نہر کا نام غازی الدین حیدر نہر رکھا۔

روایت سینہ بہ سینہ اور کتب در کتب بیان میں آئی ہے کہ جیٹھ ہاڑ کے موسموں میں ہندوؤں کو گنگا اشنان کے لیے کان پور جانا پڑتا تھا۔ غازی الدین حیدر نے چاہا کہ گنگا کے متبرک پانی کو ایک نہر کی صورت میں کان پور سے لکھنؤ تک لایا جائے جو دریائے گھومتی سے بھی مل جائے۔ نصیر الدین حیدر بادشاہ نے تلسی داس، ارگ میں شفاخانہ بنایا اور شیش گنج اور چاند گنج نام کے دو محلوں کو بسایا۔

یہ سب کارخانے قدرت کے ہاتھوں کہیں مٹ گئے، کہیں بوسیدہ ہو گئے اور کہیں آج بھی آباد تھے۔ آزاد نے چونکہ سب رستہ پیدل طے کیا تھا۔ پاؤں لہو سے نہائے ہوئے تھے اور ٹانگیں سوج کر پتھرا گئیں تھیں۔ جسم پر فقیروں کا سا چھدا ہوا لباس، سر پر میلی چکٹ اور پھٹی

پرانی دو پلی ٹوپی اور بغل میں مٹھی بھر سامان کی گٹھڑی تھی۔ پاوں میں جوتے نہ تھے، جوتے چھلنی ہو کر کہیں راہ میں ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ حالت ایسی دیکھ کر کبھی نہ کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ مولوی محمد باقر کے فرزند ہیں، وہی مولوی محمد باقر، جس کی دہلی اور دہلی کے مضافات میں لاکھوں کی جائداد تھی اور اُن کے نام کا طوطی بولتا تھا۔ الغرض آزاد کی حالت تمام پاگلوں کی سی ہوگئی تھی۔ شہر کے قریب پہنچ کر آزاد کی نظر جب لکھنو کے گنبد و مینار پر پڑی تو آنسوؤں کی دو نہریں رواں ہوگئیں، اِس پانی سے آزاد اپنا چہرہ دھوتا ہوا آگے شہر کی سمت چلتا رہا۔ آزاد کے نام سے سب واقف تھے، کیونکہ دہلی اردو اخبار کی ادارت نے آزاد کی حیثیت پورے ہندوستان کی پڑھی لکھی اشرافیہ تک پہنچادی تھی مگر آج یہاں شناسائی کا زمانہ نہ تھا۔ سردُتوں کے دن تھے۔ لکھنؤ کا مزاج دہلی سے بہت مختلف اور پُر خروش تھا۔ یہاں کا دولھا یعنی واجد علی شاہ اگر چہ شہر بدر تھا مگر لکھنؤ کے بانکے ابھی وہاں موجود تھے۔ مجلس اور ماتم داری کے کارخانوں کا وجود تھا۔ لڑکے بالے کنکوے اڑا رہے تھے، بازاروں میں دکانوں کے تھال لگے تھے۔ انواع شیا کے انبار لگے تھے۔ چہل پہل کے قافلے رواں تھے اور لکھنؤ کے دن جواں تھے، محمد حسین جانتے تھے، یہ وہی لکھنؤ ہے جہاں سودا آئے، ضاحک آئے، میر تقی میر آئے، میر حسن آئے، انشا آئے، مصحفی آئے، سب مسافرانہ آئے اور لکھنؤ نے انھیں بانہوں میں بھرلیا، ماں کی طرح دودھ کے پستانوں سے پالا، پھولوں کی سیجوں پر بٹھایا اور نواب صاحب نے اپنے شاہی ہاتھوں سے پیچوان میر کی طرف بڑھایا۔ مگر اب وہ نواب کہاں جو اِس مسافر کی قدر اُٹھائے، اور اِس مصیبت زدہ کا بار اپنے شانوں پر پائے۔ آزاد لکھنؤ پہنچ کر بڑے امام باڑے کی سرائے میں رُکے۔ یہ امام باڑہ آصف الدولہ نے بہت پیسے خرچ کر کے بنوایا تھا اور اِس میں سرائیں بہت تھیں کہ جو مسافر آئے امام کی سرائے میں بار اُتارے۔ تب تو خرچ رہنے بسنے کا بھی سرکار سے ادا ہوتا تھا مگر اب تو وہ سرکار ہی نہ رہی تھی۔ اِدھر آزاد کا حال بہت کچھ فقیروں کا سا ہو گیا تھا، داڑھی بہت بڑھی ہوئی، جسم میں میل

بچیل پھنسی ہوئی اور کپڑے ایسے پھٹے کہ چیتھڑے اُڑے جاتے تھے، کہیں سے اشراف نہ لگتے تھے۔ آغا باقر لکھتے ہیں:

"آزاد کی جیب میں پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ جگہ جگہ مسجدوں اور سراؤں میں ٹھہرتے، محنت مزدوری کرتے، آخر چلتے چلتے لکھنؤ جا پہنچے۔ لکھنؤ میں اکثر لوگ واقف تھے اور مدت سے آزاد کو لکھنؤ میں دیکھنے کی تمنا تھی، سو اِن حالات میں پوری ہوئی۔ قریباً چھ ماہ تک لکھنؤ میں رہے۔ یہ وہ دور تھا جب وہ انیس، دبیر کی مجلسوں میں شامل ہوئے۔ انیس کی مجلس کی باریابی کا شرف پایا اور دبیر کا دیدار اٹھایا۔ مولانا آزاد نے اپنی کتاب آبِ حیات میں جو کچھ لکھنؤ میں شاعروں کے متعلق لکھا ہے اور جن جن سے ملاقات کا واقعہ رقم کیا ہے، اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تباہ کُن مصیبت کے باوجود بھی کس قدر علم دوست اور ادب پرور اور شعر و فکر کے دل دادگان میں سے تھے۔ یہیں اُنھیں میر تقی میر کے بیٹے سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا تھا اور سودا کے پوتے سے بھی ملاقات کا شرف ہوا۔"

میاں آزاد لکھنؤ کے کوچے گھومتے تھے، اگلوں کو یاد کرتے تھے اور روتے تھے۔ اُن کا پُرسانِ حال یہاں کوئی نہ تھا، نہ کسی کو بتا سکتے تھے کہ وہ کون ہیں اور کس کوچے سے آئے ہیں۔ میر صاحب ایک بار لکھنؤ گئے تو اُنھوں نے جو کہا تھا

خرابہ دلی کا وہ چند بہتر لکھنؤ سے تھا

اس تعارف میں سب نے جان لیا تھا کہ وہ میر صاحب ہیں مگر یہاں تو یہ صورت بھی میسر نہ تھی۔ فرنگیوں کے مخبر کوچوں بازاروں میں سُراغ لگاتے پھرتے تھے۔ لکھنؤ میں بڑے امام باڑے کے قُرب میں ایک محلہ امام آباد ناظم صاحب تھا۔ آج بھی موجود ہے۔ یہاں مسجد شرف النسا کے قریب ہی، جہاں آج کل ٹنڈے کبابی کی دکان ہے، اس کے عین پچھواڑے ایک نقاش رہا کرتے تھے اور کاغذ پر مینا کاری کا کام بھی عمدہ کرتے تھے ان کا نام

سید رضا بخش تھا اور یہ میاں آزاد کے دوست دلی تھی۔ دہلی اردو اخبار کے اکثر اوراق کی نقاشی بھی کرتے تھے اور خیر خواہ بہت تھے۔ آزاد سرائے سے نکلتے اور اکثر اُس کے ہاں چلے جاتے تھے، پہروں بیٹھتے اور باتیں کرتے تھے۔ رضا بخش شاعری بھی کرتے تھے اور وہ میر کلوعرش کے شاگرد تھے، یہ وہی میر کلوعرش تھے جو میر تقی میر کے بیٹے تھے۔ ایک دن رضا بخش آزاد سے کہنے لگے، حضور چلیے آج عیش باغ میں ایک مجلس ہے، جہاں حضرت کلوعرش خلفِ میر سلام پڑھیں گے۔ آزاد اور رضا بخش سہ پہر کے عالم میں عیش باغ کی طرف چل دیے۔ راستے میں چلتے ہوئے ذرا کسی ڈیوڑھی میں نظر پڑتی تو طبلے کی تھاپ پر ٹھمری کے بول سُننے میں ملتے، کہیں، بیڑیوں کے پیچے تھے۔ کسی گلی کی نکڑ پر نیم کے سائے میں بانکے بیٹھے مونچھوں کی نوکیں اُبھار رہے تھے۔ اِدھر آزاد میاں اور رضا بخش چلے جا رہے تھے۔ علی دلاور تقی کے ہاں مجلس تھی۔ بہت بڑا گھر تھا، مکان کے چاروں طرف اور صحن کے پچھلے کناروں تک دالان در دالان تھے۔ کھڑکیاں اور ڈانیں چبوترے تک ایک ہی طرز سے اُٹھیں تھیں۔ اُن کے اندر مخملیں پردے لہراتے تھے۔ کھڑکیوں کے شیشے اکثر سات رنگوں سے بھڑکتے تھے۔ مکان میں سفید قلعی جھلکتی تھی۔ جیسے دیواروں اور چھتوں سے دودھ بہہ رہا ہو۔ صحن میں گول حوض لہریں مارتا تھا۔ حوض کے اندر گلاب اور چراغ آگ بہار رہے تھے۔ دروازے کے باہر دو نیم کے بوڑھے پیڑ ایسے کھڑے تھے جیسے صدیوں کا جھمیلا جھیلے بیٹھے ہوں۔ اُن کی شاخیں اور تنے بارشوں سے اور موسموں کی بوسیدگی سے سیاہی مائل ہو گئے تھے۔ پُرانی شاخیں پورے مکان کو گھیرے ہوئے تھیں۔ آزاد پردیسی تھے اور مسافر کو کون پہچانتا تھا۔ پچھلی صف میں بیٹھ گئے۔ چاندنی بچھی تھی۔ عرق گلاب کے کیوڑے مہکتے تھے۔ اگر بتیاں سُلگتی تھیں، وہاں بہت لوگوں کا ہجوم تھا۔ مجلس میں پہلے سوز خوانی ہوئی، اُس کے بعد کچھ لوگوں نے سلام پڑھے۔ آخر میں میر کلو نے سلام پڑھا اور بین کے دو بند پڑھ کر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ مجلس کے بعد نیاز تقسیم ہوئی۔ آزاد نے دیکھا میر کلو نے دو لقمے لیے اور

بیٹھ گئے۔ نیاز کے بعد تمام لوگ اُٹھے اور چلنے کو تیار ہوئے۔ تب رضا بخش نے آگے ہو کر آزاد کا تعارف میر کلو سے کرا دیا۔ آزاد نے سلام کیا اور نیاز مندی سے دو زانو بیٹھ گئے۔ اتنے میں علی ولا اور تقی بھی وہیں آ بیٹھے۔ دونوں سے آزاد کا تعارف ہوا۔ علی ولا اور تقی آزاد کا نام سنتے ہی پہچان گیا۔ آزاد کو مکرر گلے لگایا۔ میر کلو عرش نے پورا لباس کوئی دو تھان کپڑے سے لپیٹ رکھا تھا۔ سر پر دو پلی ٹوپی تھی۔ ایک کمر بند تھا، ہاتھ میں ریشمی جریب تھی اور کُرتے کا گھیر دریا کو لپیٹتا تھا۔ میاں آزاد نے جو لباس میر تقی میر کا آبِ حیات میں بیان کیا ہے بجھ لو، وہی لباس میر کلو عرش کا تھا۔ آزاد نے یہاں میر کلو سے بہت اشتیاق کے ساتھ میر تقی میر کی بابت کچھ باتیں کیں اور خدائے سخن سے گویا اُن کے بیٹے کی نسبت سے ہم سخنی کا شرف حاصل کیا۔

آبِ حیات میں خود ایک جگہ لکھتے ہیں۔

میر صاحب کے بیٹے لکھنؤ میں ملے تھے، باپ کے برابر نہ تھے مگر بد نصیبی میں فرزند خلف تھے۔ ایک پیر مرد بے پروا مستغنی المزاج تھے۔ میر عسکری نام، میر کلو مشہور تھے۔ عرش تخلص تھا، خود شاعر صاحب دیوان تھے اور چند شاگرد بھی تھے۔ ایک شعر اُن کی غزل مشاعرہ کا زبان زد خاص و عام تھا۔

آسیا کہتی ہے ہر صبح بہ آوازِ بلند
رزق سے بھرتا ہے رزاق دہن پتھر کا

غرض بہت دیر تک میر کلو وہاں بیٹھے رہے اور باتیں چلا کیں۔ آخر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آزاد کو گلے لگایا اور رضا بخش سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، بھئی میاں آزاد کو لیے ہوئے ہمارے مکان پر تشریف لاؤ۔ یہ کہہ کر چل دیے۔ علی ولا اور تقی انھیں پالکی تک لے گئے۔ دوسرے دن آزاد سویرے ہی رضا بخش کے ہاں پہنچ گئے کہ چلیے خلفِ میر کی مکرر زیارت ہو جائے۔ رضا بخش نے جو کچھ کام نپٹانا تھا، نپٹایا، اُس کے کام کے دوران آزاد

اپنے کچھ مسودے پر تالتے رہے جنھیں وہ دہلی سے ساتھ لائے تھے۔ سہ پہر کے عالم میں یہ دونوں نکلے اور میر کلو کے ہاں پہنچ گئے۔ میر کلو ایک پرانے اور بوسیدہ مکان میں رہتے تھے۔ مکان زیادہ چھوٹا تو نہ تھا مگر بڑا بھی نہ تھا۔ نقشہ مکان کا محمد شاہی دَور کے شرفا کے مکانوں کا تھا۔ ایک کٹرے میں دائیں ہاتھ چلنے کے بڑا سا دروازہ تھا جس کے دونوں طرف دو چوکیاں پتھروں کی بنی ہوئی تھی۔ دروازے کی ڈاٹیں ساٹھ اور اُسی کے زاویوں سے مُڑتی تھیں۔ دونوں طرف کے دائیں بائیں والی دیواروں میں چار ایک طرف اور چار دوسری طرف کھڑکیاں کھلتی تھیں۔ مگر امتدادِ زمانہ سے اُن کے چوکھٹے برباد ہو گئے تھے۔ فقط نوے درجے کی نوکی ڈاٹیں بچ گئی تھیں۔ ڈاٹوں کے اوپر اینٹیں تراش کر موروں کی شکلیں بنائی ہوئی تھیں۔ جیسے ہی یہ دونوں اندر داخل ہوئے سامنے ڈیوڑھی تھی۔ ڈیوڑھی دائیں بائیں سے ایک ہی طرح کے دالان لیے ہوئے تھی۔ روشن دان کھلے تھے اُن سے ہوا اور روشنی برابر اندر آ رہی تھی۔ ڈیوڑھی میں چارپائی دھری تھی۔ چارپائی کا بان خالص مُنج کا تھا۔ پایوں کا رنگ اُتر چکا تھا۔ ایک پیچوان چارپائی کے ساتھ دھرا ہوا تھا۔ چلم کی آگ آدھی راکھ ہو گئی تھی۔ یہیں میاں کلو عرش بیٹھے ایک غزل بنا رہے تھے۔ قریب ہی ایک شاگرد بیس بائیس برس کا بانکا بیٹھا تھا۔ اُس کے سر پر دوپلی ٹوپی تھی مگر کلو عرش ننگے سر بیٹھے تھے۔ حقہ پیتے جاتے تھے اور غزل کے مصرعے گنگنا کر بنائے جاتے تھے۔ قلاقند کا کوزہ پاس رکھا تھا، غالبًا یہی لڑکا لے کر آیا تھا۔ میر کلو اُسی کی غزل دیکھ رہے تھے۔ ہمارے جاتے ہی آگے کو جھکے، یا علی کہہ کر سلام لیا اور بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ڈیوڑھی کے آگے ایک باریک پردہ لٹک رہا تھا، اُس کے آگے مکان کا صحن تھا اور صحن کے اردگرد کمرے بنے تھے۔ ڈیوڑھی میں چار پانچ موڑھے بھی دھرے پڑے تھے۔ میر کلو عرش نے پُرتپاکی سے دونوں کا استقبال کیا۔ میاں آزاد اور رضا بخش موڑھوں پر بیٹھ گئے۔ مکان کی حالت اور خود میر صاحب کی حالت بہت اچھی نہ تھی۔ ایک قناعت پسند بوڑھے کی طرح بسر ہو رہی تھی۔ میر کلو کے ہاں کوئی ملازم بھی نہ تھا۔

دونوں کو موڑھوں پر بٹھا کر خود اندر زنانے میں گئے۔ اور تھوڑی دیر بعد ایک کٹورا شربت اور دودھ جلیبیاں لیے برآمد ہوئے۔ تواضع کیے جاتے تھے اور زمانے کی باتیں کرتے تھے۔ باپ کی بہت ساری باتیں اُنھوں نے کیں۔ میر صاحب کے متعلق اکثر بات ہوتی رہی۔ میر گلو نے بتایا، جب میر صاحب کا زمانہ تھا لکھنؤ وضع داری کا آئنہ تھا۔ اپنے باپ میر صاحب کے آگے میری کچھ چلتی نہ تھی۔ وہ اپنے اور پرائے کے ساتھ ایک سی بے اعتنائی کا حساب رکھتے تھے۔ جو کچھ پیسا روپیہ ملتا تھا اُسے کبھی نہ گنا کرتے تھے نہ اُس میں سے خود کچھ خرچ کیا کرتے تھے۔ روپے کی تھیلی جو دربار سے ملتی تھی وہ یونہی بے توجہی سے اِدھر اُدھر رکھ کر بھول جاتے اور پھر اُنھیں جو کوئی بھی خرچ کرے اُن کی بلا سے۔ پڑوسیوں اور احباب کا غم دیکھ نہ سکتے تھے۔ میری والدہ کو اکثر کہا کرتے گلو کی اماں دیکھ گھر میں کوئی پیسا ہے تو فلاں کو کچھ بھجوا دینا۔ اُدھر میری اماں اُن سے بھی زیادہ بے پروا تھیں، سب کچھ دس دن میں بانٹ کر سانس لیتی۔ وظیفہ ماہ بہ ماہ ملتا تھا اور خرچ عشرہ بہ عشرہ ہوتا تھا۔ آخری عمر میں اُنھیں ہلکا سا رعشہ ہو گیا تھا۔ مگر شعر کہنے سے مرتے دم تک نہ رُکے تھے۔ ہاں تب فارسی میں کہنا چھوڑ دیا تھا۔ کلام اُن کا بہت تھا مگر کئی غزلیں وہ کہہ کر اپنے سینے میں لیے چلے گئے کاغذ پر نہ لکھیں۔ بہت کم بولتے تھے اور کسی کے شعر پر اصلاح دینا تو درکنار اُسے سُننا تک گوارہ نہ تھا۔ ہاں لکھے ہوئے اشعار پڑھ لیتے تھے۔ بلکہ مجھے کہتے پڑھ کے سناؤ تو مَیں پڑھ دیتا۔ اپنے شعر بھی کسی کو نہ سناتے۔ مشاعروں میں بالکل جانا چھوڑ دیا تھا۔ لوگ ایک جھلک دیکھنے کے واسطے دہلیز پر آتے تھے اور چلے جاتے تھے۔ کبھی جو بہت اصرار کر کے کسی نواب کے ہاں گئے بھی تو خود اپنے شعر نہ سنائے۔ بہت اصرار ہوتا تو پاس بیٹھے کسی شخص سے کہہ دیتے، لیجیے میاں، اِنھیں ہماری فلاں غزل سنا دو۔ لوگوں کو میر صاحب کا کلام آیات کی طرح حفظ تھا۔ غرض میر گلو نے بہت باتیں میر صاحب کی بتائیں اور شام تک یہ وہیں رہے۔ اُس کے بعد تو آزاد کا وہاں روز جانا ہوتا تھا۔

مجلس کی شب علی دلاور تقی نے جیسے ہی آزاد کا حال سُنا تھا کہ اِن دنوں بے حال ہیں ،انہیں سرائے سے اُٹھا کر دہیں اپنے مکان میں رہنے کو جگہ دے دی تھی۔تب لکھنؤ کے قیام میں آزاد نے اگلے پانچ ماہ علی دلاور تقی کے ہاں ہی قیام کیا۔اور آرام کو تکیہ بنایا۔اِسی قیام کے دوران محمد حسین آزاد گومتی کے مضافات میں پھرے۔شہر کی گلیوں، بازاروں اور چوکوں میں بنجارے کی طرح بھٹکے۔اور جو مشاہیر اردو کے نابغوں میں موجود تھے اُن کے در پر حاضری دی، جو نہیں تھے اُن کی اولادوں تک پہنچے اوراُن کی قبور کو سلام کیا۔اُن کے مسکنوں کو سلام کیا۔زمانے کے بدلے ہوئے حالات پر آنسو بہائے

اِسی آب حیات میں سودا کے باب میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

اُن کے بعد (سودا) کمال بھی خاندان سے نیست و نابود ہو گیا۔راقم آثم ۱۸۵۸ میں لکھنؤ گیا۔بڑی تلاش کے بعد ایک شخص ملے کہ اُن کے نواسے کہلاتے تھے۔بے چارے پڑھے لکھے بھی نہ تھے اور نہایت آشفتہ حال تھے۔

میراث پدر خواہی علم پدر آموز
بندہ عشق شدی ترک نسب کن جامی

کاندریں راہ فلاں ابنِ فلاں چیز نیست

غرض لکھنؤ میں باوجود اپنی تباہ حالی اور غربت و دل گیری کے آزاد مرحوم نے اپنی آنکھوں دیکھے کے واقعات یہاں اُنھوں نے گاہ گاہ کئی ایک درج کیے ہیں اور زمانے کے تغیر کے نوحے کہے ہیں۔ یہ فرصت آزاد کو مشکل سے چھ ماہ میسر آئی۔ تین ماہ ۱۸۵۷ کے اور تین ماہ ۱۸۵۸ کے یہیں رہے اور اِن میں اتنا کچھ اُنھوں نے دیکھا اور سُنا کہ جن سے صدیوں کے مضمون بندھ سکتے تھے اور وہ اُنھوں نے باندھے۔ ہماری بہت کوشش کے باوجود ہمیں بس اتنا معلوم ہو سکا کہ اُن دنوں جب محمد حسین آزاد لکھنؤ میں غربت کے دن کاٹ رہے تھے، پہلے بڑے امام باڑے کی سرائے میں آ کر ٹھہرے، پھر وہاں سے جھیم کے اکھاڑے کے نزدیک حسین اللہ بخش کی سرائے تھی، قدرے سستی اور محفوظ جگہ تھی، وہاں آن ٹھہرے تھے۔ اُن کے وہاں قیام کے متعلق اِتنا معلوم ہو سکا ہے کہ صبح اپنی گدڑی اُٹھا کر شہر کی گلیوں میں نکل جاتے تھے۔ اُس کے بعد جب میر عسکری عرف میر کلو پسر میر تقی میر سے ملاقات ہوئی تو علی دلاور تقی کے ہاں اُٹھ آئے۔ یہاں وہ صبح نکل جاتے تھے، اُجڑے دیاروں کی نشانیاں ناپتے تھے اور رات گئے آ کر پڑ رہتے تھے۔ اِسی عالم میں کہیں کچھ مزدوری مل گئی تو وہ کر لی، کہیں نیاز مل گئی تو وہ کھا لی اور گزران کی گھڑی نکالی۔ خاص اُنھیں سودا اور میر سے جو ربط تھا اُسی کی بنا پر میر صاحب کے مکان کا سراغ نکالا، جس کے ایک

حصے میں باغ تھا اور ایک میں امام باڑہ تھا۔ تب تک یہ باغ اُجڑ چکا تھا اور حویلی کھنڈر کا نقشہ تھی، اِسے آزاد میاں نے سرائے عبرت کا نام دیا ہے۔ آب حیات میں آزاد نے میر صاحب کو آصف الدولہ کی طرف سے دیے گئے جس مکان کا نقشہ پیش کیا ہے، اُس میں ایک بند کھڑکی کا ذکر ہے کہ اُس کا رُخ صحن کے باغ کی طرف تھا مگر میر صاحب نے وہ کھڑکی کبھی کھولی ہی نہ تھی۔ آزاد کا یہ باغ اور مکان دیکھا ہوا ہے اور اغلب ہے کہ آزاد نے اُسے دیکھ کر اپنے تخیل کو مہمیز کر کے اسی بندوبست میں چلے گئے ہوں، جب میر صاحب وہاں رہتے تھے۔

اسی طرح ایک بار وہ میر انیس کے ہاں بھی گئے تھے۔ کہتے ہیں:

> "میں ۱۸۵۷ میں خود اُن سے ملا، اور لوگوں سے سُنا، کم سخن تھے اور بولتے تو وہ فقرہ کہ موتی کی طرح ٹانکنے کے قابل۔ ارسطو جاہ مولوی رجب علی خان بہادر حسب الطلب چیف کمشنر لکھنؤ میں تھے، ایک دن بعض عمائدین شہر موجود تھے۔ میر انیس صاحب بھی تشریف رکھتے تھے۔ کہیں سے آم آئے، چونکہ عمدہ تھے، مولوی صاحب مرحوم نے طاسوں میں پانی بھروا کے رکھ دیے اور سب صاحبوں کو متوجہ فرمایا۔ ایک حکیم صاحب اسی جلسے میں حرارت کی شکایت کر رہے تھے مگر شریکِ چاشنی ہوئے۔ کسی بزرگ نے کہا حکیم صاحب آپ تو ابھی علالت کی شکایت فرماتے تھے۔ حکیم صاحب تو بغلیں جھانکنے لگے۔ میر انیس نے فرمایا، فعل الحکیم لا یخلو اعن الحکمۃ۔"

یہاں آزاد نے شجاع الدولہ اور آصف الدولہ سے لے کر واجد علی شاہ کے لکھنؤ کو فرد فرد دیکھا اور آنکھوں میں بھرا۔ عمارتوں کی خوبی، روشوں کی بنیادیں، کربلاؤں کے گنج، کھنڈروں کے آباد ویرانے، سب کو مولوی صاحب آزاد نے گزشتگان کی آنکھوں سے دیکھا اور دل کے صفحات پر رقم کیا۔ مولوی آزاد کو یہاں چھ ماہ ہونے کو ہوئے تھے۔ زخم جو ابھی

تازہ تھے، اُن کے مندمل ہونے کا سامان بن رہا تھا اور کسی ایسی حکمت میں تھے کہ یہیں معاش کی دنیا بس جائے مگر خضرِ زمانہ کو کچھ اور ہی منظور تھا، وہ بسیار راہوں کا نقیب تھا۔ قاضی وزمانہ کی طرف سے انھیں ابھی عالم کی خاک پھرانا منظور تھا۔

مدراس

ایک دن کسی نے اطلاع دی کہ اُن کے گرفتاری وارنٹ میں پانچ ہزار انعام کا پروانہ جاری ہو گیا ہے اور یہ اشتہار کمپنی کے زیرِ نگین اُن تمام شہروں قریوں میں پہنچا دیا گیا ہے جہاں بغاوت اور شورش کی آگ دہکی ہوئی ہے۔ لکھنؤ چونکہ ایسے منطقوں میں سرِ فہرست تھا بلکہ اصل پوچھا جائے تو کمپنی کے خلاف بغاوت کا اکھوا پھوٹا ہی پورب سے تھا۔ جونہی یہ خبر آزاد کی سماعت سے ٹکرائی اُنھوں نے اپنی گدڑی باندھی اور مسودے کی پوٹلی اُٹھائی اور اِس شہر تنگ نہاد سے بھاگے۔ پاؤں کو گردش میں ڈال کر مدراس پہنچے۔ مدراس اُن دنوں مشنری سکولوں کا بیج دریا تھا، چھوٹے چھوٹے سکول اور اُن میں ابتدائی تعلیم کی نرسریاں گل پھول کھلا رہی تھیں۔ جنھیں دو حرف آتے تھے، وہ منشی اُستاد کی جگہ پاتے تھے۔ میاں آزاد بھی مدراس کے ایک قصبے نیل گری میں جا بسرام ہوئے۔ یہ ایک بلند پہاڑی مقام تھا۔ مقامی باشندے یہاں کے تاملی تھے اور تامل ناڈو ہی زبان چلتی تھی۔ رہنے کو عام جھونپڑیاں گولائی کے روپ میں گھانس پھونس سے بنائی جاتی تھیں۔ مولانا آزاد نے اِس اجنبی دیس میں قیام کے دوران اِنھی میں سے ایک جھونپڑی میں بستر کھولا اور خدا پر تکیہ باندھ کر لیٹ رہے۔ یہ بات ۱۸۵۸ کے پانچویں مہینے کی ہے۔ اگلے دن مدراس کے ایک جاننے والے صاحب کی ایما پر ایک ملٹری اسکول میں فارسی کے منشی کی جگہ پائی اور چند ماہ کی تنخواہ وصول فرمائی مگر کیسے ممکن تھا، دہلی کا روڑا مدراس کے پتھروں میں کیوں کر کھپتا۔ آزاد یہاں بہت چندرُکے مگر اجنبی زبان، اجنبی دیس، اجنبی مزاج کے ساتھ کب تک ٹھہر سکتے تھے۔ ۱۸۵۸

کے نصف میں آگے کی طرف کوچ بولا اور بمبئی جا پہنچے، تب تک ابھی ریل کا ریلا نہ بہا تھا، بیل اور اونٹ گاڑیوں پر سفر ہوتے تھے۔ آزاد کے پاس اتنی یافت نہ تھی کہ گاڑیوں کے جھولوں پر اُڑتے اور کاف سراؤں میں بسیرے کرتے۔ افلاس وغربت کے یہ زمانے مولوی صاحب کے لیے مکمل مایوسی اور ادبار کے ایسے سیاہ دن تھے جو کاٹے نہ کٹتے تھے۔ باپ کے مرنے کا غم تو جو تھا، سو تھا، پوری تہذیب کا دیباچہ لٹنے کا قلق اور زخم کا داغ بھی مولانا کے سینے کا چراغ بنا ہوا تھا، جس کی تپش سے کلیجہ جلا جاتا تھا اور یہ آگے چلے آتے تھے۔ مولانا کے اس غربت کے طویل سفر اور گاہ گاہ پڑاو کا سرسری ذکر موجود ہے، کہیں تفصیل کا افسانہ نہیں ملتا، نہ مولوی صاحب نے خود کسی بھی جگہ اس کا تذکرہ اجمالاً کیا ہے۔ یہ جنوب کا سفر دراصل مولانا کو اس لیے درپیش ہوا کہ وہ جس قدر ممکن تھا، دہلی کے مضافات سے دُور، بہت دُور نکل جانا چاہتے تھے تاکہ اُن کے سُراغی اُن کی آوارگی کا خیال دل سے نکال دیں اور گردپا کی خوشبو سگانِ حکومت نہ سونگھ پائیں۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے مولانا اس سفر اور اس کے نتیجے میں حاصل ہونے والی کلفتوں کو دل کے کڑاہے سے کھرچ دینا چاہتے تھے۔ دوسری اہم بات یہاں عرض یہ کرنا بھی ضرور ہے کہ مولانا کے اِن اسفار میں لکھنؤ سے نکلنے کے بعد کوئی ادبی شغل نہ تھا۔ اُن کے لیے یہ تمام علاقہ بے معنی وجود کی حیثیت رکھتا تھا، جسے وہ صرف بھلانا چاہتے تھے۔

آغا محمد باقر مولوی محمد حسین آزاد کے اِس سفر کے بارے میں ایک جگہ کچھ لکھتے ہیں مگر اتنا مختصر کہ کچھ خبر نہیں ہوتی کہ اصل واقعہ کیا ہے، ہم یہاں آغا محمد باقر کی ایک عبارت نقل کرتے ہیں۔

> ''اطلاع ملی کہ اُن کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو چکے ہیں اور گرفتار کروانے والے کے لیے پانچ ہزار کا انعام مقرر کیا ہے۔ یہ سُن کر گھبرائے، اپنا مختصر سا سامان اُٹھایا اور لکھنؤ سے بھی روانہ ہوئے۔ آخر چلتے چلاتے

مدراس جا پہنچے۔ نیل گری کے ملٹری اسکول میں ایک اُستاد کی ضرورت تھی۔ وہاں ملازمت کر لی۔ چند مہینے ملازمت کی اور وہاں سے بمبئی چلے گئے۔ کچھ عرصہ بمبئی میں رہے۔ فارسی زبان کی تحقیقات کا بچپن سے شوق تھا۔ بمبئی میں پارسیوں کے معبدوں سے ملے۔ اُن کے مذہبی صحیفے دیکھے اور اُن کی زبان کا جائزہ لیا۔ آخر وہاں بھی زیادہ دیر نہ رہ سکے۔ وہاں سے چلے تو پنجاب کا رخ کیا۔ مالوے سے ہوتے ہوئے شہر شہر کی سیر کرتے سنگرور ریاست جیند میں آ کر دم لیا"۔

اس پوری عبارت میں مولانا کے حوالے سے جو کچھ آغا محمد باقر نے بیان کیا ہے وہ اس قدر تشنہ ہے کہ معاملہ اُن کے اِس سفر کا کہیں دب کے رہ گیا ہے۔ مثلاً مولوی صاحب کو کیسے پتا چلا کہ اُن پر پانچ ہزار کا انعام مقرر ہو گیا ہے، اُنھیں یہ سب کس نے بتایا؟ مولوی صاحب نے لکھنؤ سے کون سا سامان اُٹھایا، لکھنؤ کا وہ کون سا حصہ تھا، جہاں پڑاو ڈالے رہے۔ پھر یہ کہ نیل گری اور مدراس میں کیا کچھ مولانا نے گل پھول بنائے، یہ سب باتیں اُس راز کا حصہ ہیں جن کا حریم مولانا کا سینۂ علم خزینہ رہا ہے۔ فقط یہ کہہ دینا کہ مولانا ممبئی میں پارسیوں کے معبدوں میں اُن کے عالموں سے ملے اور زبان پارسی اور ژند و پاژند کی تحقیق میں کچھ وقت صرف کیا، مولانا کے اِس سفر کی بازیابی کا پیش خیمہ نہیں بن سکتا۔ ظاہر ہے، مولانا کو اپنی روپوشی میں فکرِ معاش کی سرگوشی بھی سننا تھی، جس کے لیے کچھ کر و ورنہ بھوکا مرو کے محاورے کا مصداق ہونا تھا مگر اس کی کچھ تفصیل بھی تو ہم جیسے عشاقِ سخن آبِ حیات کے لیے ضرور درکار ہونا چاہیے تھی۔ بہر حال مولانا محمد حسین آزاد ممبئی سے سنگرور یعنی ریاست جیند میں آن پہنچے اور کنارے پنجاب کے بیٹھ کر رزق کی بارگاہ میں جال ڈالے، یہ جال کچھ دن کے لیے ڈالے رکھے مگر شکار بہم نہ پہنچا۔ ہاں کچھ جھکاوا سا ضرور ہوا مگر کتنے دنوں تک اُس کا انتظار رہتا۔

آخر وسطِ ہند میں قریباً چھ مہینے سیاحت کرنے کے بعد پنجاب کی طرف پھرے۔ جیند

میں کچھ عرصہ قیام کیا، وہاں کسی نہ کسی طرح راج دربار میں شاعری کی بدولت رسائی ہوئی۔ اُس وقت راجہ رندھیر سنگھ ریاستِ جیند کے حکمران تھے۔ کہتے ہیں اُنھوں نے ازراہِ قدر دانی کچھ انعام واکرام بھی دیا لیکن آزاد اِس پر قناعت نہ کرسکے۔ جیند کے قیام میں اُنھوں نے متعدد قصیدے لکھے اور راجہ صاحب کی خدمت میں پیش کیے۔

ایک قصیدے میں آزاد نے راجہ صاحب کی تعریف کرنے کے بعد ہزار نیازوں کے ساتھ اپنے جوہر ظاہر کیے ہیں۔ اُن کے اِس قصیدے سے پتا چلتا ہے کہ آزاد چھ سات مہینے وسطِ ہند میں لاپتہ رہے اور ۱۸۵۸ میں جیند پہنچے۔ کہتے ہیں کہ مجھ سُن صبا سے در دولت کا شوق جبیں سائی تھا لیکن مرے طالع برگشتہ نے کبھی یاوری نہ کی۔ مَیں نو سال تک مدرسے میں اس طرح قید رہا، جس طرح بلبل محزوں قفس میں رہتی ہے مگر شروع ہی سے مری طبیعت علوم کی طرف مائل تھی۔ اس کے بعد اپنی تحصیل علمی کا شمار کرتے ہیں کہ مَیں نے صرف ونحو، علم معانی ولغت کمال شوق سے حاصل کیا۔ صحاح ستہ، قاموس، محاوراتِ عربی کا مطالعہ کیا، علم حدیث اور علم اصول سیکھا۔ پھر فقہ اور فرائض کی طرف رجوع کیا۔ واجب سنت سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے ملتِ حنفی کے فتاویٰ پڑھے۔ فلسفہ، منطق، اور حکمت کے درس لیے۔ علمِ نجوم سے واقفیت بہم پہنچائی۔ علم الابدان کی تکمیل کے لیے شفا واشارات پڑھیں۔ بحث مجسطی وشرحِ چغمینی سے استفادہ حاصل کیا۔ اجرامِ فلکی کو اسطرلاب سے جانچا اور سیر کواکب کی۔ گردشِ آسمانی کے حساب لگائے۔ غرض علم نجوم وعلمِ جفر اور علمِ زیچ کو کام میں لا کر زائچے نکالے۔ شاستر، چاروں وید اور آٹھوں پرانوں کا بھی مطالعہ کیا۔ آتش پرستوں کا علم موحدوں سے حاصل کیا اور دساتیر، ژند اور اوستا کی بھی ورق گردانی کی پھر علمِ ہندسہ، ریاضی اور علم طبعی پر بیحد محنت صرف کی۔ تاریخ وجغرافیہ کے فیض سے گھر بیٹھے تمام عالم کی سیر کرنے کی کوشش کی۔ علم قیافہ میں بھی مہارت پیدا کی۔ اِس کے علاوہ مدرسے سے فارغ ہو کر گورنمنٹ کے قواعد بھی سالہا سال سیکھے۔

ملا ہے خاک میں کس کس طرح کا عالم یاں
نکل کے شہر سے ٹک سیر کر مزاروں کی

لدھیانہ میں آنا، پریس میں ملازم ہونا

محمد حسین آزاد کو جیند کا دربار راس نہ آیا۔ یہاں گلے میں فکرِ معاش کا پھندہ جان کی امان کے ساتھ بندھا پڑا تھا کہ دونوں کے کھلنے کی کہیں صورت نظر نہ آتی تھی، دوست ایسے دشمن بنے جاتے تھے کہ صورت پہچاننے سے پرے جاتے تھے۔ سب جانتے تھے محمد حسین آدمی نہیں، بغاوت کا وہ ہیولا ہمارے آس پاس گھومتا ہے کہ اُس کا سایہ جس پر گزر جائے گا ، ہمائے تخت کی بجائے تختہ کا ریشم اُس کے گلے میں آئے گا۔ یہاں عام آدمی تو ایک طرف راجے مہاراجے تک انگریز سرکار کی حاضری بھرنے میں اپنی امان پاتے تھے۔ ایسے میں کون قوی دل اور جری ہمت تھا کہ مولوی صاحب کے ساتھ اخلاص کا پہرہ نبھاتا اور مولانا آزاد کو گلے لگاتا۔ ہر چند دربار میں بار آوری کا پروانہ دیتے تھے مگر منہ پھیر کے ایسے ملتے تھے کہ پاک طینت اور غیرت مند آدمی کا جی اوب جائے اور وہ مکرر حاضری سے مکر جائے، خود ہی کہیں منہ کر جائے اور پلٹ کر راجہ صاحب کی معیت میں نہ جائے۔ مولوی صاحب نے جان لیا تھا کہ اِن تلوں میں تیل نہیں کہ میری مشقت اور مصیبت کا بار اُٹھا سکے اور مجھ نا پرسیدہ و فلک رسیدہ کے قدموں تلے سیڑھی کا زینہ چڑھ جائے۔ مولانا آزاد نے اپنی معیشت اور جان کی زنبیل کو جیند کے دربار سے اُٹھایا اور پا برہنہ، ننگے سر، طالع برگشتہ کے ساتھ وہاں سے نکلے اور مشرقی پنجاب میں قسمت سراغی کو جہاں گرد ہوئے۔ اُنھی دنوں مولانا کی نظر

میں ایک آدمی کا سر تھا کہ اُس پر علم کی دستار کے ساتھ انگریز سرکار کی وفاداری کی کلغی لہراتی تھی اور اُس کلغی میں دربار کی رسائی کے موتی جڑے تھے۔ یہ شخص مولوی رجب علی تھا۔ مولوی رجب علی کسی زمانے میں آزاد کے اجداد کا شاگردِ عزیز اور عزیزِ جاں ہوا کرتا تھا۔ اِس نے دو اُستادوں کی آنکھیں دیکھ رکھی تھی اور وہ دونوں باپ بیٹا تھے۔ ایک خواجہ محمد اکبر اور دوسرے مولوی محمد باقر تھے۔ مولوی رجب علی اِنھی کے مدرسے میں پڑھا تھا اور بہت کچھ تعلق محبت و مہر کا اُن کے ساتھ جُڑا تھا۔ غدر میں مولوی رجب علی کا تمام اخلاص اور گواہی کمپنی بہادر کے ساتھ تھی اور اِسی کے عوض کمپنی کے ہاں اِن کی توقیر زیادہ تھی۔ انگریز سرکار کی ایک خوبی بہر حال کسی سے اُٹھائے نہ اُٹھتی کہ وہ اپنے وفاداروں کے ساتھ وفادار ضرور تھی اور اِسی لیے وہ کچھ ہندوستان میں کر گیا کہ کوئی بیگانہ ملک اور بیگانہ دیس کیا کرے گا۔ مولوی رجب علی کو اُن کی خدمات کے عوض ارسطو جاہ کا خطاب ملا ہوا تھا۔ علاوہ اِس کے گورنر پنجاب کے میر منشی کا عہدہ استرادتھا۔ مولوی رجب علی نے اُن دِنوں لدھیانہ کی تحصیل جگراؤں میں مجمع البحرین کے نام سے ایک پریس لگا رکھا تھا۔ جگراؤں میں مولوی رجب علی کی بہت سی حویلیاں اور جائداد تھی۔ اِن حویلیوں میں اُن کی وہ تمام رعیت بستی تھی جو مولوی رجب علی کی زمینوں کی کاشت کرتی تھی وہیں ایک حویلی میں اُن کا پریس لگا تھا اور ایک دوسری حویلی میں اُن کی بیوی اور بچے رہتے تھے۔ ہر چند مولوی رجب علی خود وہاں نہ ہوتے تھے مگر پریس کی دیکھ بھال اُن کے ایک ناظم کے ہاتھ میں تھی، جس کا نام ابھی ہمیں معلوم نہیں ہوسکا۔ مولوی آزاد ارسطو جاہ کی طرف تو نہ گئے، ہاں مگر لدھیانہ یعنی جگراؤں میں اُس کے پریس کے ناظم کو جا ملے۔ اتفاق دیکھیے کہ اُنھی ایام میں ناظم صاحب کو مطبع کے لیے ایک کاتب کی ضرورت بے حد تھی۔ لدھیانہ میں اگرچہ پڑھے لکھوں کی کمی نہ تھی مگر جو کچھ تعلیم اور تربیت کے پہنچے ہوئے لوگ دہلی کے تھے، ویسے یہاں نہ ملتے تھے۔ اِس پر ایک اور بات تھی کہ ارسطو جاہ ایک نہایت نستعلیق آدمی تھے۔ اُن کا کسی کاتب پر اتفاق کرنا بہت

بعید ہو جاتا تھا۔ وہ ایسے بار یکی سے عبارت کی صرف ونحو دیکھتے کہ بڑے سے بڑے کاتب کے پسینے چھوٹ جاتے تھے۔ ناظم صاحب، بہت سوں کو رکھ چکے تھے اور نکال چکے تھے۔ آزاد میں بہت سی باتیں ایک وقت میں جمع تھیں۔ قسمت کے شاد دِنوں میں خود اپنے پریس کے والی وارث تھے، مدیر بھی تھے، خوش نویس ایسے تھے کہ عبارت کو تصویر بنا کر رکھ دیتے تھے۔ آج بھی آغا سلمان باقر اُن کے پڑپوتے کے پاس مولوی آزاد کے جو کچھ مسودات اُن کے ہاتھ کے لکھے ہوئے پڑے ہیں، انھیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ کیا لکھتے تھے، موتیوں کا جڑاو کرتے تھے۔ ایسی گولائی اور لفظ کی بناوٹ برقی مشین سے بھی نہ ہو اور لائنیں ایسی درست اور سیدھی کہ صراط مستقیم کا گمان ہوتا ہے۔ غرض بہت خوبصورت املا تھا۔ دہلی اردو اخبار میں بھی یوں سمجھ لیں عبارت نہ لکھتے تھے، خوش نویسی کے مرقعے بناتے تھے اور اپنا اداریہ خود قلم بند کرتے تھے۔ کاتبوں کی تحریروں کو جانچتے تھے، پریس کی ضروریات کا حساب جمع تفریق میں سب پاس تھا اور ایسے اِس کام میں تاک تھے کہ خود ناظم صاحب موجودہ پریس کے کیا جانتے ہوں گے۔ آزاد نے اپنے خطِ تحریر کا نمونہ پیش کیا۔ اُسے دیکھ کر ناظم صاحب نے سبحان اللہ کہا اور بہت پسند فرما کر کتابت پر ملازم رکھ لیا۔ مولوی رجب علی کہیں دورے پر تھے۔ ایک روز واپس آئے تو ناظم صاحب نے اُن پر کھولا کہ پریس کے ایک کاتب دہلی کے کسی نابغہ گھرانے کا فرزند ہے، جسے ملازم رکھ لیا ہے۔ ناظم صاحب نے مولوی آزاد کا خطِ تحریر مولوی رجب علی کو دکھایا۔ مولوی رجب علی کو یہ خط بہت بھایا۔ وہ یہ نہ جانتے تھے کہ کاتب ہذا جس گھر کا فرزند ہے اُس کا وہ خود احسان مند ہے۔ مولوی رجب علی نے ناظم مطبع سے کہا، کاتب سے کہو ہمارے بچوں کو بھی تعلیم دے دیا کرے اور اُس کا ہدیہ الگ سے لے لیا کرے۔ یوں رجب علی نے اپنے بچوں کو آزاد کی شاگردی میں دے دیا اور معاوضہ اِس کام کا الگ بڑھا دیا۔ اب آزاد میاں وہاں پریس میں کتابت کے ساتھ مولوی رجب علی کے بچوں کو تعلیم دینے لگے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے مولوی رجب علی گورنر

پنجاب کے میر منشی تھے، اس خدمت میں انھیں تمام پنجاب کی سیر واجب تھی اور وہ بیشتر اوقات دورے میں رہا کرتے تھے، کبھی کبھی لدھیانہ آتے تھے اور آزاد کے متعلق ناظم صاحب کی زبانی پوچھ تاچھ کر اطمنان کر لیتے تھے۔ اُدھر آزاد اِن دونوں کاموں سے فرصت پاتے تو اپنے اُستاد کے کلام کا دفتر کھول لیتے، آنکھوں کے چراغ جگر کے خون سے جلاتے اور تمام رات کلام کی ترتیب مدوین پر حیات جاوید کا روغن چھڑکتے۔ صبح اُس مسودے کو بستے میں باندھ کر مطبع کے کام میں ہمت باندھ لیتے۔ اسی طرح دن چلتے رہے اور راتیں کٹتی رہیں۔ مولانا کے اِن کاموں کو مولوی رجب علی کے ذہین بچے دلچسپی سے دیکھتے اور وہ کچھ سیکھتے جو ہزار کتابوں اور بے شمار اُستادوں کے تلمذ میں نہ سیکھ سکتے تھے۔ مولوی رجب علی کی نوکری میں جو معاوضہ مولانا کو ملتا اُسے بے دریغ سونی پت اپنے کنبے کی کفالت کو بھیج دیتے اور اُن کی جان و آبرو کے حفظ میں دعا گو رہتے۔ یہاں وقت گزرتا گیا اور اچھا گزرا۔ یہاں تک کہ ایک دن مولوی رجب علی شاہ صاحب لدھیانہ آئے۔ بچوں نے اُن سے مولوی آزاد یعنی اپنے نئے اُستاد کا قصہ چھیڑا اور اِس ذکر میں بتلایا کہ اُستاد جی بہت علم والے ہیں ،ادب اور شعر کے متوالے ہیں۔ دلی کے رہنے والے ہیں۔ ہمیں پڑھاتے خوب ہیں اور جو کچھ پڑھاتے ہیں، وہ حرف لمحوں میں یاد ہو جاتے ہیں۔ جب کچھ وقت فرصت کا پاتے ہیں، اُس میں شعر لکھتے ہیں، شعروں کو پڑھتے ہیں اور بار بار گنگناتے ہیں۔ اِن کے بستے میں بہت کاغذ اشعار کے بھرے پڑے ہیں۔ لڑکوں کی یہ باتیں سُن کو مولوی رجب علی کو بہت تعجب ہوا اور دل اُن کا ملنے کی طرف شدید مائل ہوا۔ مولوی رجب علی صاحب کو ملنے کا یہ اشتیاق اس لیے بھی بہت تھا کہ دہلی کا ایسا کون آزاد شخص ہے جو اُن کے مطبع کی قید میں بیٹھا ہے اور علم کے لعل موتی صیقل کر رہا ہے۔ مولوی رجب علی نے ناظم مطبع کو پیغام بھیجا کہ نئے کاتب کو ہمارے پاس لے کر آو۔ کہتے ہیں جب شاہ صاحب کی آزاد سے ملاقات ہوئی تو عجب منظر تھا۔ پے در پے صدمات اور انقلاب سے آزاد بڈھے ہو گئے تھے اور پہچانے نہ

جاتے تھے۔ انہوں نے آزاد کو پہچانا، گلے سے لگایا۔ حالات پوچھے اور ہر طرح کی خاطر جمعی کی۔ تنخواہ میں اضافہ کیا اور مجبور کیا کہ وہ کنبے کو یہیں بلا لیں۔ اگر چہ رجب علی کو یہاں بہت کچھ اُن کے لیے الگ کرنا چاہیے تھا۔ اتنے بڑے انسان کو محض ایک کاتب بنا کے رکھنا اُن کی شان کے مناسب نہ تھا مگر زمانے کی ستم ظریفی کو کیا کہیے کہ مصیبت کے کولہو میں آیا ہوا زیتون کا پھل روغن بغیر نکل نہیں سکتا کہ زمانے کے بیل کی گردش رُکے تو بات بنے۔

عشق کیا سو جان جلی ہے الفت تھی یا کلفت تھی
کوٹے گئے ہیں سب اعضا یہ محبت تھی یا محنت تھی

دہلی کا گلاب پنجاب میں عرقِ محنت

محمد حسین آزاد دلی کا روڑہ سمجھو، پنجاب کا باسی ہونے جاتا تھا۔ لاکھوں کا مالک جب یوں کوڑیوں کا محتاج ہو جائے تو آپ جانو کیسے نہ بے چارہ تقدیر کے سیاہ کونے میں پڑا چراغ کی لَو کو پہچانے اور اُس طرف دوڑا چلا جائے۔ یہاں یہی کچھ ہوا، آزاد نے رجب علی شاہ کے اخلاص کا پرتو دیکھا تو اُس کے سائے میں تکیہ بچھایا اور کنبے قبیلے کو سونی پت سے لدھیانہ بلایا۔ سونی پت میں جیسا کہ ہم کہہ آئے ہیں منشی بشیر حسین کے ہاں تمام رشتوں کے دانے بے رشتہ پڑے ہوئے تھے۔ اول وہاں کسی کو خبر نہ تھی کہ آزاد کہاں ہے۔ اس رجب علی کے آسرے کی چھت سے اول اُنھیں پیغام بھجوایا کہ ہم کہاں ہیں اور کس خیریت کے بادلے میں چھپے ہیں اور بعد اُس کے سفر خرچ کا بھجوایا۔ یوں سب خاندان سونی پت سے لدھیانہ کو چلا اور منشی بشیر حسین کی مہمانی کا بار سر سے ٹلا۔ اس طرح سب خویش قبیلہ سونی پت سے لدھیانہ آ گیا۔ یہاں اب کے گزر بسر کا روزینہ طے ہوا، گھر کا چولہا گویا دہلی کے چاندنی چوک سے اُٹھ کر پنجاب کے لدھیانے میں آ گیا اور یہاں اُنھیں دو سال کا بیانیہ نکل گیا۔ زندگی ایک مزدور کے روز و شب کے بہروپ میں چلنے لگی اور چلتی چلی گئی۔ صبح کام، شام کام، گئی رات تلک جا کر صورتِ آرام اور نمود و نام سراسر گمنام تھی۔ کب تلک رنگ و نظر کے پھیروں میں اُڑنے والا کٹے پروں پڑا رہتا۔ اب ہوا یہ کہ مولوی آزاد کی طبیعت میں تغیر

آیا۔ انھیں اول مولوی رجب علی شاہ سے شکایتیں ہوئیں، جن کا ذکر آگے ہم کریں گے دوئم وہ جہاں نام کے آزاد تھے، مزاج کے اُس پر مستزاد تھے۔ یعنی ہندوستان کا نابغہ اور نورِ قلم کا صاحب لدھیانے کی کالی پریس میں بیٹھتا تھا۔ تب کی معاش گرچہ گزارے کو کافی تھی مگر طبیعت کو شادابی نہ تھی۔ انہیں چودہ پندرہ روپے ماہوار ملتے تھے، لیکن بلند ہمت اور ترقی کا جذبہ مہمیز دیتا تھا۔ موجودہ کارِ معیشت محض جینے کا سہارا تھی۔ درحقیقت قدرت نے انہیں کسی اور کام کا نقارہ بجانے کو بھیجا تھا۔

مرتا ہوں جان دیں ہیں سفرداریوں پہ لوگ
اور سُنتے جاتے ہیں کہ ہر اِک نے سفر کیا

لدھیانہ سے سیالکوٹ اور کشمیر سے
ہوتے ہوئے لاہور کا سفر

زمانہ دسمبر 1860 کا تھا، جاڑے کی سردمہری کا دور آیا تھا۔ غدر کا زخم نشان دے کر مندمل ہو چکا تھا۔ سب ہندوستان میں اور خاص کر پنجاب کی عمل داری میں تعلیم، صحت اور دیگر فلاحی اور منصوبوں کی بارآوری کے کوششیں عروج پر تھیں۔ اسی سلسلے میں پنجاب کے ڈائریکٹر تعلیمات ایک دن دورہ کرتے اور تعلیم کی ضرورتوں کو سمجھنے کے واسطے شہر شہر پھرتے لدھیانہ آئے، وہاں سے جگراؤں تشریف فرمائے۔ ڈاک بنگلہ میں اُن کا قیام تھا اور وہیں غیر رسمی اور ضروری ملاقاتوں کا اہتمام تھا۔ آزاد کو خبر ہوئی کہ صاحب بہادر ڈاک بنگلہ میں قیام فرماتے ہیں، جو کوئی دُکھی دل وہاں جاتے ہیں، اُن سے داد پاتے ہیں۔ آزاد جی میں ڈرتے، محافظت کی آئتیں پڑھتے اور نادِعلی کا ورد کرتے کسی سبب سے جا پہنچے۔ آزاد کا اس ملاقات میں مقصد یہ تھا کہ کسی طرح صاحب بہادر کو تعلیم کے میدان میں اپنی کسی خدمت کا منصوبہ دوں اور اُنھیں بتاوں کہ وہ کیسے اُن کے واسطے انسانی فلاح کے اس قریے میں مفید ثابت ہو سکتا ہے اور تعلیم کی توسیع کے علاقے میں کیسے اپنی پیش روی کو رفتار دے سکتا ہے۔ جب آزاد کی ملاقات ہوئی تو انھوں نے ڈائریکٹر تعلیمات کو بہت کچھ زبانی اپنا مدعا بیان کیا،

ایسے طریقے سے کہ روزی روٹی کے ساتھ معافی کے پیرائے بھی نکلتے ہوں۔ ڈائریکٹر سے ملاقات بہت بار آور ثابت ہوئی۔ اُنھوں نے آزاد کے خیالات کو پسند کیا۔ آزاد خوش خوش لوٹ آئے مگر ہوا یہ کہ صاحب بہادر کے دماغ سے وہ گفتگو بہت جلد محو ہو گئی اور کچھ نتیجہ نہ پایا۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

> ''جگراوں (لدھیانہ) میں اُنھیں ہر طرح کا آرام اور آسائش حاصل تھی۔ مگر اُن کے ارادوں اور آرزوؤں کا خون ہوئے جاتا تھا۔ ۱۸۶۰ میں ڈائریکٹر تعلیم دورہ کرتے ہوئے لدھیانہ آئے اور وہاں ڈاک بنگلے میں ٹھہرے۔ مولانا نے اِس موقع کو غنیمت جانا اور اُن سے ملاقات کی۔ چاہتے تھے کہ محکمہ تعلیم میں ملازمت مل جائے اور مَیں ملک اور قوم کی خدمت کرسکوں۔ ڈائریکٹر تعلیم نے ان خیالات کی قدر کی اور مدد کرنے کا وعدہ کیا''۔ (۱۳)۔

کسو کو شوق یا رب بیش اِس سے اور کیا ہو گا
قلم ہاتھ آ گئی ہو گی تو سو سو خط لکھا ہو گا

ڈاکخانہ لاہور میں ملازم ہونا

اُسی زمانے میں ایک واقعہ ایسے ہوا کہ مولانا آزاد کو اُن کے بہنوئی محمد علی نے سیالکوٹ آنے کی دعوت دی، وہ وہاں پر پوسٹ ماسٹر تھے۔ اِدھر مولانا آزاد کے دل میں سیر بندھی کہ چلیے وہاں چلتے ہیں، کشمیر پاس ہے، کچھ بہنوئی سے ملاقات کے بہانے کشمیر کی سیر کا راستہ کھلے گا۔ کشمیر بزرگوں کا وطن بھی تھا اور اجداد کی پُرانی نشانیاں بھی کچھ وہیں تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ ہو نہ ہو اگر انھیں کشمیر میں پناہ ملے تو یہاں وہاں کا سب کچھ تیاگ کر اُسی دیار میں جا بستے ہیں۔ اِس خیال کے سوجھتے ہی آزاد نے مطبع کے ناظم سے چھٹی لی اور روانہ ہو گئے۔ اول سیالکوٹ میں اپنے بہنوئی کے گھر ٹھکانا کیا، دو چار دن بسرام کر کے کشمیر کو روانہ ہو گئے اور کافی دن بتا دیے۔ وہاں مولانا کے جی میں ایک عجیب ترکیب سوجھی کہ کیوں نہ یہاں کتابوں کی خرید و فروخت کا کام کر لیا جائے۔ یہ بات ۱۸۶۰ کے آخری مہینوں کی ہے مگر قسمت کے کاتب نے اُن کی کتاب میں کچھ اور تحریر کیا تھا۔ ابھی کتابوں کا کام شروع ہی کیا تھا کہ اُن کے بہنوئی کو لاہور بلا لیا گیا اور مولانا وہاں بے آسرا ہو گئے۔ مولانا کو وہاں سے واپس لدھیانہ ارسطو جاہ کی درگاہ کی طرف کوچ بولنا پڑا۔ پھر وہی پریس اور وہی آب و دانہ مگر اِس بار زمانہ طویل نہ گزرا تھا کہ بلاوا لاہور سے دوبارہ آیا یعنی اب کے چند دن ہی لدھیانہ گزر نہ پائے تھے کہ مولوی رجب علی ارسطو جاہ نے انھیں لاہور بلوا کر گورنر ہاؤس میں اپنی خط کتابت پر لگا دیا۔ یہ خط فارسی میں لکھے جاتے تھے اور اِس کے بدلے انھیں وہی مطبع

والی تنخواہ دی جاتی تھی۔ اس سے اتنا ہوا کہ مولانا کو لدھیانہ سے آزادی ملی۔ وہ اپنا خویش قبیلہ بھی لاہور لے آئے۔ یہاں آزاد میاں نے کچھ یوں کیا کہ میر منشی کی خط و کتابت کے ساتھ جنرل پوسٹ آفس میں بیٹھ کر اور اپنے بہنوئی کا سہارا لے کر خود لوگوں کے خطوط بھی لکھنا شروع کر دیے تاکہ کچھ مزید یافت ہو جائے۔ تا آنکہ اُن کے بہنوئی کی سفارش پر ایک دن مولانا کو اسی پوسٹ آفس میں پندرہ روپے ماہوار پر نوکری مل گئی اور اُن کی جان میر منشی سے چھٹی۔ یوں کسی کی ذاتی نوکری سے رہائی پائی اور گورنمنٹ کی قید میں نوکری فرمائی۔

واقعہ اس نوکری کا یوں ہے۔ جب مرزا محمد علی لاہور محکمہ ڈاک میں پوسٹ ماسٹر ہو گئے اور اپنی جگہ کا تکیہ مضبوط کر لیا تو اُنھوں نے مکرر مولوی آزاد کی خبر گیری کی۔ یہ مرزا محمد علی صاحب میاں آزاد کے پھوپھی زاد تھے۔ یعنی مولوی محمد باقر کی بہن ان صاحب کی والدہ تھیں۔ یہ وہی خاتون ہیں جو دہلی سے کوچ کے وقت اجمیری گیٹ سے باہر برف خانے کے پڑاؤ میں ایک پانی کی ٹھلیہ پر قبضہ کر بیٹھی تھیں اور کسی کو پانی نہیں دیتی تھیں۔ جہاں آج کل کناٹ پیلس ہے، یہ برف خانہ وہیں ہوتا تھا۔

محکمہ ڈاک اُن وقتوں میں بڑی وقعت رکھتا تھا اور اُس کا ملازم بھی توقیر کا حامل ہوتا تھا۔ مولوی آزاد نے اس وقت کو غنیمت جانا۔ مولوی رجب علی کی وساطت سے لاہور پہنچنے کی سبیل پہلے ہی نکال لی تھی۔ وہ مدت سے ایسے موقعے کی تلاش میں تھے، جہاں کہیں بندھے پروں کو کھول کر پھڑ پھڑایا جا سکے۔ لاہور میں اُن دنوں تعلیم کا خاص نقارہ نہ بجتا تھا مگر حالات سے اندازہ تھا کہ یہ شہر پنجاب کا دارالخلافہ ہے اس لیے محکمہ تعلیمات میں بڑی راہیں نکلیں گی، ان میں ترقی کے زینے بہت بلندی تک جائیں گے۔ چنانچہ آزاد لاہور گئے۔ وہ کام تو مولوی رجب علی کا کرتے تھے مگر سکونت پھپھی زاد کے ہاں رکھتے تھے یعنی اُن کے حقیقی پھوپھی زاد بھائی مرزا محمد علی صاحب نے کمال مہربانی فرمائی۔ پہلے ان کو اپنے پاس رکھا۔ مرزا صاحب اُن دنوں اندرون لاہور مستی گیٹ کے قریب میں قیام رکھتے تھے اور مولوی

صاحب کو بھی اپنے گھر میں وہیں رہنے کو بسیرا دیا۔ میاں آزاد مولوی رجب علی سے فارغ ہو کر پوسٹ آفس میں آ بیٹھتے تھے اور وہاں عوام کے خط پتر تو لکھ ہی رہے تھے۔ مرزا محمد علی نے کچھ دن میں بڑی سفارشوں کی کوششیں کیں۔ آخر ایک نوکری نکال ہی لی اور جنرل پوسٹ ماسٹر کے آفس میں سررشتہ دار کی جگہ دلوا دی۔ یہ وہی پوسٹ آفس ہے جو مال روڈ لاہور پر موجود ہے۔ ہم نے جنرل پوسٹ ماسٹر کا وہ کمرہ دیکھا ہے، جہاں میاں آزاد ایک طرف بیٹھے کام کی زنجیر سے بندھے تھے۔ یہاں بھی آزاد کو وہی چودہ پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی اور سچ پوچھو تو بہت غنیمت تھی۔ ملازم ہونے کے بعد آزاد اپنے گھر والوں کو بھی لاہور لے آئے اور باقاعدہ اقامت پذیر ہو گئے۔

آغا باقر لکھتے ہیں۔ لاہور آنے کے معاملے میں آغا باقر ہماری تحقیق سے ذرا تھوڑا سا مختلف کر کے یوں لکھتے ہیں:

> ''کچھ عرصہ کے لیے وہ سیالکوٹ آئے اور وہاں سے ایک دم کشمیر جنت نظیر کی سیر کا ارادہ کر لیا۔ کشمیر کی سیر کر کے واپس آئے تو سیالکوٹ ہی میں مقیم ہو گئے۔ یہاں پرانی اور نایاب کتابوں کی تجارت شروع کر دی۔ جہاں سے کوئی اچھی کتاب ملتی، خرید لیتے۔ پھر بڑے بڑے افسروں کو خطوط کے ذریعے اطلاع دیتے کہ میرے پاس فلاں فلاں کتاب برائے فروخت موجود ہے۔ ابھی یہ سلسلہ اچھی طرح سے چلنے بھی نہ پایا تھا کہ اُن کے بہنوئی لاہور تبدیل ہو گئے۔ یہاں ارسطو جاہ گورنر پنجاب سرہنری کے میر منشی تھے۔ اُن کی خط و کتابت تمام تر فارسی میں ہوتی تھی۔ ارسطو جاہ نے یہ کام مولانا کے سپرد کر دیا۔ اس دور میں اُنھوں نے لاتعداد چٹھیاں فارسی میں لکھیں .... اسی زمانے میں پوسٹ ماسٹر جنرل کے آفس میں کچھ عرصہ بلا تنخواہ کام کیا۔ آخر ۱۹ اپریل ۱۸۶۱ سے تیس روپے ماہوار پر ڈیڈ لیٹر آفس میں ملازم ہو گئے۔ یہاں وہ ڈاک خانے کے

اعلانات کا ترجمہ کرتے تھے۔ دسمبر ۱۸۶۲ میں دو سال کی ملازمت کے بعد
انھیں ملتان لائن پر بحیثیت اوورسیئر تبدیل کر دیا گیا۔ اگرچہ تنخواہ زیادہ ملتی
مگر وہ لاہور سے باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے۔ آخر استعفیٰ دے دیا۔
پوسٹ ماسٹر جنرل اُن کے کام سے خوش تھا۔ اُس نے ڈائریکٹر تعلیم میجر
فلر کے نام سفارشی چٹھی دی، جس میں لکھا کہ "مولوی صاحب بلا شبہ عالم
آدمی ہیں اور محکمہ تعلیم کے لیے نہایت موزوں ہیں"۔

اُدھر ایک اور قصہ یہ ہوا کہ اس وقت غدر کو ڈھائی تین برس جا چکے تھے اور دہلی سے سر بچا کے بھاگے ہوئے پلٹ کر دہلی کو دیکھتے تھے۔ بعض واپس آ چکے تھے، اکثر معافیاں پا کر گھروں کو پھر گئے تھے۔ جہاں کچھ چھپے ہوئے باقی تھے اور الزام اُن پر بغاوت کے بڑے تھے، وہ بھی اپنی معافیوں کی تصدیق بھرا کر دہلی نہ سہی، کہیں آرام بسر میں بیٹھ چکے تھے مگر آزاد کی معافی کا قصہ مشکوک تھا، اُن پر الزام بہت کڑا تھا، براہِ راست دہلی دربار سے تعلقات اور اخبارالظفر کے مدیر کے ناطے کچھ بھلے کی بجائے سرکار کے ہاں بُرے کی توقع بھی عین تھی۔ یہی سبب تھا کہ آزاد کو ابھی اطمینان نہ تھا اور وہ اپنی معافی کے لیے کنج خوف سے نہ نکلے تھے۔ یعنی معافی کے لیے سرکار دربار میں نہ گئے تھے۔ خبر اُنھیں یہ تھی کہ ایسا نہ ہو معافی لینے جاؤں اور اپنا آپ صاف ظاہر کر کے کسی بد طینت کی چغلی کی بھینٹ چڑھ جاؤں اور امان کی بجائے ابا میاں کی طرح توپ کی نال پر بندھ جاؤں۔ اِدھر ارسطو جاہ رجب علی کی پناہ کا آسرا بھی کوہ کی طرح بلند تھا۔ اس سے جی میں ہمت پیدا ہوتی تھی۔ دوئم اِدھر اُدھر کی خبروں سے انگریز بہادر کے تعمیری منصوبوں کی اطلاعیں برابر آتی تھیں اور اُنھیں پتا چلتا تھا کہ گورنمنٹ کی طرف سے سزاوں کی مارکاٹ کا سلسلہ تھم گیا ہے۔ بڑے بڑے مجرم معافی پا چکے ہیں۔ اتنی مدت گزرنے پر سرکار بہادر کا مزاج معتدل ہو چکا ہے اور اب تعمیر اور امن کے بندوبستوں کا دور ہے۔ یہ سب سوچ کر آزاد میاں نے پھوپھی اماں سے صلاح لی اور کسی باوقار انگریز سے ملنے کی تیاری کی اور ایک دن یہ موقع بن آیا۔

تُو ہے بیچارا گدا میر ترا کیا مذکور
مل گئے خاک میں یاں صاحب افسر کتنے

ڈائریکٹر تعلیمات سے دوبارہ ملاقات

آزاد جب لاہور چلے آئے تو اُس کے سامنے کھلے پانیوں میں تیرنے کو ایک سمندر تھا۔ گرچہ تب کا لاہور دہلی کے زور کا نہ تھا، پھر بھی ہاتھ پاوں پھیلانے کو ہوائیں میسر تھیں، لدھیانہ کا پریس اس کے سامنے ایک پنجرہ ہی تو تھا۔ پوسٹ آفس کی نوکری میں گونا گوں افراد سے سامنا آزاد کا روز ہوتا تھا۔ سامنے آفس ڈائریکٹر تعلیمات کا تھا۔ ایک روز 25 مئی 1861ء کو آزاد نے ڈائریکٹر تعلیمات کو ایک خط لکھا جو "مکتوباتِ آزاد" میں شائع ہو چکا ہے۔ اُس میں حوالہ سابقہ ملاقات کا دیا جو جگراؤں کے ڈاک بنگلے میں ہوئی تھی۔ ہم آپ کے لیے خط کی نقل یہاں درج کیے دیتے ہیں۔ خط کی تحریر بتاتی ہے کہ آزاد پروں کو پھڑپھڑانے میں کتنے بے چین تھے مگر کیسے سہمے سہمے اُڑان بھرنے کی طرف اُٹھتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"بہ اتفاق آب و دانہ فدوی لاہور میں پہنچا اور محکمہ خستشمہ حضور جنرل پوسٹ ماسٹر صاحب بہادر میں سرشتہ دار ہے۔ چونکہ حضوری خدمت حکام سے علاوہ اپنے نفع ذاتی کے، اس قسم کے فوائد متصور ہیں، جن سے خلق خدا کو فوائد حاصل ہوں اور خدا اور نائبان خدا رضامند ہوں اور واسطے ہمیشہ کے نام نیک یادگار رہے۔ اس واسطے فدوی بھی آرزومند قدم بوسی حضور کا ہے۔ اُمیدوار ہوں کہ بنظر علم پروری اور جوہر شناسی اپنے وقت فرصت سے فدوی کو مطلع فرمائیے کہ حاضر حضور ہو کر دولت لازوال حاصل کروں"۔

اِس خط کے پہنچنے پر آزاد کو ملاقات کا پروانہ مل گیا۔ ڈائریکٹر تعلیمات نے انھیں بلوا بھیجا۔ آفس میں کافی کچھ ملاقات ہوئی۔ آزاد نے اپنا مدعا بیاں بہ احسن پیش کیا اور واپس چلے آئے۔ انگریز سرکار کے حضور میں اپنے مدعا کا بیان کرنا سائل کے لیے حق ہوتا تھا مگر اُس کا جواب دینا صاحب بہادر اُسی وقت ضروری خیال نہیں کرتے تھے اِس لیے صاحب بہادر نے جواب دینے کی بجائے تسلی دے کر واپس کیا اور تعلقات کی بنا اس پر رکھی کہ ملتے رہا کیجیے۔

تلوار کس کے خون میں سر ڈوب ہے تری
یہ کس اجل رسیدہ کے گھر پر ستم ہوا

کسی خیر خواہ کی سازش

لاہور میں محمد حسین آزاد یوں تو محکمہ ڈاک میں ایک معمولی سر رشتہ دار تھے مگر جو کچھ اُن کی اپنی ذات میں کمالات کا خزانہ بھرا پڑا تھا وہ ظاہر ہونے لگا اور مولانا کے اثر رسوخ کی موجیں سرکار دربار کی ہوا میں اُبھرنے لگیں۔ یہ باتیں ایسی تھیں کہ پہلے رشک اور پھر حسد کے انگارے اپنوں پرائوں میں دبی آگ دہکانے لگے۔ ہوا یہ کہ ایک دن مولوی صاحب کو معلوم ہوا کہ کسی بدخواہ نے گورنمنٹ کو خبردار کر دیا ہے کہ یہ صاحب وہی محمد حسین آزاد ہے جو اخبار الظفر کا مدیر ہے اور مولوی محمد باقر کا اکلوتا بیٹا ہے اور ایک عرصے سے روپوش تھا اور یہ کہ اُن کے بارے میں گورنمنٹ کی طرف سے خفیہ تفتیش جاری ہے۔ انھیں بتایا گیا کہ یہ اطلاع گورنمنٹ کو اُسی مرزا محمد علی کی طرف سے وصول ہوئی ہے، جو انھیں لدھیانہ سے دہلی لایا ہے اور سرکار میں نوکر لگوایا ہے۔ بتانے والے نے مولوی آزاد کو یوں بتایا، چونکہ ڈائریکٹر تعلیمات کے ساتھ بڑھتے ہوئے تعلقات اُسے ناگوار گزرے ہیں اس لیے اُس نے یہ چال چلی ہے۔ اس خفیہ اطلاع میں خاص کر مسٹر ٹیلر پرنسپل دہلی کالج کا نام لے کر کہا گیا تھا کہ اس کا باپ دراصل اُس کا اصلی قاتل تھا اور محمد حسین کے وارنٹ گرفتاری بھی جاری ہو چکے تھے مگر یہ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

اس واقعے کے وقت غدر کو اگرچہ ساڑھے تین سال نکل گئے تھے اور عام معافی کا

اعلان بھی ہو چکا تھا لیکن حکومت ایسے لوگوں سے خدمات وصول کرنے میں احتراز کرتی تھی اور کچھ سزا کا بھی اندیشہ رکھتی تھی جنھوں نے غدر میں انگریزوں کے خلاف کوئی عملی حصہ لیا تھا۔ مولوی آزاد یہ سُن کر گھبرائے ہوئے گھر چلے آئے اور سب قصہ گھر میں کہہ دیا۔ وہاں ایک کہرام مچ گیا اور ایسا سیاپا پڑا کہ چارپائیاں اُلٹی ہو گئیں۔ سب حواس باختہ دیکھیے کیا ہوتا ہے۔ مگر ہوا یہ کہ آزاد کے معاملے میں انگریز بہادر معتدل ہو چکے تھے۔ اُنھیں غدر کے واقعات اور اُس میں مارے جانے والے ایک ایک آدمی کا احتساب یاد تھا۔ آزاد کے والد کے معاملے میں بھی پوری تحقیقات بعد میں کی گئی تھیں جن میں مولوی محمد باقر کی بے گناہی مکمل نہ سہی کچھ نہ کچھ اُن پر ظاہر ہو چکی تھی اور آزاد تو سرے ہی سے اُس میں بے گناہ پائے گئے تھے اور اب جبکہ گنہگاروں کو عام معافی کا اعلان بھی ہو چکا تھا تو آزاد کے لیے یہ معافی زیادہ مناسب تھی جبکہ اُن کے والد کو پھانسی دی جا چکی تھی اور گھر بھی کھود دیا گیا تھا۔ اُن کا علم و فضل، اُن کے خاندانی وقار اور آنے والے دنوں کے پیشِ نظر آزاد کو بجائے سزا کے، کسی کام میں لانا اُن کے لیے زیادہ مفید تھا۔ تحقیقات بہت جلد ختم ہو گئیں اور آزاد پر کسی قسم کی سخت گیری نہ کی گئی بلکہ اُس کی خدمات اُلٹ ڈائریکٹر تعلیمات نے محکمہ تعلیم کے لیے منظور کر لیں، جہاں اُن کی ماہوار تنخواہ 75 روپے مقرر کی گئی مگر یہ بات معمہ رہی کہ اصل اطلاع یا شکایت کس صاحب نے کی ہے۔ اگرچہ نام مرزا محمد علی کا استعمال کیا گیا تھا مگر مولوی محمد حسین آزاد کو اِس کا یقین نہیں آیا، ہم نے جب اُن کی عالمِ جنون کی تحریریں دیکھیں تو اُن سے کچھ شبہ ہوتا ہے کہ اِس واقعے پر گورنمنٹ کو اطلاع دینے والا اصل میں ارسطو جاہ مولوی رجب علی ہی تھا اور مولوی آزاد کو اُسی پر شک تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ مولوی آزاد اُن کی خشی گیری، جگراؤں اور اُن کا مطبع چھوڑیں، دوئم وہی اُس کی ڈائریکٹر تعلیمات سے ملاقاتوں سے واقف تھا اور گورنمنٹ میں اثر رسوخ کا اصل حسد بھی اُسی کو تھا۔ وہ جانتا تھا، مولانا جس قابلیت کا سہرا باندھے دنیائے جستجو میں ہیں، ضرور ایک دن اُن کا طوطی انگریز سرکار کے علمی عجائبات میں بولے گا اور وہ رجب علی کے مقابل میں مقبول ہوگا۔ یہی حسد انسان کی وہ نیکی

کا درخت جلا دیتا ہے جنھیں فطرت محبت سے پال رہی ہوتی ہے۔

آغا سلمان باقر نے اپنے کسی مضمون میں لکھا ہے:

''دفتری ملازمت کے باوجود آزاد کا ادبی ذوق اپنی پوری آب وتاب اور جوش کے ساتھ انگڑائیاں لیتا رہا۔ بظاہر وہ مختلف محکموں میں کام کرتے رہے لیکن اُن کا دل و دماغ ادب ہی میں اُلجھا ہوا تھا اور اُنھوں نے اپنی پہلی باقاعدہ کتاب ''آئینہ صحت'' حکومت کو پیش کی۔ گورنمنٹ نے آزاد کی کوئی حوصلہ افزائی نہیں کی لیکن حکومت نے آزاد کو لکھا کہ وہ اس کتاب کے لیے گورنمنٹ سے انعام کے لیے سفارش کرے گی مگر بات دب گئی۔ ہر انسان کے گرد حاسد ہوتے ہیں۔ آزاد کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ کو مرزا محمد علی برداشت نہ کر سکے۔ اُنھوں نے خفیہ طور پر گورنمنٹ کو اطلاع دی کہ یہ محمد حسین آزاد وہی شخص ہے جس کے باپ کو غدر کے بعد مسٹر ٹیلر کے قتل کے الزام میں گولی سے اُڑا دیا گیا تھا۔ اور اس کے وارنٹ گرفتاری جاری ہو گئے تھے''۔

آغا سلمان باقر کا بیان اپنی جگہ مگر بات یہ ہے کہ مرزا محمد علی ایک عام سرکاری ملازم ہونے کے ناطے وہ خواہشات اور ترجیحات نہیں رکھتا تھا جس کی طرف مولانا آزاد جا رہے تھے، نہ مرزا محمد علی مولوی آزاد کے مقابلے کا آدمی تھا۔ وہ ایک معمولی حیثیت کا ملازم تھا جسے اپنے گھربار اور اردگرد کا جائزہ لینے کا کم ہی موقع ملتا تھا، پھر یہ کہ مرزا محمد علی اور آزاد ایک ہی مصیبت سے نکلے تھے، اُسے گورنمنٹ کو اطلاع دیتے ہوئے آزاد کے ساتھ اپنی قربت اور رشتہ داری کو بھی ملحوظ رکھنا تھا کہ اگر آزاد مولوی باقر کے بیٹے تھے تو وہ بھی سگے بھانجے تھے اور اُسی گھر کے پروردہ تھے۔ تب یہ کیسے ممکن تھا کہ اُسے آزاد کی شکایت کرتے وقت اپنے اُن تمام رشتوں اور نزاکتوں کا احساس نہ رہتا۔ پھر یہ کہ اگر آزاد گورنمنٹ کے قریبی ہوتے تو اُس کا فائدہ مرزا محمد علی کو بھی پہنچتا۔ لہٰذا ضرور یہ بات تھی کہ گورنمنٹ کو اطلاع کسی اور نے دی ہو اور نام محمد علی کا استعمال کر کے ایک تیر سے دو شکار کیے۔

نہیں میر مستانہ صحبت کا باب
مصاحب کرو کوئی ہشیار سا

محکمہ تعلیم میں ملازم ہونا

آزاد کا محکمہ تعلیم پنجاب لاہور سے متعلق ہونے کے بارے میں مختلف بیانات سامنے آتے ہیں، جن کی اصل کو دریافت کرنا ایک مشکل امر ہے اور بہت سی غلط فہمیوں کا سبب بنتا ہے۔ سب سے پہلے ہم رام بابو سکسینہ کی تاریخ ادب اردو میں پیش کیا گیا واقعہ پیش کرتے ہیں۔

آزاد پھرتے پھراتے 1864ء میں لاہور پہنچے اور مولوی رجب علی شاہ کے ذریعے سے پنڈت من پھول لفٹنٹ گورنر کے میر منشی سے ملے اور اُن کی سفارش سے سررشتہ تعلیم کے محکمے میں پندرہ روپے ماہوار پر ملازم ہو گئے۔ چھوٹے عہدے کی وجہ سے اُن کو اتنا موقع نہ ملتا تھا کہ بڑے بڑے افسران سرکاری سے مل سکیں، جو اُن کی لیاقت اور قابلیت کا لحاظ کر کے اُن کو کسی اعلیٰ عہدے پر پہنچائیں۔ اتفاق سے ماسٹر پیارے لال آشوب کے ذریعہ سے جو ان کے بہی خواہ دوست تھے، میجر فلر ڈائریکٹر سررشتہ تعلیم تک رسائی ہو گئی، جو علم السنہ شرقیہ سے کمال ذوق رکھتے تھے اور رسائی کی صورت یہ ہوئی کہ میجر صاحب نے لفظ 'ایجاد' کو مونث لکھا تھا، جس کی نسبت تذکیر و تانیث کا کچھ شبہ تھا۔ ماسٹر پیارے لال آشوب نے آزاد کو بلایا اور اُن سے اس کے بابت دریافت کیا۔ انہوں نے 'ایجاد' کو مذکر کہا اور جب سند مانگی تو یہ شعر سودا کا پڑھا:

ہائے کس بھڑوے کا یہ ایجاد ہے
نسخے میں معجون زر نباد ہے

اور یوں مولوی آزاد کی محکمہ تعلیمات میں خدمات کا آغاز ہوا۔

ہمارے پاس اس وقت آغا محمد باقر نبیرہ آزاد کا ایک طویل مضمون ہے جس میں وہ اس واقعے کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس اہم واقعہ کے متعلق میں نے والد مرحوم (آغا ابراہیم یعنی فرزند آزاد) سے یہ سنا ہے کہ آزاد ڈاکخانہ میں ملازم تھے اور اُن کو میجر صاحب سے ملاقات کا شرف پہلے سے حاصل تھا۔ ایک دن اتفاق سے صبح کی سیر میں آزاد کی پنڈت جی سے ملاقات ہو گئی۔ پنڈت جی نے چھوٹتے ہی پوچھا، کہو بھئی 'ایجاد' مذکر ہے یا مونث۔ آزاد نے فوراً کہا مذکر۔ پنڈت جی نے سند مانگی۔ آزاد نے جواب میں فوراً سودا کا مذکورہ بالا شعر پڑھا۔ پنڈت جی نے تمام واقعہ من وعن میجر صاحب سے بیان کیا، جس سے آزاد کی زبان دانی اور قابلیت کا سکہ میجر موصوف کے دل پر اور بھی بیٹھ گیا۔ میجر صاحب علوم السنہ شرقیہ سے بے حد دلچسپی رکھتے تھے اور اُن کو ایسے شخص کی ضرورت تھی جو زبان کی تصحیح اور تحقیقات میں انہیں ہر وقت مدد دے۔ اس لیے جب "اتالیقِ پنجاب" کو جاری کرنے کا سوال در پیش آیا تو انہیں آزاد سے بہتر کوئی اور شخص نظر نہیں آیا۔ چنانچہ اس کام کے لیے ان کی نظر انتخاب نے آزاد کو منتخب کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جہاں آزاد کی ذاتی قابلیت پیش نظر تھی وہاں پنڈت جی کی سفارش بھی برابر کا وزن رکھتی تھی۔

بات کو مزید وضاحت کرتے ہوئے آگے چلتے ہیں کہ یہ تاریخ دراصل رام بابو سکسینہ موصوف نے خم خانۂ جاوید سے لی ہے اور یوں وہ دونوں کی تردید کرتے ہوئے قلم بڑھاتے ہیں۔

"مصنف "خمخانہ جاوید" اور "تاریخ ادب اردو" کا یہ کہنا بھی سراسر غلط

ہے کہ آزاد شروع میں پندرہ روپے ماہوار پر سررشتہ تعلیم میں ملازم ہوئے
تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ 1860ء میں پندرہ روپے ماہوار ڈاکخانہ لاہور میں
سررشتہ دار ہوئے تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ ملازمت نہ تو ان کے مذاق کے
مطابق ہے اور نہ وہ اس سلسلہ کو تادیر جاری رکھ سکتے ہیں۔ اس لئے
انہوں نے آرام کا سانس لے کر اولین فرصت میں ڈائریکٹر تعلیمات سے
ملاقات کی اور اپنے ارادوں اور قابلیتوں کا از سر نو اظہار کیا۔ چنانچہ انھی
کوششوں کا نتیجہ تھا کہ وہ ڈاکخانے کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر انجمن
پنجاب کے اخبار "اتالیق پنجاب" کے سب ایڈیٹر مقرر ہوئے، جہاں
انہیں پچھتر روپے ماہوار ملتے تھے۔ اگرچہ ڈاکخانہ کی سررشتہ داری نے اُن
کو ایک معمولی کلرک کی حیثیت دی تھی لیکن یہ ملازمت بلند خیالات اور
اعلیٰ مقاصد کے حصول میں سدراہ نہیں تھی۔ وہ شروع سے لے کر آخر تک
اس کوشش میں رہے کہ کسی نہ کسی طرح اِن کو محکمہ تعلیم میں کوئی معقول جگہ
مل جائے جہاں انہیں اپنی مخصوص قابلیت اور بلند ارادوں کو عملی جامہ
پہنانے کا موقع ملے۔ چنانچہ میجر فلر کی قدر دانی کی بدولت وہ محکمہ تعلیمات
میں جا ہی پہنچے۔ جہاں تک میری تحقیقات اعانت کرتی ہے اس کا نتیجہ یہ
ہے کہ آزاد نے ڈاک خانہ کی ملازمت ایک سال یا سوا سال کی ہے اور
ان کے بعد ان کو محکمہ تعلیمات میں جگہ مل گئی ہے"۔

اِن تمام عبارتوں کو سامنے رکھا جائے تو ہماری معلومات اور تجزیے نے صورت حال کا
جائزہ لیتے ہوئے جو کچھ وصول پایا ہے وہ یہ ہے۔ جب سے مولوی آزاد لدھیانہ میں تھے
اُنھی وقتوں سے پنجاب میں میجر فلر محکمہ تعلیمات کے ڈائریکٹر تھے۔ اُن کو مشرقی علوم وفنون
سے بہت دلچسپی تھی۔ خاص کر مشرقی زبانوں، اردو، عربی، فارسی اور سنسکرت کے لیے اُن کی
دلچسپیاں حد سے بڑھی ہوئی تھیں۔ وہ چاہتے تھے کہ اِن کا پھیلاو کیا جائے اور خاص کر

انگریز نوجوان اور برطانیہ سے آنے والے آئی سی ایس کے ملازم اِن زبانوں کو سیکھ کر اپنے علمی خزانوں میں اضافہ کریں اور ملک کی فلاح کے واسطے زیادہ مضبوطی اور سمجھ داری سے کام کریں۔ ہوا یہ کہ ماسٹر پیارے لعل بھلے زمانوں میں، جب دہلی جوبن پر بسا کرتی تھی، دہلی کالج میں مولانا محمد حسین آزاد کے ہم جماعت تھے اور دوست بہت دلی تھے۔ بسنے والے بھی دہلی کے تھے اور اُنھی کے پڑوس میں کشمیری بازار میں رہتے تھے اور آزاد کو بہت عزیز جانتے تھے۔ وہ غدر سے پہلے ہی پنجاب میں پہنچ کر محکمہ تعلیمات میں آ چکے تھے اور ڈائریکٹر تعلیمات کے سرشتہ دار تھے۔ جیسا کہ ہمارے لدھیانہ کے ذکر میں بیان ہوا ہے مولوی آزاد نے ڈائریکٹر تعلیمات سے لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں ملاقات کی تھی اور اِس بات پر بہت خوش تھے کہ ڈائریکٹر صاحب نے اُن کی حوصلہ فزائی کی تھی۔ یہ بات بہت قرین قیاس ہے بلکہ عین ممکن ہے کہ لدھیانہ ڈاک بنگلے میں جو ڈائریکٹر تعلیمات پنجاب سے ملاقات ہوئی تھی، اُس میں بھی پیارے لال آشوب کا ہاتھ ہو کیونکہ وہ محمد حسین آزاد کے دلی خیر خواہ تھے۔ اِسی کوشش میں تھے کہ کسی طرح آزاد کی ابتلا کا زمانہ ختم ہو اور وہ بحال ہو جائیں، ذہنی اور معاشی آسودگی کی سطح پر۔ جو خط مولوی آزاد نے میجر فلر کو لکھا ہے اگر چہ اُس کی عبارت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ لدھیانہ ڈاک بنگلے میں ہونے والی ملاقات میں پیارے لال آشوب کا کچھ ہاتھ تھا مگر لگتا ہے کہ یہ احتیاط خود آزاد اور پیارے لال آشوب کے باہمی مشورے سے ہی عمل میں آئی تھی کہ آزاد بہر حال ایک روپوش ملزم تھے اور اندیشہ تھا کہ اِسی معاونت پر کہیں پیارے لال آشوب بھی اُلٹی مصیبت میں نہ گھر جائیں اور یہ بات ناممکن ہے کہ ایک ہم وطن اور دوست اور نیک طینت آدمی اتنا بے تعلق رہے اور آزاد کے لیے کچھ نہ کرے۔

ایک جگہ آغا محمد باقر نبیرہ آزاد لکھتے ہیں۔

"مذکور الصدر خط سے صاف ظاہر ہے کہ آزاد کی پہلی ملاقات اُن سے

لدھیانہ کے ڈاک بنگلے میں ایک سال قبل ہو چکی تھی، جس کی وجہ سے وہ
خود ان سے براہ راست ملے۔ پنڈت جی چونکہ آزاد کے ہم وطن تھے اور
دہلی کالج کے زمانے ان کی قابلیت علمی سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس
لیے انہوں نے آزاد کی سفارش ضرور فرمائی ہوگی، جس کے لیے آزاد کا
خاندان از حد شکر گزار ہے۔ بہر حال ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کرتے
کہ پنڈت جی کی قدر دانی اور سفارش آزاد کے حق میں بہت مفید ثابت
ہوئی"۔

محکمہ تعلیمات میں اخبار کی ادارت:

آزاد کی نوکری تعلیم کے محکمے میں عجیب زینے کا آغاز تھا جس کی سیڑھیاں ایک کے بعد ایک آزاد نے ہزار مصائب کے باجود یوں چڑھیں کہ ہفت آسمانِ علم کے اُستاد مقرر ہوئے اور شہرت کے سلطان منتخب ہوئے۔ معاملہ یہاں یوں پیش آیا کہ لاہور میں اُن دنوں ڈائریکٹر تعلیمات کی طرف سے ایک اخبار جاری کرنا چاہتے تھے۔ یہ اخبار سراسر تعلیمی اور علمی نوعیت کا تھا جس میں سیاست کو کچھ دخل نہ تھا۔ اس کام کے لیے ایسے فرد کی ضرورت تھی جو علم وادب اور تعلیم کے ساتھ اخبار نویسی میں بھی طاق ہو اور ملازمت کو صرف معاش کا پہیہ نہ سمجھے، اُسے شوق کے پر لگا کر اُڑائے اور زمینِ علم کو آسمانِ شہرت تک سفر کرائے یعنی تعلیم کی خبریں گلی گلی پہنچائے، ہنر کی بات دربار سے بازار تک لے جائے اور عوام الناس کو اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی طرف دل صاف کرے، راہ اس کی پاک کرے۔ ایک تو یہ کام تھا ،ایک کام اس سے بھی پُر ذوق تھا اور آزاد اس کے لیے بہت باذوق تھا۔ تجویز یہ تھی کہ انجمن پنجاب کے نام سے ایک انجمن بھی قائم ہو جو اپنی طرف سے تعلیم کو فروغ دینے میں مختلف طریقہ ہائے کار کا آغاز کرے اور اخبار اُس انجمن کے مقاصد کی تشہیر کرے۔ یعنی تعلیم اور اُس کے باب میں کیے گئے اعمال کو قلم کا زنجیر کرے۔ وہ خبریں ادنیٰ سے اعلیٰ تک پہنچ

جائیں۔ اِن تمام کاموں کے لیے مولوی آزاد سے بہتر اور کون آدمی ہوسکتا تھا، جو دونوں کام خوشی سے اور اپنے جمالیاتی اُسلوب سے انجام میں پہنچائے۔ آخر کار انجمن کے مقاصد کی ترویج اور اعمال کی تشہیر کے واسطے یہ اخبار ''اتالیقِ پنجاب'' جاری ہوا۔ ماسٹر پیارے لال اس کے مدیر ہوئے اور آزاد نائب مدیر ہوئے۔ یہی وہ نوکری تھی جس کے عوض آزاد کوڑا کھانے کی قید سے آزادی ملی اور پندرہ روپے کی بجائے پچھتر روپے کی شادی ملی۔

یہ کام کافی دیر جاری رہا، آزاد نے اخبار کو بنانے، تراشنے اور سنوارنے میں آب قلم کے جوہر بہائے۔ ایسی سرگرمی سے اُسے چلایا کہ ہر ایک مولانا کے ہنر کو سراہنے اور اُن کے علم کو داد دینے سے باز نہ رہ پایا۔ آزاد نے اس اخبار کو معقول اور اس کے مقاصد کو کامیاب بنانے میں بڑی سرگرمی اور جانفشانی سے کام کیا۔ ڈائریکٹر بہادر اُسے دیکھ کر شاد باد ہو گئے اور ایسے خوش ہوئے کہ اُنھیں اخبار کی تھکن سے ہٹا کر بچوں کی ابتدائی جماعت میں پڑھائی جانے والی اردو ریڈروں کی تیاری کا راحت طلب کام دے دیا۔ اگرچہ یہ کام ایسا مشکل اور جگر توڑ دینے والا تھا کہ بڑے سے بڑا بوندلا جائے مگر یہاں کون نابغہ تھا، وہی آزاد، جس کے قلم کو آبِ حیات عطا ہو چکی تھی۔ اس کام میں ایسی خوشی اور راحت پاتا تھا کہ دوسرا کوئی اُس کا تصور نہیں کر پاتا تھا۔ بہت خوش ہوئے اور اُن کو ابتدائی جماعتوں کی ریڈریں تیار کرنے کا کام دے دیا۔ جب آزاد کو تصنیف و تالیف کا کام مل گیا تو وہ سب ایڈیٹری سے جاں بخشے گئے۔ اس جگہ مولانا الطاف حسین صاحب حالی آگئے۔ یعنی اُستاد ذوق کے شاگرد کے پیچھے پیچھے اُستاد غالب کے شاگرد۔

نظیر اُس کی نظر آئی نہ سیاحانِ عالم کو
سیاحت دور تک کی، ایک ہے وہ بے نظیری میں

سنٹرل ایشیا کی سیاحت

سینٹرل ایشیا کی سیاحت ایک ایسا معمہ ہے جسے جتنا سلجھایا گیا اتنا اُلجھتا گیا۔ مولانا کے جس قدر حاسدین تھے، اُنھوں نے اِسے مولانا کی ایسی کمزوری پر دال سمجھا، جس میں اُنھیں انگریزی سرکار کا خوشامدی اور مسلمانوں کا غدار قرار دیا جا سکے۔ یہاں تک کہا گیا کہ مولانا نے اِس سفر میں انگریز سرکار کے لیے جاسوسی کا فریضہ سرانجام دے کر نہ صرف اپنے باپ کے ساتھ وفاداری کا عہد توڑ دیا بلکہ پوری مسلم اُمہ کے لیے داغ چھوڑ دیا۔ یہ تمام باتیں مولانا کے متعلق نہ صرف عام لوگ کرتے ہیں بلکہ یونیورسٹیز کے تنخواہ دار اور نام نہاد محققین بھی تواتر سے پھیلا رہے ہیں اور عوام میں بھی یہ پراپیگنڈہ انھی کا پھیلایا ہوا ہے۔ اِن لوگوں کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے، اول تو کوئی روشنی کا ستارہ اِن کی اندھیری غاروں میں طلوع ہی نہ ہو، اگر کسی طرح یہ معجزہ ہو ہی جائے تو اُس پر ایسی سیاہی کے چھینٹے اُڑاو کہ اُس کی روشنی دھندلا جائے اور نیک نامی سراسر گناہ کا سراپا بن جائے۔ مولانا آزاد تو اِس معاملے میں بہت مظلوم واقع ہوئے ہیں۔

اِس مقالے کے اولین حصوں میں ہم نے جس قدر مولانا کے حالات کا اجمالاً بیان کیا ہے اُس کے پیشِ نظر کوئی ذی فہم آدمی ایسی زبان مولانا کے حق میں جائز نہیں سمجھتا جو یہ نام نہاد محققین اور نقاد برتا کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کے لیے کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ وہ

حادثات سے گریز کر کے نکل جاتے جو اُن کے راستے میں دیوار ہو گئے تھے۔ اِن لوگوں نے آزاد کے کام کی طرف اس قدر توجہ نہیں دی اور بعض کام تو پڑھا ہی نہیں ، بس یہ کیا ہے کہ کسی طرح آزاد میاں کا چہرہ داغ دیں۔ مجھے افسوس ہوتا ہے اِن لوگوں پر جن سے اگر اُن کے کام پر بات کی جائے تو دو لفظ نہیں بول سکتے اور عیب جوئی اور بہتان میں ہزاروں صفحے سیاہ کر دیں گے۔

ہم نے جب اس سفر کے متعلق غور کیا تو درج ذیل باتیں شہود میں آئیں۔

اول یہ کہ مولانا کا سینٹرل ایشیا کی سیاحت پر جانا اپنے بس اور اختیار میں تھا یا نہیں؟

دوم ، مولانا اس سفر سے انکار کرنے کے متحمل تھے یا نہیں؟

سوم ، کیا مولانا اس سفر میں جا کر انگریزوں کے لیے کوئی بہت بڑی یا ایسی خبر نکال کر لائے تھے جس کی بنیاد پر برطانیہ نے سینٹرل ایشیا کو غتر بود کر کے رکھ دیا تھا؟۔

چہارم ، کیا مولانا سینٹرل ایشیا کی سیاحت پر اپنی علمی دلچسپی کا کتھارسس بھی کرنا چاہتے تھے؟

پانچویں بات یہ کہ مولانا نے کیا اس سفر میں انگریزوں کی نسبت خود مسلمانوں کے لیے اور خاص کر ادب کے طالب علموں کے لیے سرمایہ جمع نہیں کیا؟

اِن تمام باتوں کے جواب ہم یہاں دیں گے ، پہلے اول دو باتیں سُن لیجیے۔

سینٹرل ایشیا کی سیاحت کوئی ایسا کام نہیں تھا جیسا کسی سینما میں فلم دیکھ کر اُس میں چُھپی رمزیں بیان کرنا تھا بلکہ موت کی وادی سے عزرائیل کے عزائم کی خبر لانا تھا۔ مولانا کو سب معلوم تھا کہ اُن کا گھر بار اُنھی کے سہارے پر زندہ ہے ، وہ واحد کفیل اپنے کنبے کے بچے ہیں۔ اگر اُنھیں کچھ ہو گیا تو خاندان کی بچی کھچی جانیں گردِ زمانہ میں روندی جائیں گی اور بعد میں باپ دادا کا نام لینا تو ایک طرف ، نشان تک بھی نہیں بچے گا۔ جس سفر پر پہلے جتنے لوگ جا چکے تھے ، ایک بھی بچ کر نہیں آیا تھا اور اُنھیں بھی ۸۰ فیصد اپنی موت کا یقین تھا۔ اُن

کے جانے کی خبر پر گھر بھر میں ایک کہرام مچا ہوا تھا اور مولانا کو ایسے رخصت کیا جا رہا تھا جیسے کسی جنازے کو رخصت کرتے ہیں، ابراہیم ابھی دو سال کا تھا۔ خاندان کے رہنے کے واسطے کوئی مکان اپنا نہ تھا۔ پُرسہ دینے کو کوئی دوست دار باقی نہ بچا تھا، یہ سب باتیں مولانا کے پیشِ نظر تھیں۔ اگر اس کے باوجود وہ اس سفر پر روانہ ہوئے ہیں تو کوئی ایسی مجبوری ضرور تھی جس سے گریز ممکن نہیں تھا۔

ہوا ایسے کہ آزاد کو اردو ریڈریں تیار کرتے دو برس ہونے کو آئے۔ اُن دنوں برٹش گورنمنٹ کا تحقیقاتی نظام بہت بیدار تھا، خاص کر گورنمنٹ کے ملازمین کے لیے ایک کیمرہ نما احتسابی نظر ہوتی تھی کہ اُن کے ہر قول و فعل اور حرکت و سکون کا جائزہ لیا جاتا تھا۔ غدر کے بعد تو ایک ایک قدم پھونک کر رکھا جاتا تھا۔ اِسی نظام کے تحت آزاد کو بھی کیمرے کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ اُن کے علم و ادب اور اخلاص گورنمنٹ کی نظر میں تھیں۔ اِدھر مولوی محمد حسین آزاد اپنے آپ کو کسی بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتے تھے اور خاندان کی کشتی بلائے زندگی سے نکال کر صحیح و سالم کنارِ امن روکنا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے کوئی شکایت اور اُس کا احتمال تک نہ پیدا ہونے دیا تھا۔ لاہور میں گزرے ہوئے مہ و سال اور ملازمتوں میں مولانا مکمل طور پر بے داغ اور پُر وقار ثابت ہوئے تھے۔ اِسی بنا پر انگریز سرکار مولانا کی کمزوریوں سے بھرپور فائدہ اُٹھا لینا چاہتی تھی۔ اُنھوں نے نہ صرف مولانا کو معافی دی تھی بلکہ معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے واسطے ایک باوقار ملازمت کا بندوبست بھی کیا۔ سینکڑوں بدخواہوں کی شکایات کو پسِ پشت ڈال کر گورنمنٹ نے اُن کے لیے باقاعدہ ترقی اور علمی استھانوں پر بٹھانے کا موقع فراہم کیا۔ اب اِن تمام نوازشات سے یہ سمجھ لیا جائے کہ محض انسانی ہمدردی کی بنا پر گورنمنٹ نے مولانا کے ساتھ کیا تو وہ عقل کا پیدل ہی ہوگا۔ ایسی گورنمنٹ جو نہ صرف پورے ہندوستان کو چلا رہی تھی بلکہ ایک دنیا پر اُس کا پھریرا لہراتا تھا کیا وہ مستقبل کی منصوبہ بندی سے بالکل بے بہرہ تھی اور کیا وہ ہندوستان کے لوگوں، اُن

کی کمزوریوں اور اُن کے مزاجوں سے ناواقف تھی؟ کیا وہ علمی اور عملی انسانوں کے نشیب و فراز سے آشنا نہ تھی۔ ضرور اُن کو پہلے دن ہی سے معلوم تھا کہ مولانا آزاد کون ہے؟ اس کی حیثیت کیا ہے؟ یہ کس ترازو میں رکھنے کے لائق ہے اور کہاں ہمارے لیے کام آسکتا ہے۔ ضرور بر ضرور اُنھوں نے مولانا کے لیے بھی ایک منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اِسے کہاں استعمال کرنا ہے اور اُس کا موقع آ گیا تھا۔

میرا خیال ہے اس وضاحت کے لیے پہلے آغا سلمان باقر کا یہ مضمون بہت اہم ہے ،جسے ہم عین بہ عین یہاں نقل کرتے ہیں۔ یہ مضمون اگرچہ طویل ہے لیکن مولانا کے سینٹرل ایشیا کی سیاحت کو سمجھنے کے لیے ادب کے طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا ازحد ضروری ہے۔ مولانا کا یہ مضمون بالواسطہ مسٹر لائٹر پر ہے لیکن یہی مضمون آپ کو بہت کچھ سمجھا دے گا۔ اصل پوچھیں تو آغا سلمان باقر نے اس مضمون میں وہ حق ادا کیا ہے جو ایک خلف اولاد کے سر پر اُس کے جد کا واجب ہوتا ہے۔

''مولانا آزاد برطانوی ریاست اور حکام مملکت بظاہر اور در پردہ کیسے تعلقات رکھتے تھے کہ وہ جانتے بوجھتے اور جان لیوا اور جوکھم کی مہم پر اپنی جان ہتھیلی پر رکھ کر روانہ ہو گئے۔ گو اُس کی زندگی میں اُس کے بعد دوبارہ واقعہ نہ ہوا، جو یہ ثابت کرتا کہ اگر وہ برطانوی حکومت کے کوئی ایجنٹ یا رابطہ افسر بکار خاص تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو بار بار ایسی مہموں پر بھیجے جاتے''۔

وہ زندگی میں ایک مرتبہ عام معافی ہونے کے بعد ایسی خطرناک اور قاتل مہم جوئی پر نکل گئے جس پر جانے والا ایک بھی شخص بچ کر نہ آیا تھا۔ کیا وہ دل سے اس مہم پر جانے پر آمادہ تھے یا بے دست و پا ہو گئے تھے؟

یہ اور اس طرح کے اور بہت سے دوسرے سوالات نے آزاد کے محققین کو ایک سو پینتالیس سال سے بے چین کر رکھا ہے۔ جبکہ سوال یہ بھی ہے کہ اگر مولانا آزاد اُس مہم پر جانے سے انکار کر دیتے تو کیا پھر اُن کی باقی ماندہ زندگی کی خیر و عافیت کے ساتھ ضمانت دی

جا سکتی تھی؟

جب برطانوی خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں نے مشن کا مکمل یا جزوی خاکہ یا پلان مولانا آزاد کو سنا دیا تو اُن کے پاس اُس مہم پر جانے سے انکار کی کوئی صورت باقی رہ گئی تھی ؟اگر آزاد انکار کر دیتے تو قتل کر دیے جاتے یا بخوشی باقی زندگی گزارتے؟ آزاد جانتے تھے کہ ہر دوست سے موت کا سایہ بصورتِ قتل اُن کے سر پر منڈلانے لگا ہے۔

اگر سینٹرل ایشیا برطانوی حکمرانوں کے دباو پر جاتے ہیں تو وہاں سے آج تک کوئی بچ کر نہیں آیا، اگر انکار کرتے ہیں تو شملے سے نکلتے ہی کسی ناگہانی موت کا شکار ہو جائیں گے۔ تب اُنھوں نے یہی سوچا کہ موت تو اب سر پر منڈلانے لگی ہے، بہتر ہے کہ دیارِ غیر میں مرا جائے۔ اس صورتِ حال نے اُن کو خفیہ سیاسی مہم جوئی پر آمادہ کیا، گویا یہ موت ہی تھی جس کے خوف نے مولانا آزاد کو سینٹرل ایشیا کے سیاسی سفر کی حامی بھرنے پر مجبور کیا۔ یہی وجہ ہے کہ پھر اُن کی زندگی میں ایسا دوسرا کوئی اور سفر نہ آیا۔

تو پھر آیئے مولانا آزاد کے اس حیرت انگیز اور قاتل سفر کی اُس وجہ پر بحث کرتے ہیں کہ آزاد نے اُس سیاسی سفر کا داغ اپنی زندگی کی بقا کے لیے تو نہیں لگایا تھا؟

اس داستان میں پہلا نام ڈاکٹر لائٹنر یعنی ملا عبدالرشید آفندی کا آتا ہے۔ جس نے آزاد کی ذہانتوں اور سوجھ بوجھ سے متاثر ہو کر وزارتِ خارجہ کی خفیہ ایجنسی کو آزاد کا نام تجویز کیا تھا کہ وہ اس خفیہ سیاسی مشن کے لیے پنجاب سے موزوں ترین منتخب فرد ہیں۔ عبدالرشید آفندی (ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر) پنجاب کی ایک اہم خفیہ ایجنسی جس کا نام مدرسہ لاہور تھا کے لاہور میں سربراہ اور کرتا دھرتا تھے، جس کی بنیادی تفصیل کچھ یوں تحقیق ہوئی ہے

ڈاکٹر لائٹنر المعروف ملا عبدالرشید آفندی ۱۸۶۴ میں برطانوی مرکزی حکمرانوں کی ایما پر بطور تعلیمی ریفارمر لاہور تعینات کیے گئے۔ شمال مغربی ہندوستان میں موجود ریاستوں کے مزاج اور ماحول پر اُن کو بطور سیاح اور پرچہ نویس خاص دسترس حاصل تھی۔ ڈاکٹر لائٹنر بطور

عبدالرشید آفندی خود شمالی علاقہ جات کی سیاسی سیاحت کے دوران وہاں کے طبقاتی اور قبائلی نظام کی باریک باریک رمزوں اور مزاجوں کے اُتار چڑھاو سے بخوبی واقف تھے، گویا وہ شمال مغربی ہندوستان کے مزاج آشنا تھے۔ وہ بے شمار شمالی علاقہ جات جن میں گلگت، ہنزہ، شگر، سکردو، چلاس، نگر، خنجراب، سوات، باجوڑ، چترال، کشمیر، تبت، لداخ اور اُدھر مغربی ہندوستان کے ریاستی ممالک، افغانستان میں کابل، بدخشاں، خلم، خوقند، مزار شریف اور دیگر ملحقہ روسی ریاستوں کی بنفسِ نفیس سیاحت بلکہ جاسوسی کر چکے تھے۔ اُن کی لکھی رپورٹیں لندن کے اخبارات میں بھی شائع ہو چکی تھیں۔ وہ بے شمار وسط ایشیا کی چھوٹی بڑی ریاستوں کے رسم و رواج، رہن سہن، رکھ رکھاو، اور اُن کے قبائلی جرگہ قوانین پر علمی حد تک دسترس رکھتے تھے۔

یاد رہے کہ وہ پیدائشی یہودی تھے اور مرتے دم تک یہودی رہے، وہ مسلمانوں کی یہودیوں سے روایتی اور مذہبی نفرت کے دینی اور تہذیبی احساس سے مکمل طور پر نہ صرف آگاہ تھے بلکہ اُس کے اثرات اور معاشرتی مزاج کے ردِعمل سے بھی مکمل طور پر واقف تھے۔ عام پبلک میں وہ اپنے آپ کو عیسائیت کے قریب ظاہر کرتے تھے۔ اگر کہیں کسی مذہبی تقریب میں شرکت سے فرار کا جواز نہ ملتا تو بیماری کا بہانہ کر کے اُس تقریب میں شرکت سے محفوظ رہنے کا جواز فراہم کر لیا کرتے تھے۔ البتہ کبھی کبھی عیسائیوں کے مذہبی جلسوں میں شرکت ناگزیر ہو جاتی تو عین وقت کے وقت شریک ہوتے اور جلد ہی معذرت کر کے میزبانوں سے نجات حاصل کر لیا کرتے تھے۔ اُس دور کے لوگوں میں بہت بڑی اکثریت کو معلوم تھا کہ اُن کا مذہب عیسائیت ہے، جس کی دو وجوہات تھیں، ایک تو یہ کہ وہ اگر کسی مذہبی تقریب میں شرکت کرتے تو وہ صرف عیسائیوں کی ہوتی تھی۔ مسلمانوں کی کسی مذہبی تقریب میں سیاسی یا اخلاقی طور پر شریک ہونے کا کوئی بھی ریکارڈ کہیں بھی اُن کے ہندوستان میں قیام کے دوران (۱۸۶۴ تا ۱۸۸۹) دستیاب نہیں ہو سکا۔ یعنی وہ ارادی طور

پر مسلمانوں سے دور تھے، جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عیسائیت کے قریب اور مسلمانوں میں رہ کر اُن سے دور تھے اور بظاہر بلکہ عملاً بھی مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے کام کرنے کا بیڑا اُٹھائے بیٹھے تھے۔ ہنگری میں وہ علوم مشرقی سیکھ چکے تھے مگر وہاں اُن کی اسلام دشمن سرگرمیوں کے چرچے عام ملتے ہیں۔ چونکہ ڈاکٹر لائٹر ہندوستان کے شمال میں بغرضِ جاسوسی طویل مدت بطور مسلمان بھیس بدل کر سفر کر چکے تھے، اِس لیے وہ مسلمانوں سے ملتے، نمازیں پڑھتے، قرآن اور حدیث سناتے اور اِن پر بے تکان بحث کرتے تو وہاں کے مسلمان قبائل اُن کو سر آنکھوں پر جگہ دیتے اور پر لطف کی بات یہ ہے کہ وہ ایک مختون یہودی تھے۔ اِس لیے اُن کو اپنا آپ مسلمان ثابت کرنے میں کہیں پر بھی پریشان کن مسائل کا سامنا نہیں ہوا۔ اِس سب کے باوجود وہ مسلمانوں کے بطور یہودی خیر خواہ نہ تھے۔ ہاں مگر اُن کے دل، مزاج اور کردار میں عیسائیوں کے لیے اور برطانوی حکومت کے لیے نرم گوشے ہر سمت سے موجود تھے۔ اِس لیے وہ عیسائی حکومت اور مشنری کی بقا کے لیے، کہیں درپردہ اور کہیں علانیہ اپنی خدمات پیش کرتے نظر آتے ہیں۔ اِن باتوں سے اُن زمانے کے حکمران اور انگریز سرکار بخوبی آشنا تھے۔

ڈاکٹر لائٹر کی پنجاب، لاہور میں تعیناتی کے بعض شواہد بتاتے ہیں کہ اُن کو برطانوی انٹیلیجنس کے اعلیٰ حکام نے اُن کی اپنی ذاتی اور اعلیٰ خوبیوں کی بنا کر برصغیر کے صوبے پنجاب میں تعینات کیا تھا۔ لائٹر خود لکھتے ہیں کہ پشاور کے شمال اور مغرب کی ریاستوں اور روس کی سیاسی حرکات و عمل پر پنجاب کے شہر لاہور سے نظر رکھی جاتی تھی۔ جب اُن کی لاہور تعیناتی کی گئی تو انھیں بتایا گیا کہ وہ مسلمانوں کے ہمدرد اور انگریزوں کے خیر خواہ کے طور پر یہاں کام کریں گے اور اپنی مقامی زباندانی کی صلاحیت اور اسلامی اقدار سے واقفیت کا بھرپور فائدہ اُٹھاتے رہیں گے۔ اِس تقرری میں اُنھوں نے اپنی اعلیٰ ترین علمی تحقیقی اور عالمانہ صلاحیتوں کا استعمال اپنی بہترین شاطرانہ طبیعت کے مطابق کیا۔ اُن کا تقرر لاہور میں

صوبہ پنجاب میں انٹیلیجنس حکام کی مشاورت سے لندن کے لال مینشن کے خفیہ اجلاس میں ملکہ عالیہ کی رضامندی کے ساتھ کر کے بھیجا گیا تھا تا کہ وہ تمام طرح کے فرائض کی انجام دہی تعلیم اور معاشرتی ترقی کے پھیلاؤ کی آڑ میں سرانجام دے سکیں، اُن کو صوبہ پنجاب میں صدر مقام لاہور کا انٹیلیجنس ڈائریکٹر یعنی ناظم بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اس خفیہ محکمے کا نام مدرسہ لاہور رکھا گیا۔ یاد رہے کہ اُس زمانے میں یعنی ۱۸۵۷ کے بعد کے برطانوی حکمرانی کے دور میں خفیہ ایجنسیوں کے نام اور اُن کے دفاتر کے نام ایسے انداز سے معروف کیے جاتے اور رکھے جاتے تھے کہ عام لوگوں کی نظر میں وہ غیر اہم ہو جائیں۔ مدرسہ لاہور ایک صوبائی تحقیقاتی خفیہ ایجنسی تھی۔ اس طرح اِس بات کو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ لاہور میں سپیشل برانچ کے دفتر کا عرفِ عام میں نام رابرٹ کلب تھا اور آج تک ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر کو اُن کے خفیہ اور قبائلی نام ملا عبدالرشید آفندی ہی کے جعلی نام مدرسہ لاہو خفیہ ایجنسی کے ناظم کی حیثیت سے تعینات کیا گیا تھا۔ یہ سرکاری خفیہ محکمہ، ملا عبدالرشید آفندی کی لاہور آمد کے ساتھ ہی قائم ہوا تھا۔ اندازہ ہے کہ اس ادارے کا نام بھی خود ملا عبد الرشید المعروف ڈاکٹر لائٹنر ہی نے اِس دلیل کے ساتھ تجویز کیا ہو گا کہ وہ یہاں بطور ماہر تعلیم اور فروغ تعلیم کے لیے کام کرنے والے تھے تو اُن کے اصل محکمہ جاسوسی کا نام بھی مدرسہ لاہور رکھا جائے۔ یہ بالکل وہی سٹریٹیجی تھی جو برطانوی حکام جاسوسی نے موجودہ دور کے طالبان کے لیے تیار کر کے نافذ کی ہے۔

ڈاکٹر لائٹنر ۱۸۶۴ میں لاہور پہنچے اور مدرسہ بھی ۱۸۶۴ میں قائم کیا گیا، جس کا مرکزی دفتر موجودہ پنجاب اسمبلی کے سامنے فاطمہ جناح روڈ کی پہلی عمارت میں تھا۔ بعد میں اُس عمارت کو فری میسن ہال کے نام سے یہودیوں کو اُن کی مذہبی تقریبات اور اجتماعات لیے قیامِ پاکستان سے قبل ہی دے دیا گیا۔ خیال ہے کہ اس عمارت کا مستقبل کے استعمال کے لیے فیصلے میں ڈاکٹر لائٹنر کی تجویز بھی شامل ہوگی۔

ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹر کے بارے میں مولانا مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی لکھتے ہیں، کہ وہ مغلوب الغضب اور سیماب مزاج تھے۔ ابتدا میں اُن کے تعلقات مولانا آزاد سے بڑے گہرے مشفقانہ اور دوستانہ تھے لیکن بعد میں انتہائی مخالفانہ اور نقصان دہ ثابت ہوئے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ مولانا آزاد کے ذہنی امراض اور نفسیاتی حالات میں ڈاکٹر لائٹر کا بڑا دخل تھا، جو مولانا آزاد کے مکاتیب سے ثابت ہوتا ہے۔

آغا محمد اشرف نے، مولانا محمد حسین آزاد کے سفر ترکستان کے سیاسی مشن پر ایک طویل عرصہ ضروری مواد ڈھونڈنے میں گزارا، جس کے نتیجے میں اُنھوں نے انیسویں صدی میں وسط ایشیا کی سیاحت کی تحقیق پیش کی۔ آغا محمد اشرف اپنے تحقیقی مقالے (مولانا آزاد ایک پروفیسر کی حیثیت سے) میں ڈاکٹر لائٹر کے مزاج اور شخصیت کے بارے میں انکشاف کرتے ہیں کہ ڈاکٹر اپنے سمرقند و بخارا کے سفر میں جو وہ آزاد کے سفر ترکستان سے پہلے کر چکے تھے، وہاں کے مسلمان علما سے کچھ ایسی تحریریں اور اسناد حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے جنھیں دکھا کر یہ اپنے آپ کو مسلمان عالم ثابت کر سکتے تھے۔ آغا محمد اشرف مزید لکھتے ہیں کہ ڈاکٹر لائٹر نے وسط ایشیا کے متعلق چند کتابیں لکھی تھیں۔ اُن میں اک بار فخریہ طور پر لکھتے ہیں کہ میں ملاوں کی وضع اختیار کر کے اُن علاقوں کا سفر کرتا تھا اور بہت سے سیاسی مشن اور مہمیں اس تبدیلی وضع کے طور پر انجام دے چکا تھا۔ آغا محمد اشرف کے مطابق ۱۸۶۵ مولانا آزاد نے سمرقند و بخارا کا سیاسی مشن انجام دیا تھا۔ اس میں بھی ڈاکٹر لائٹر کا ہاتھ تھا۔

مولانا آزاد کے ذاتی کاغذات میں ڈاکٹر لائٹر کی ایک تحریر ملی، جو انھوں نے انگریزی میں کسی ایجنٹ ملا نیاز محمد کو بطور ہدایت تحریر کی ہے اور اسی کے نیچے اس تحریر کا فارسی میں ترجمہ لکھا ہوا ہے۔ اُس تحریر کے آخر میں یہ الفاظ درج ہیں، جو ڈاکٹر لائٹر کے اصل چہرے سے نقاب اُٹھاتے ہیں، لکھا ہے کہ راقم ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹر المعروف بہ ملا عبدالرشید

سیاح ناظمِ اعلیٰ مدرسہ لاہور کے بکارِ خاص از جانب دولتِ انگلشیہ، بہ در ۱۸۶۶ بجانب کشمیر، تبت ولداخ، گلگت وغیرہ سفر و سیاحت کر کے مجھے رپورٹ کرو، مورخہ ۱۱ جولائی ۱۸۶۶۔

ڈاکٹر لائٹنر کے مزاج میں برہمی اور شعلہ مزاجی کی بے شمار مثالیں موجود ہیں، بہت سے تذکرے تو خود انھوں نے اپنے قلم سے لکھے ہیں، جن کی تفصیل اس موقعہ پر بیان کی جائے تو ایک باب رقم ہو سکتا ہے، اُن کا مزاج سخت، اور غصہ زیادہ تھا، جوشِ غضب میں وہ ہر چیز اور حکمت بھول جاتے تھے اور اپنی مخالفت میں کسی کی رائے کو ٹھہرنے نہیں دیتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے قیام کی تحریک میں اُنھوں نے بہت سے لوگوں کی مخالفت اور دشمنی مول لی مگر بعض سیاسی اور اعلیٰ برطانوی حکام کی ہدایات اور احکامات کی روشنی میں اُنھیں ہی پنجاب یونیورسٹی کا پہلا رجسٹرار بنایا گیا۔

انجمن پنجاب کے نظریہ میں ڈاکٹر لائٹنر کا پورا پورا عمل دخل تھا۔ انجمن کے جلسوں میں لاہور میں متعین انگریز افسران ابتدا ہی سے باقاعدگی کے ساتھ شریک ہوتے تھے، جن میں ڈاکٹر لائٹنر بھی شامل تھا، چونکہ در پردہ وہ لاہور کی خفیہ ایجنسی کے سربراہ تھے اس لیے اُن کی شرکت اور بھی لازمی اور اہم تھی۔ ۱۸۶۴ کے آخر میں اور ۱۸۶۵ کی ابتدا میں جب بدخشاں کے حاکم میر جہاں داد شاہ نے پشاور کے انگریز کمشنر کو یہ خط لکھا کہ روسی فوجیں آگے بڑھی چلی آ رہی ہیں اور کسی بھی وقت وہ بدخشاں اور کابل کو اپنی سلطنت میں شامل کر کے انگریزی حکومت کی عمل داری کے بالکل سر پر پہنچ سکتی ہیں تو یہ خطرے کی گھنٹی پشاور سے لاہور اور لاہور سے برکنگھم پیلس کے ایوانوں تک سنائی دیں اور اُس کی بازگشت جب واپس لاہور پہنچی تو سینٹرل ایشیا کے خاص حالات جاننے کے لیے یہ فیصلہ ہوا کہ ایک سیاسی مہم فوری طور پر اُس علاقے میں روانہ کی جائے۔ حکومتِ برطانیہ میں ملکہ عالیہ کے سیکرٹری برائے متحدہ ہندوستان سر سٹیفرڈ نارتھ کورٹ نے ہنگامی طور پر خفیہ ایجنسیوں کے سربراہوں پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی، جس کے سربراہ براہِ راست ملکہ برطانیہ کے سیکرٹری تھے اور یہاں

ہندوستان میں سات ایجنسیوں کے ساتھ سربراہان اُس کمیٹی کے ممبران تھے اور ذیلی ممبران الگ سے اپنی اپنی حد میں کام اور تحقیق پر لگائے گئے۔ خفیہ رپورٹ نمبر ۱۲۱ حکومتِ برطانیہ کے مطابق، مرکزی حکومت نے ذیلی ایجنسیوں کے سربراہوں کے مقامی حکام کو مہم تیار کرنے کے لیے آدمیوں کے انتخاب پر مامور کیا گیا۔ ڈاکٹر لائٹنر لاہور سے مدرسہ لاہور کے ناظم کے طور پر سرگرمِ عمل ہوئے۔ یہ بھی طے پایا کہ کل چار افراد کا انتخاب کیا جائے گا اور چاروں ایسے الگ الگ وطنوں، کاروباروں اور مزاجوں کے ہوں گے کہ ایک دوسرے کو بالکل نہ جانتے ہوں اور نہ ہی کبھی ایک دوسرے سے ملے ہوں اور نہ ہی ایک دوسرے سے بے تکلف ہوں۔ اُس مہم کا سربراہ بھی مقامی ہو مگر حکومتِ ہند کا خیر خواہ افسر ہو تا کہ وہ باقی لوگوں کو مقامی طور طریقے سے ہینڈل کرے۔ مرکزی انٹیلیجنس کے ساتھ سربراہوں نے یہ فیصلہ پنڈت من پھول کے حق میں دیا، جو لیفٹیننٹ گورنر پنجاب کے سیکرٹری، عہدے کے ایک نمک حلال افسر تھے، جن پر انگریز پورا پورا اعتماد کر سکتے تھے۔ علاقائی ایجنٹوں کے سربراہوں نے اپنے اپنے علاقے سے ایک ایک فرد کا انتخاب کیا۔ منشی فیض کا انتخاب پشاور کی خفیہ ایجنسیوں نے کیا، کرم چند مندرام کا انتخاب صوبہ بمبئی کی ایجنسی نے سندھ میں شکار پور کی تحصیل سے کیا اور مولانا آزاد کا انتخاب مدرسہ لاہور کی خفیہ ایجنسی کے سربراہ ملا عبد الرشید آفندی نے کیا اور خوب کیا۔ ڈاکٹر لائٹنر نے انجمنِ پنجاب کے جلسوں میں دیگر انگریز حاکمین اور اکابرین کے مشورے سے اُس مہم کے لیے بعض خوبیوں کی بنا پر قرعہ انتخاب محمد حسین آزاد کے نام ڈالا۔ ملا عبد الرشید کا یہ انتخاب کارگر بھی رہا۔ مولانا آزاد سے ملا آفندی نے آتے گہری دوستی علم و ادب کے نام پر پیدا کی اور مہم کے لیے مولانا کا انتخاب کیا، جس میں مندرجہ ذیل محرکات کی خاصی اہمیت تھی۔

مولانا آزاد کی شخصیت اور مزاج اور ذہانتوں میں ایسی زبردست اور ہمہ گیر خوبیاں تھیں جو اِس سیاسی مہم کے لیے سونے چاندی میں تولے جانے کے لائق تھیں۔ مولانا آزاد

دھیمے مزاج کے صبر و تحمل والے انسان تھے۔ اُن کے والد انگریزوں کے باغی تھے جس کا داغ آزاد کے دامن پر بھی بطور بیٹا اور صحافی موجود تھا۔ وہ ۱۸۵۷ کے مفرور بھی تھے اور اگر عام معافی نہ ہوتی تو یقیناً سزائے موت کے حقدار ٹھہرتے۔ آزاد کا دل ملک وقوم کے لیے ہر دم بے چین اور فکر مند رہنے والا دل تھا۔ وہ ۱۸۵۷ کے بعد اپنی دہلی کی وسیع وعریض جائداد، کاروبار، گھر بار اور اثاثے بطور باغی گنوا چکے تھے۔ وہ بحق سرکار ضبط ہو چکے تھے، وہ مفلوک الحالی کی حالت میں بے وطن اور نا اُمید تھے، وہ ذہین دانشور تھے اور سوجھ بوجھ کا خصوصی معاشرتی ادراک رکھتے تھے، صاحب علم تھے، دہلی کالج کے تعلیم یافتہ اور ذہین ترین طالب علم رہ چکے تھے۔ تصنیف وتالیف میں پورا پورا ادراک رکھتے تھے۔ باریک بین تھے۔ ملک کی ترقی اور خوش حالی کے خواہشمند تھے۔ پرانے صحافی تھے اور بطور صحافی، بہت باریک سیاسی اور معاشرتی حالات کا تجزیہ کرنے کا وسیع تجربہ دہلی اردو اخبار کے حوالے سے رکھتے تھے۔ باریک بین باشعور اور صاحب نظر دانشور تھے۔ یہ تمام خوبیاں مولانا میں اپنی جوانی میں اُن دنوں پوری آب وتاب سے موجود تھیں۔

جب ۱۸۵۷ کی آوارہ وطنی کے دوران مولانا آزاد جگراوں میں روپوش تھے تو ایک مرتبہ ایک بوڑھے شخص کو دیکھا کہ لاچار اور معذور بیٹھا ہے اور اپنے گھر جانے سے عاجز ہے۔ مولانا آزاد نے اُسے اپنی پیٹھ پر سوار کیا اور گھر تک چھوڑ کر آئے۔

جبکہ اِس جان لیوا سیاسی مہم سینٹرل ایشیا کے لیے اُن کا انتخاب کرنے والا شخص ڈاکٹر لائٹر آزاد کے مقابل ایک ایسا شخص تھا کہ جب وہ بطور سیاح در پردہ جاسوس سکردو پہنچا تو معلوم ہوا کہ ایک انگریز کاؤویز جاسوس کو ٹولٹی کے مقام پر مقامی قبائل نے جاسوس ثابت ہونے پر قتل کر کے جلایا اور دفن کر دیا ہے تو ڈاکٹر لائٹر کو بہت غصہ آیا۔ اُس نے اپنے آدمی کی قبر کشائی کرائی اور اُس کی تین ماہ پرانی لاش کا پنجر نکلوا کر ایک چارپائی نما تابوت میں رکھا اور لاہور لایا اور بہت سے لوگوں کو خرید کر اپنے ساتھ شامل کیا اور ایک جلوس بنا کر لاہور کے

گورنر ہاؤس کے مرکزی گیٹ پر مع لاش کے پہنچا اور تین دن تک گورنر ہاؤس کے دروازے پر لاش رکھ کر خود وہاں بیٹھا رہا اور مطالبہ کرتا رہا کہ وہاں کے لوگوں کو ایک انگریز کے قتل کے جرم میں زن و بچہ کولھو کر کے فوری سزا دی جائے۔

جب ملا عبدالرشید آفندی عرف ڈاکٹر لائٹنر نے اس مہم کے لیے آزاد کا انتخاب کر لیا تو وہ ان کو لے کر شملہ پہنچے۔ وہاں ملک کی انٹیلیجنس اور انتظامیہ کے دیگر حکام بھی موجود تھے۔ وہاں پہنچ کر ڈاکٹر لائٹنر نے مولانا کو شملے آنے کی اصل وجوہات سے مطلع کیا، کہتے ہیں کہ آزاد نے سارا مقصد سُن کر صاف انکار کر دیا۔ پھر بھی مولانا آزاد کو لے کر ڈاکٹر لائٹنر اُس خفیہ اجلاس میں پہنچے جس میں خفیہ رپورٹ سرکار انگلشیہ کے سات اعلیٰ خفیہ عہدے دار موجود تھے، جن میں جان لارنس، ڈبلیو فیر فیلڈ، ایچ ایس مائن، جی ایل ٹیلر، ڈبلیو این میس، ایچ ایم ڈیورنٹ اور جی یو یول بھی موجود تھے۔ اس خفیہ اجلاس میں مولانا کو وسط ایشیا کی مہم کی مختصر ابتدائی صورت حال سے مطلع کیا گیا۔ ملا عبدالرشید آفندی بھی آزاد کے ساتھ موجود تھے اور آزاد پر اُن کی کڑی نظر تھی، مہم کا راز مولانا کو بتا دیا گیا تھا، جس کے ساتھ ہی یہ بھی باور کرا دیا گیا تھا کہ ساتھ دو ورنہ مارے جاؤ گے، کیونکہ ہم نے تمھارا انتخاب کر کے تمھیں اپنا خفیہ پلان بتا دیا ہے۔ مولانا آزاد گہری سوچ میں غرق ہو گئے۔ ڈاکٹر لائٹنر نے اُس خفیہ میٹنگ کے بعد آزاد کو بہت سمجھایا، محققین کی رائے ہے کہ یہ بھی سمجھایا ہو گا کہ یہ پیشکش نہایت مفید اور با موقع ہے۔ اس مہم کو کرنے سے آزاد پر لگا یا گیا ۱۸۵۷ کے مفرور باغی کا داغ بھی دُھل جائے گا اور ہو سکتا ہے کہ بخیر و عافیت وطن واپسی ہو گئی تو انگریزوں کی خوشنودی بھی حاصل ہو جائے گی اور نوازے بھی جائیں گے۔ آزاد خموشی سے سنتے رہے اور اُنھوں نے اتنا دباؤ ذہن پر لیا کہ گم سم ہو گئے، جس کے ثبوت مولانا آزاد کی وارفتگی کی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں۔ اُن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ یا اللہ اس انگریز دوست کی دوستی اور خلوص پر اعتماد کیا، ہمدرد سمجھا اور یہ کیا نکلا اور آزاد کو کہاں

لا پھنسایا۔ آغا محمد اشرف اس موقع پر یہ بھی لکھتے ہیں:

"کیا آزاد نے یہ بھی سوچا ہو گا کہ اس مہم کی سیاسی اور خفیہ مہموں پر انسان اپنا سر ہتھیلی پر لے کر نکلتا ہے اور اگر میں مخبری یا جاسوسی کے الزام میں گرفتار ہو گیا تو حکومتِ ہند میری کوئی مدد نہیں کرے گی۔ پھر آزاد ابھی چند دن پہلے دو برطانوی افسروں، کرنل سٹیورڈ اور کیپٹن کنولے کی بخارا میں گرفتاری اور قتل کے قصے بھی سُن چکے تھے، جو کافی مشہور ہوئے تھے۔ مولانا آزاد کو یہ بھی معلوم تھا کہ برطانوی حکومت کی کوششوں کے باوجود دونوں افسروں کی جان نہیں بچ سکی تھی"۔

آغا محمد اشرف یہاں پر یہ قیاس بھی ظاہر کرتے ہیں کہ ڈاکٹر لائٹنر جو گورنمنٹ کالج لاہور کے پرنسپل کی حیثیت سے ۱۸۶۴ میں لاہور آئے تھے اور انجمنِ پنجاب کے صدر اور بانی تھے۔ انھیں وسط ایشیا کی سیاحت سے دلچسپی تھی اور خود بھی انھوں نے کئی مرتبہ ملا عبد الرشید کے نام سے ہندوستان کی شمال مغربی سرحدوں کا سفر کیا تھا۔ آغا محمد اشرف کے قیاسات آج بالکل درست ثابت ہوئے ہیں کہ جب اس سیاسی خفیہ مہم کی اصل دستاویز بطور رپورٹ میرے سامنے موجود ہیں، جس میں بطور خفیہ رپورٹ نمبر ۱۳۱ برٹش گورنمنٹ کے صفحہ نمبر ایک کے پیرا نمبر تین پر صاف لکھا ہے کہ

پنڈت من پھول (ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر) اور میر منشی (سیکریٹریٹ آفس) جنھوں نے اپنے گزشتہ چند سال اور مخصوص کاوشوں کو وسط ایشیا اور مشرقی ترکستان کی تاریخ، وسائل اور تجارت کے بارے میں بالکل صحیح اطلاعات کے حصول کے لیے مختص کیا ہوا تھا، نے اپنے تین ماتحتوں کے ساتھ (برطانوی سرحدوں سے متعلق) وصول شدہ احکامات کی تعمیل میں یہ اطلاعات ممکنہ حد تک درستی کے ساتھ فراہم کرنے کے لیے اپنے آپ کو اور ساتھیوں کو رضا کارانہ طور پر پیش کیا (جہاں تک اُس علاقے کے حالات اجازت دیتے ہوں)

خفیہ رپورٹ کے اس پیرے کا آخری جملہ بتاتا ہے کہ برطانوی حکومت اِن لوگوں کی

ہر طرح کی ذمہ داری لینے سے مبرا تھی۔ یہ لوگ خود سے رضا کارانہ طور پر اپنے آپ کو پیش کر چکے تھے۔ وہ اپنی ذاتی خواہش پر اس مہم کو جانے کو تیار ہوئے تھے۔ حکومتِ ہند کا اُن کے اس عمل سے کوئی خاص لینا دینا نہیں تھا اور نہ ہی تعلق تھا۔ آپ خود سوچیے کہ جس مہم میں مہم جوؤں کی جان جانے کا سو فیصد خطرہ ہو، اُس مہم پر یا تو کوئی مجبور اور بے کس آدمی جائے گا بلکہ دھکیلا جائے گا یا پھر پروفیشنل سرکاری تجربہ کار اہل کار، جیسا کہ اُس مہم کا ایک رکن منشی فیض بخش جس کا اصل نام کریم الدین تھا، گیا، جو حکومتِ برطانیہ کا قدیمی ایجنٹ تھا۔ جس کا بطور نمک خوار ایجنٹ نام قدیم سرکاری خفیہ دستاویزات اور پنجاب آرکائیوز کی بوسیدہ فائلوں میں آج بھی آسانی سے ملتا ہے۔

سینٹرل ایشیا کی خفیہ سیاسی مہم کی وہ دستاویزات، جو انڈیا آفس لائبریری سے ایک مکمل خفیہ رپورٹ کی شکل میں دریافت ہوئی ہیں اور میرے پاس موجود ہیں اور اُن کے مطالعے اور مولانا آزاد کی ذاتی دستاویزات، جو اُنھوں نے سینٹرل ایشیا کی خفیہ مہم کے دوران بطور یادداشت لکھیں جو میرے پاس بطور شہادت محفوظ ہیں، اُن کے مطالعے اور بعض موازنوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر مولانا آزاد اُس مہم کا بنیادی پلان اور طریقہ عمل شملے میں سُننے کے بعد انگریز سرکار کو انکار کر دیتے تو یقیناً راز کے افشا ہو جانے کے خطرے سے خفیہ والوں کے ہاتھوں قتل ہو جاتے۔ اس صورتِ حال میں مولانا کے پاس دو ہی راستے تھے، اول وہ انکار کرتے اور قتل ہو جاتے، دوسرے یہ کہ وہ اس مہم پر اللہ توکل نکل جائیں اور انگریزی خفیہ اداروں کا ساتھ دیں جیسے وہ کہتے ہیں کرتے چلے جائیں کیونکہ وہ رازداری کے جال اور خفیہ مافیا میں پوری طرح پھنس چکے تھے۔

آزاد کو یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ اُس سے قبل ایک سو تین مہمیں اس تحقیق کے لیے حکومت برطانیہ سینٹرل ایشیا میں روس کی عمل داری میں بھیج چکی ہے اور اس میں حوصلہ شکن بات یہ تھی کہ ایک سو تین میں سے ایک سو تین مہموں کے تمام افراد قتل کر دیے گئے۔ کوئی بھی بچ کر نہیں

آیا تو میرا خیال ہے کہ آزاد نے سوچا ہوگا کہ مارے تو ہر دو صورتوں میں جانا نصیب میں لکھا گیا ہے، کیوں نہ سفر کیا جائے۔ اگر انکار کرتے تھے تو انگریز حکام قتل کر دیتے۔ یعنی اُن کی سمجھ میں یہ آیا کہ آزاد زندگی تو داو پر لگ ہی چکی ہے، ہر دو صورتوں میں قتل واجب نظر آتا ہے تو کیوں نہ سیاحت کے سفر کو ترجیح دی جائے۔ انگریزوں کے ہاتھوں سے قتل ہونے سے بہتر ہے کہ دیارِ غیر میں مارا جاوں، باقی اللہ مسبب الاسباب ہے۔ اگر قسمت نے ساتھ دیا اور بچ گئے تو سبحان اللہ اور اگر مارے گئے تو یا نصیب۔ مولانا آزاد پانچ دن شملے میں رہ کر ایک سرائے کے کمرے میں بند ہو گئے۔ اس دوران وہ نہ تو ملا عبدالرشید آفندی سے ملے اور نہ ہی انگریز حکام سے۔ آخر پانچویں روز اُنھوں نے اپنے رابطہ افسر ملا عبدالرشید آفندی کو بتایا کہ میں تیار ہوں۔ میں سینٹرل ایشیا کی سیاسی مہم پر جاوں گا۔ یقیناً اُن کو ہدایت کی گئی ہوگی کہ زبان بند رکھنا اور کبھی نہ کھولنا مگر یہ زبان اُس مہم سے بخیریت واپسی کے چار سال بعد ۱۸۷ میں آزاد نے اِن الفاظ کے ساتھ ڈاکٹر لائٹنر کو ایک خط میں کھول دی،،، لکھتے ہیں:

''وہی آزاد بندۂ احسان، قیدی بے زنجیر''

اِس جملے کا مطلب ڈاکٹر لائٹنر بخوبی سمجھ گئے ہوں گے پھر اُسی خط میں دل کا پورا غبار نکالتے ہیں اور اگلا پچھلا تمام کچا چٹھا کھول کر رکھ دیتے ہیں،، لوگ سمجھتے ہیں کہ آزاد سنین اسلام کی باتیں کر رہے ہیں مگر یہ اُس خط کا ایک الگ اور آخری یک سطری جملہ اہم ترین ہے، اِس خط میں آزاد بے قابو ہو چکے تھے۔ اُن کی زبان رمز و کنایہ میں وہ باتیں کہہ رہی تھی جو صرف آزاد جانتے تھے اور ڈاکٹر لائٹنر سمجھتے تھے۔ گویا یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ خفیہ ایجنسی لاہور کے سربراہ ناظم مدرسہ لاہور کے اُن جملوں اور اُن کے معانی کو بخوبی اور ٹھیک سمجھ رہے ہوں گے۔ اِن جملوں کے بین السطور مولانا آزاد کے وہ تمام دکھ پوشیدہ ہیں جو وہ گزشتہ پانچ برس کی زبان بندی کے سبب نہیں کہہ سکے تھے۔ یہیں پر مولانا یہ اقرار بھی کرتے ہیں کہ تم چاہتے تو مجھے قتل بھی کروا سکتے تھے آزاد لکھتے ہیں:

(خیر جو کچھ کیا اچھا کیا، مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں کیونکہ جو سنتا ہے افسوس کرتا ہے)

(اگر دشمنوں کے ہاتھ میں مجھے خاک میں ملوا دیں تو مجھے افسوس نہیں کیونکہ میرا فکر تنخواہ، کرسی اور عہدے پر نہیں)

مَیں اِس خاک پر بیٹھا آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا افسوس کرے گا، یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا)

> ''اگر قتل بھی ہو جاوں تو جو کچھ اب تک لکھ چکا ہوں یہ خلق و عالم کے رلانے کے لیے کافی ہے۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ بموجب اپنے وعدے کے جاوں گا اور سینہ چیر کے دکھاوں گا کہ کتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے یہ زخم بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں۔ انھی جملوں کی تشریح عالمِ وارفتگی کے ایک رسالے سمیکا ولیما کے صفحہ نمبر ۹۳ پر اِن جملوں میں کرتے ہیں،، دیکھ ہم اُسے بچاتے رہے ہیں فرنگ اُس کی جان پر ہماری قدرت کا امتحان لے رہے ہیں اور قتل اور موت اُس کی (پروفیسر آزاد) قتل اور موت، ہم اُسے بچا رہے ہیں، ہم پروفیسر آزاد کو دے رہے ہیں''۔

غرض ہندوستان میں خبریں گردش میں آئیں کہ روس ہندوستان پر حملہ کرنے کا خیال کر رہا ہے، جس کے لیے اُس نے بہت اقدامات کر رکھے ہیں اور مزید کر رہا ہے۔ چونکہ خبریں طرح طرح کی اور گوناگوں داستانوں سے بھری تھیں جس میں حقیقت اور افسانے کی ایسی آمیزشیں ہوتیں کہ اصل کہیں بیچ میں الجھ ہو چکی ہوتی اور کچھ پتا اصل کہانی کا نہ لگتا۔ یعنی افسانے سے حقیقت کو جدا کرنا ناممکن ہو جاتا تھا۔ اِس سب کچھ کو جاننے کے لیے برٹش گورنمنٹ وسط ایشیا اور ایران میں اپنے جاسوس بھیجتی رہتی تھی اور ستم یہ کہ وہ جاسوس خال ہی

بچ کر آتے تھے۔ وہیں دھر لیے جاتے اور سیدھے مذبح کے حوالے ہو جاتے جہاں اُن کے ایک کو دو حصوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ اِدھر جب گورنمنٹ کو اپنی سیاسی ضرورت کے تحت ایک جاسوسی وفد کے ترتیب دینے کی ضرورت پڑی، جو وسطی ایشیا کا سفر کر سکے اور وہاں کے حالات کی خبر بہم پہنچا سکے تو سرکار نے اُس کے مطابق اقدامات کیے۔ چونکہ پنجاب خفیہ ایجنسی کا سربراہ ڈاکٹر لائٹر تھا اس لیے یہاں سے یہ کام اُس کے سپرد تھا۔ اِس کام کا آغاز یوں تھا کہ ۱۸۶۵ء میں حکومت ہند کی طرف سے ایک جماعت ترتیب دی۔ یہ چار افراد پر جمع تھی اور کام اِس کا مفرد تھا۔ یہ جماعت کچھ سیاسی اور کچھ قیاسی معلومات پہنچانے کی غرض سے سنٹرل ایشیا کی سیاحت کے لیے بھیجی گئی۔ مولانا آزاد اس کے اراکین میں قید تھے یعنی وہ اِن چار میں سے ایک تھے۔ چاروں افراد کا ایک دوسرے سے کچھ جان بوجھ رکھنا ضروری نہ تھا، سب بیگانے تھے۔ پنڈت من پھول اِس جماعت کے سرگروہ تھے اور آزاد درگروہ تھے۔ چاروں ہندوستان کی سرحد تک ملے رہے، مگر جیسے ہی ہند سے نکلے، آپس میں بکھر گئے اور فرد فرد ہو گئے۔ آزاد نے اپنا راستہ الگ کیا۔ وسط ایشیا اِن کے زیرِ پا تھا اور مُلک یہ بہت دُور تک ناتگاہ تھا۔ مولانا سینٹرل ایشیا میں ایسے پھیل گئے، جیسے چمنِ شب میں نور پھیل جاتا ہے۔ دو سال تک سنٹرل ایشیا کے ممالک کی خاک چھانی اور وہاں کی سیاسی اور معاشرتی حالات کا معاملہ سمجھا اور اُس کی صورت کا بیانیہ گاہ گاہ سے جمع کیا اور ذہنِ رسا کے دفتر میں لکھ لیا۔ دو سال کچھ ایسی خود گم کردگی میں گزرے کہ کسی کو کسی کے حال کی خبر نہ تھی۔ پیدل، سواری پر، غرض جس طرح بھی ہو سکا سفر کیا۔ آخر دو سال کے بعد واپس آئے اور رپورٹ پیش کی۔ کہا جاتا ہے آزاد نے یہ معلومات اپنی جان خطرے میں ڈال کر حاصل کی تھی۔ گورنمنٹ نے اِس سفر کے لیے مولانا کو کس واسطے منتخب کیا، اِس کی اُوپر آغا سلمان باقر کے مضمون میں تمام وجوہات درج ہیں، ہم اُنھیں مختصراً لکھ کر درج کر دیتے ہیں۔ اول مولانا گورنمنٹ کی طرف سے معافی شدگان میں سے تھے۔ خاندان اُن کا تمام نگاہ میں تھا اور سہما

ہوا تھا اور گورنمنٹ کی طرف سے کسی بھی قسم کی سختی کے لیے جواز پہنچ چکا تھا۔ گورنمنٹ کا آزاد کو سزا دینے کے واسطے زیادہ عذر و معذور ہونے کی ضرورت نہ تھی اور یہ بات آزاد بخوبی جانتے تھے۔ دوئم پڑھے لکھے ہونے کے ساتھ خبر اخبار سے تعلق رہا تھا، وہ جانتے تھے کون بات اہم ہے اور کون غیر اہم۔ سوئم ایک ایسی بے نیازی اور سخت طلبی مولانا کے اندر موجود تھی، جو ایسے سخت حالات میں نرم طبیعت برداشت نہیں کر سکتی تھی جسے ڈاکٹر لائٹر خوب جانتا تھا۔

مولانا کے اِس سفر میں سے کچھ واقعات احباب کی طبع ظرافت کو پیش ہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ:

''مولوی امیر بخش صاحب جو مولانا کے شاگرد ہیں اور ابھی بقید حیات ہیں، مولانا کی زبانی روایت کرتے ہیں کہ افغانستان کی سرحد پر مولانا کو افغانوں نے پکڑ لیا اور کہا تم جاسوس ہو اور ہمارے ملک میں جاسوسی کرنے آئے ہو اس لئے ہم تم کو قتل کریں گے۔ ہزار منتیں کیں اور یقین دلایا کہ میں جاسوس نہیں ہوں، لیکن اُنھوں نے ایک نہ مانی۔ آخر کار ان منچلے افغانوں نے یہ تو مان لیا کہ تم جاسوس نہیں ہو، لیکن تم کافر ہو اور ہمارے ملک میں کافر کی سزا قتل ہے۔ مولانا نے ہر چند یقین دلایا کہ میں کافر نہیں ہوں، مسلمان ہوں۔ قرآن کی آیات پڑھیں، نماز سنائی، لیکن کسی نے نہیں مانا اور اس بات پر اڑے رہے کہ تم کافر ہو اور تم نے دھوکا دینے کے لیے نماز اور آیتیں وغیرہ یاد کر لی ہیں۔ آخر مولانا نے پوچھا خدا کے لیے تم یہ بتاؤ کہ تمھیں کیسے یقین آسکتا ہے کہ میں مسلمان ہوں اور کافر نہیں ہوں۔ وہ سب سوچ میں پڑ گئے۔ آخر ان میں سے ایک شخص جو کسی قدر زیادہ سمجھدار تھا، بولا کہ یہ دیکھ لو کہ یہ شخص مختون بھی ہے یا نہیں۔ اگر مختون ہے تو مسلمان ہے ورنہ کافر۔ اس فیصلے کو سب نے تسلیم کیا، جس

سے ثابت ہو گیا کہ مولانا مسلمان ہیں اور جان بچ گئی"۔

بدخشاں کی جوئیں:

"جب مولانا آزاد سفارتی مشن پر روانہ ہوئے تھے تو اپنے اہل و عیال کو (دہلی میں) اپنی سسرال کے گھر چھوڑ گئے تھے۔ چنانچہ اس سفر سے واپس ہوئے تو سیدھے دہلی آئے۔ میری والدہ بیان کرتی ہیں اور انہوں نے میری دادی کی زبانی سنا ہے کہ جب مولانا دہلی پہنچے تو عجب حالت تھی۔ پہچانے نہ جاتے تھے۔ لباس اور طرح وضع سے بالکل درویش اور قلندر معلوم ہوتے تھے۔ جب انہوں نے اپنا سفری لباس اتارا تو وہ ایک دیوار پر ڈال دیا گیا۔ کہتے ہیں اس پر ان کپڑوں میں کابل و بدخشاں کی اس قدر بڑی بڑی جوئیں تھیں کہ وہ تھوڑی سی تمازت آفتاب سے باہر نکل پڑیں اور ساری دیوار بلا مبالغہ سیاہ ہو گئی"۔

مولانا نے وسط ایشیا میں آٹھ مہینے قیام کیا بلکہ آوارگی کی۔ اس آوارگی میں اُن کے قلم سے خفیہ رپورٹوں کے علاوہ اکثر سخن دان فارس کے لعل موتی نکلے ہیں۔ سخن دانِ فارس اگرچہ ایران کے احوال و زبان پر مبنی کتاب ہے اور نثر کا ایسا عمدہ پارہ ہے کہ کوئی بے تہہ ایسا کیا لکھے گا۔ دریائے آموں اور جیحوں پار کے قصبے جو کچھ موسم کے اور شہروں کے اُنھوں نے دیکھے ہیں وہ گاہے گاہے ایران کے موسم کے احوال میں درج کر دیے ہیں اور بعض جگہ دربار اکبری میں نقش فرما دیے ہیں۔ مثلاً آغا اشرف نے ایک کتاب مرتب کی ہے جو مولانا محمد حسین آزاد کے وسط ایشیا کے سفر کی رپورٹ سے اخذ کی گئی ہے اور اُس کا نام اُنھوں نے (وسط ایشیا کی سیاحت) رکھا ہے۔ مَیں نے جس قدر اِس کا مطالعہ کیا ہے، مولانا نے اِس علاقے کے متعلق بہت نایاب معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ وسط ایشیا سے واپس آنے کے بعد مولانا قدرے پانچ سال تک ڈائریکٹر تعلیمات کے آفس سے وابستہ رہے۔ ڈائریکٹر تعلیمات کے آفس کی عمارت اُن دنوں وہیں تھی جہاں مال روڈ پر ٹولنٹن مارکیٹ کے

بالمقابل ابھی تک موجود ہے۔ یہ جگہ تب مال روڈ کی مرکزی حیثیت کی حامل تھی۔ انارکلی، ٹولنٹن مارکیٹ، عجائب گھر اور جنرل پوسٹ آفس سب یہیں آس پاس واقع ہیں۔ بعد میں اس کے ساتھ ہی پنجاب یونورسٹی کے شعبہ اور ینٹل کالج کی بنیاد بھی اسی جگہ کے قُرب میں رکھی گئی، جس کے لیے نواب آف بہاولپور نے گرانقدر عطیہ دیا۔ تب پنجاب یونیورسٹی کے متعلق مولانا آزاد کا ایک جملہ بہت مشہور ہوا تھا کہ یہ ایسی ڈائن ہے جو سب کچھ کھا جائے گی۔ اگر آج اس جملے کو دیکھیں تو یہاں کی تعلیمی صورت حال پر عین صادق آتا ہے۔ یہ دور مولانا محمد حسین آزاد کے لیے ایک طرف معاشی طور پر فراغ البالی اور دوسری طرف ترقی کا تھا۔ آپ یوں سمجھ لیں وسط ایشیا کی سیاحت مولانا کے لیے آگ اور برف کے پُل صراط تھے، جنھیں دو سال کے دورانیے میں عبور کر کے وہ یہاں تک پہنچے تھے، اصل میں دیکھا جائے تو اُن کی معافی کا اصل پروانہ وسط ایشیا کی سیاحت ہی سے بندھا تھا، جس کی مہر ڈاکٹر لائٹنر کے پاس تھی۔

سیکھیے غیروں کے ہاں چھپ چھپ کے علم تیر پھر
سارے عالم میں ہمارے تئیں نشانہ کیجیے

مولانا آزاد گورنمنٹ کالج لاہور میں

مولانا محمد حسین آزاد وسط ایشیا کی مہم سے لوٹنے کے بعد حکومت کی نظر میں اب باغی کی جگہ وفادار ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے دہلی میں جا کر اپنی رپورٹ پیش کی اور وہیں اپنے سسرال کے ہاں کئی دن تک آرام کیا۔ بہت دنوں کے بعد بیوی اور کنبے کو لے کر لاہور چلے آئے، یہاں مولانا نے مکرر ڈائریکٹر تعلیمات کے دفتر میں کام شروع کر دیا۔ مولانا کا عہدہ بھی بڑھا دیا گیا اور اُنھیں ایک کلرک سے افسر کی حیثیت دے دی گئی۔ اُنھوں نے مزید یہ کیا کہ اردو ریڈریں تیار کرنے کا جو کام دیا گیا تھا اُسے بھی باحسن انجام دینے لگے۔ اِس کے ساتھ ہی مولانا کا رابطہ ڈاکٹر لائٹنر سے باقاعدہ رہا۔ یہاں تک کہ گورنمنٹ کالج اپنی ارتقائی منازل طے کرتے ہوئے ۱۸۷۰ میں داخل ہو گیا اور ڈاکٹر لائٹنر اُس کے پرنسپل مقرر تھے۔ ڈاکٹر لائٹنر کا گورنمنٹ کالج میں بطور پرنسپل تقرر آزاد کے لیے ایک نیا راستا کھولنے کے مترادف تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر مولانا کی قابلیت، لیاقت اور تعلیمی استعداد بخوبی جانتا تھا۔ پھر یہ بھی تھا کہ وہ مولانا کو مکمل طور پر اپنی نگاہ میں رکھنا چاہتا تھا تا کہ کسی بھی طرح اُن کے کام کا پردہ چاک نہ ہو۔ اِس کے علاوہ ڈاکٹر لائٹنر کو جس قدر علوم شرقیہ سے دلچسپی تھی، وہ مولانا کی مصاحبت اور تعاون میں بہت آسانی سے اُس کے مطالعہ میں آتی، اِن تمام وجوہات کے ساتھ ساتھ لائٹنر نے ایک اور کام مولانا سے نکلنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا کہ اُن سے مختلف

علوم پر کتب لکھوا کر انھیں اپنے نام سے چھپایا جائے۔ جیسا کہ سنین اسلام کے بارے میں تمام جانتے ہیں کہ یہ مولانا محمد حسین آزاد کا ہی ذہنی پارچہ تھا۔

گورنمنٹ کالج کا اجرا ۱۸۶۱ میں ہوا اور اس سال آرٹس میں اس کا الحاق کلکتہ یونیورسٹی سے ہوا۔ شروع میں یہ کالج راجہ دھیان سنگھ کی حویلی کے ایک حصے میں کھولا گیا۔ دھیان سنگھ کی حویلی اندرون لاہور میں ہے۔ اور اب ایک مکمل کھنڈر ہے۔ چھتیں اور صحن اور دیواریں برباد ہو چکی ہیں اور بے آباد ہو چکی ہیں۔ جب آپ مستی دروازے سے سیدھا جنوب کی طرف اُوپر چڑھتے ہیں تو ایک گلی چھوڑ کے دوسری گلی میں دائیں ہاتھ کو مڑ جائیں۔ یہ گلی ایک ٹیلہ نما اُنچائی کی طرف کافی اوپر تک چڑھتی ہوگی۔ چند ہی قدم پر آگے ایک بہت بڑا گیٹ آتا ہے۔ یہ لکڑی کا دروازہ ہے۔ اس کے تختے اب کہیں زمانوں کی راہوں میں کھو چکے ہیں۔ اس کُھلے دروازے کے اندر ایک کمرا ہے، جس میں ایک گلی سامنے نکلتی ہے اور دوسری بائیں ہاتھ کے ایک اور دروازے میں کھلتی ہے۔ یہ دروازہ پار کریں تو سامنے دھیان سنگھ کی حویلی ہوگی۔ جس میں ایک بڑے صحن کے اندر ایک پیپل اور دو نیم کے پیڑ بھی کھڑے ہیں۔ یہی گورنمنٹ کالج کی پہلی عمارت تھی۔ ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر اس کے پہلے پرنسپل مقرر ہوئے جو اُس وقت کنگز کالج فرائیبرگ یونیورسٹی میں عربی اور محمڈن لا کے پروفیسر تھے۔ کالج کی پہلی کلاس صرف ۹ طلبہ پر مشتمل تھی اور وہ سب کلکتہ یونیورسٹی کے میٹریکولیٹ تھے۔ اپریل ۱۸۷۱ میں کالج انارکلی کی ایک بڑی کوٹھی میں منتقل ہوا۔ یہ نوخیز کالج جو آگے چل کر اپنی مخصوص اور عظیم روایات کا حامل بننے والا تھا۔ ۱۸۷۲،۷۳ میں کوٹھی رحیم خان میں جہاں وسٹری کالج ہے اور ۱۸۷۶ میں موجودہ عمارت میں جو اُس وقت نامکمل تھی میں انتقال پذیر ہوا۔ مولانا کب گورنمنٹ کالج سے منسلک ہوئے، تاریخ گورنمنٹ کالج اس سلسلے میں خاموش ہے۔ دوسرے ماخذ سے بھی اس کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔

گورنمنٹ کالج میں بطور پروفیسر محمد حسین آزاد کی تقرری کے بارے میں ڈاکٹر عبد

الحمید یزدانی لکھتے ہیں:

''تاریخِ گورنمنٹ کالج میں مولانا کا ذکر پہلی مرتبہ ۷۵-۱۸۷۴ کے تعلیمی سال کے ذیل میں ایک طالب علم کی زبانی ملتا ہے۔ مولانا محمد شفیع مرحوم نے مولانا آزاد کے ایک پوتے، آغا محمد باقر ایم اے بی ٹی سے شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد کے عنوان سے ایک مقالہ لکھوایا تھا جو راوی اور اورینٹل کالج کے میگزین کے کسی شمارے میں شائع ہوا تھا۔ یہ تفصیلی مضمون بقول شفیع مرحوم آغا صاحب نے خاندانی روایتوں اور متفرق یادداشتوں سے مرتب کیا تھا۔ اس میں اُنھوں نے کالج سے مولانا کی وابستگی کا سال غالباً ۱۸۷۰ لکھا ہے۔ ایک اور نبیرہ آزاد آغا محمد اشرف نے بھی اپنے کتابچے ''مولانا آزاد ایک پروفیسر کی حیثیت سے'' میں ۱۸۷۰ ہی لکھا ہے لیکن ساتھ ہی یہ عبارت بھی ہے کہ اُس وقت کالج اپنی زندگی کے ۸ سال پورے کر چکا تھا اور جیسا کہ پہلے بیان ہوا ہے کالج ۱۸۶۴ میں کھل چکا تھا، پھر اسی کتابچے کے سرورق پر ۱۸۷۲ تا ۱۸۷۰ لکھا ہوا ہے۔ اس لحاظ سے مولانا کی پروفیسری کا آغاز گویا ۱۸۷۲ سے ہوا لیکن نقوش لاہور نمبر صفحہ ۶۸۸ میں کالج کے ذکر میں ہے۔ ۱۸۷۱ میں کالج کو انارکلی کے قریب ایک بلڈنگ میں منتقل کیا گیا۔ تین سال کے بعد مولانا آزاد کا تقرر عمل میں لایا گیا جنھوں نے کالج کے نام کو آسمانِ شہرت پر پہنچا دیا۔ اس لحاظ سے آغاز ملازمت کا سال ۱۸۷۴ بنتا ہے۔ اب ذرا اردو دائرہ معارف اسلامیہ سے رجوع کرتے ہیں ، اس کے مطابق پانچ جولائی ۱۸۶۹ کو مولانا آزاد کا تقرر گورنمنٹ کالج میں عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کے طور پر ہوا۔ مکاتیب آزاد کے مرتب نے حواشی میں جگہ جگہ مولانا کی ملازمت کا سال ۱۸۷۰ لکھا ہے لیکن کتاب کے آغاز میں مولانا آزاد کی زندگی کے تحت ۱۸۷۲ دیا ہے۔ این چہ بوالعجبی است۔ اِس اختلافِ سال کو ختم کرنے اور گورنمنٹ کالج سے آزاد کی وابستگی کی صحیح تاریخ جاننے کے لیے جب کالج کے دفتر سے رجوع کیا گیا تاکہ اس ضمن میں آزاد کی پرسنل فائل کو کھنگالا جائے تو ہیڈ کلرک عبدالحمید صاحب کی زبانی یہ جان

کرچنی کووقت ہوئی کہ مولانا آزاد اور علامہ اقبال کے علاوہ بعض اور حضرات کی بھی فائلیں
بھی موجود تھیں لیکن معلوم نہیں کب کسی نے انھیں اُٹھا کر سٹور یا کسی ایسی جگہ رکھ دیا جہاں
وہ ضائع ہو گئیں۔ إنا للہ۔ بہر حال گورنمنٹ کالج کے پرنسپل لائٹنر کے نام آزاد کے خطوط
کے حوالے سے سامنے آنے والے قرائن ۱۸۷۰ کی تصدیق کرتے ہیں۔

''مولانا کالج میں آئے اور عربی پروفیسر کے طور پر تقرر فرمائے گئے، اُس
وقت کالج کی آبادی بہت کم تھی یعنی میں طلبہ کی تعداد بہت تھوڑی تھی، تعلیم
کے بچے سینکڑے تک نہ پہنچے تھے بلکہ پچاس سے نیچے تھے۔ کوئی چالیس
پینتالیس کے قریب اور اُس میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی تھی۔ ان طلبہ میں
بیشتر ہندو ہوتے۔ کچھ سکھ تھے اور اِکا دُکا مسلمان تھے۔ مولانا اُن دنوں
مستی گیٹ کے قریب ہی رہتے تھے۔ وہاں سے اندرون میں شاہی مسجد
کے پہلو سے نکل کر اُن باغیچوں میں آجاتے جہاں آج کل مینار پاکستان
سے سیدھی سڑک داتا صاحب یا آگے کربلا گامے شاہ تک آتی ہے۔ آغا
باقر نے لکھا ہے مولانا کا مکان کالج سے کوئی دو ڈیڑھ میل کے فاصلے پر
واقع تھا۔ اسی بنا پر گھوڑے کا انتظام کرنا پڑا، جس پر بیٹھ کر وہ کالج پہنچتے۔
گھوڑے کے آگے آگے یا پیچھے پیچھے سائیس چلتا اور دائیں بائیں مولانا
کے شاگرد اپنی کتابیں بغل میں دبائے ساتھ چلتے۔ جب وہ شہر سے باہر
نکلتے تو شاگرد کتابیں کھول لیتے اور مولانا سے اپنے سبق کے بارے میں
ضروری باتیں پوچھتے چلتے۔ امتحانوں کے دنوں میں ایسے شاگردوں کی
تعداد میں اضافہ ہو جاتا۔ ہر طالبعلم کچھ نہ کچھ سوال پوچھتا جاتا اور
مولانا اِس سوال کا جواب دیتے جاتے۔ بعض مرتبہ وہ خود بھی ضروری
سوالات اور اُن کے جوابات انھیں بتاتے جاتے۔ کالج میں آزاد اپنے
خاص لباس میں آتے، جو مولویانہ قسم کا اور قدیم وضع کا ہوتا۔ اس لباس کی
تفصیل یوں ہے۔

بر کے پائنچے کا لٹھے کا پاجامہ اور لٹھے ہی کا معلٰی گریبان کا کُرتہ، پاؤں میں
عام طور پر سلیم شاہی زری کی جوتی۔ گرمیوں میں نین سکھ کا انگرکھا، اُس پر
سفید نین سکھ کا چغہ، سر پر چوگوشیہ ٹوپی، اُس پر سفید صافہ بائیں جانب
سے باندھتے، سفید جرابیں پہننے کا بھی بہت شوق تھا، قدیم وضع کے مطابق
گلے میں سفید لٹھے کا رومال بھی باندھتے۔ سردیوں میں پائنجامہ کو پنڈلیوں
پر لپیٹ کر پشمینے کے ساق باندھا کرتے۔ اگر زیادہ سردی ہوتی تو
کشمیرے کی نیم آستن پہنتے۔ سخت سردیوں میں روئی کا کوٹ بھی پہن
لیتے تھے ورنہ نیم آستین پر فرغل پہنتے۔ سر پر بجائے ململ کے صافے کے،
سفید یا فاختائی رنگ کا گرم کشمیری صافہ باندھتے، پاؤں میں سفید اونی
جرابیں اور دیسی جوتا، کشمیری کام کیا ہوا چغہ بہت زیادہ استعمال کرتے
تھے اور گلے میں وہی سفید لٹھے کا رومال"۔

آزاد کے لباس اور گھوڑے کے بارے میں طرح طرح کی حکائتیں وجود میں آئی ہیں۔ مسئلہ اِس گھوڑے اور مولانا کا یہ ہے کہ اُن دِنوں جب وہ نئے نئے پروفیسر ہوئے تھے ، اور آمدنی اُن کی بہتر ہوئی تھی تو اُنہوں نے ایک گھوڑا خریدا تھا۔ کچھ احباب کہتے ہیں وہ گھوڑا مولانا نے سواری کے واسطے لیا تھا اور کچھ کا خیال ہے وہ ذوالجناح تھا، جسے مولانا فقط ساتھ رکھتے تھے اور اُس پر سواری نہ کرتے تھے۔ جتنی روایات ہمارے سامنے مولانا کے اور گھوڑے کے متعلق آئی ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی یہ نہیں ثابت ہوا کہ گھوڑے پر مولانا سوار تھے۔ یہ گھوڑا اور کالج میں ملازمت کا قصہ ظاہر ہے ۱۸۷۰ کے بعد کا ہے۔ اور اُنھی وقتوں کا ہے جب مولانا گورنمنٹ کالج سے وابستہ تھے۔ جب ہم اُس وقت کے گورنمنٹ کالج کو دیکھتے ہیں تو یہ انارکلی میں موجود تھا اور نئی عمارت اُس جگہ قائم ہو رہی تھی جہاں آج موجود ہے اور مولانا تب مستی دروازے سے اُٹھ کر بنگلہ ایوب شاہ منتقل ہو چکے تھے جو شیرانوالا گیٹ کے اندر تھا۔ وہاں سے کالج کا فاصلہ زیادہ سے زیادہ ڈھائی میل بنتا ہے۔

لیکن جب ہم مولانا کی ہواخوری کو دیکھتے ہیں تو وہ روزانہ آٹھ سے دس میل تک پیدل تھی۔ یعنی یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مولانا کالج کا فاصلہ جو بہت کم تھا، وہ تو گھوڑے پر طے کرتے ہوں اور ہواخوری کے لیے آٹھ دس میل پیدل چلیں۔ لہٰذا گمان غالب ہے کہ وہ گھوڑا ذوالجناح ہی ہو اور مولانا اُسے ساتھ ساتھ رکھتے تھے۔ یہ بات اگر چہ اُن کی اولاد میں سے کسی کو معلوم بہتر ہو گی مگر قیاس یہی بتاتے ہیں کہ مولانا نے ذوالجناح رکھا تھا۔ اِس کے حق میں ہمارے پاس مولانا کے ایک شاگرد پنڈت شیو نرائن کا بیان موجود ہے۔

> ''پروفیسر آزاد کا ایک تعجب انگیز پہلو ایسا بھی تھا، جسے میں نظر انداز نہیں کر سکتا، وہ ایک چغہ پہنتے جس کی ایک آستین استعمال نہ کرتے اور اُسے اپنی پُشت پر چھوڑ دیتے۔ اُن کے پاس سواری کے لیے ایک گھوڑا تھا جس پر مَیں نے اُنھیں کبھی سوار نہیں دیکھا، یہ ہمیشہ اُن کے پیچھے پیچھے ہوتا۔ اردو قاعدے میں مولوی صاحب کا گھوڑا یہی تھا''

معاملہ یہ تھا کہ مولانا آزاد کی گورنمنٹ کالج میں ایک معلم کی حیثیت میں ملازمت در اصل لاہور کے تعلیمی اداروں میں ایک پوری تہذیب کی منتقلی تھی۔ جس کے برے ایک طرف سے لال قلعہ کے ایوانوں سے ملتے تھے اور دوسری طرف دہلی کے شعری و ادبی نخن گاہوں سے لگا کھاتے تھے۔ وہ اُستاد سے بڑھ کر ایک ایک ثقافتی اور تہذیبی جمود کے احیا کے نمائندہ تھے۔ دہلی میں جس تہذیب کا پورا گلستان اُجڑ گیا تھا، لاہور میں اُس کی نمو کاری کا احساس آزاد کو تھا اور اُنھی نے اِس کا ذمہ اُٹھایا۔ وہ ڈپٹی نذیر احمد نہیں تھے جو اپنے ہی شاگردوں سے سود کھاتے۔ وہ مولوی شبلی نہیں تھے جو تاریخِ اسلام کے خونیں کرداروں پر ملمع کاری کر کے تعصبات کے نیزے اُچھالتے اور جھوٹ کے سِکّے پر شفاف چاندی کا پانی چڑھاتے۔ وہ ذکاء اللہ مولوی نہیں تھے جو کینہ توزی میں غالب جیسے عظیم شاعر کی چغلیاں کرتے اور کریم الدین اور مولوی فیروز الدین سے مل کر غالب کے تعلیمات پنجاب سے

منظور شدہ وظیفے کی فائلیں دبا لیتے۔ وہ حالی بھی نہیں تھے کہ کسی سر سید کے باج گزار بن کر رہ جاتے اور جو وہ کر سکتے تھے نہ کر پائے۔ وہ آزاد تھے، سب سے آزاد تھے، جسے نہ مادیت کی لت تھی، نہ چغل خوری کی عادت تھی، نہ مذہبی مناقشوں اور منافقوں سے علاقہ تھا۔ وہ متخیلہ کی نثر کا بادشاہ تھا اور اسی سلطنت پر قناعت کر کے حدِ امکان سے آگے ہی آگے پرواز کر گیا۔ مولانا آزاد کے ساتھ اُن کے شاگردوں کے کچھ روابط کا ذکر ایک جگہ خواجہ حمید یزدانی نے کیا ہے، ذرا دیکھیے کیا کہتے ہیں۔

> ''مولانا آزاد گورنمنٹ کالج میں پروفیسر ہونے کے بعد اپنے شاگردوں کے لیے اُستاد سے آگے کے صحیح معنوں میں اُستاد تھے یعنی اُن کا رویہ اپنے شاگردوں سے با تفریق مذہب و ملت بڑا مشفقانہ اور مخلصانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے ہندو شاگردوں نے بھی اُنھیں انتہائی احترام سے یاد کیا ہے۔ گورنمنٹ کالج کی تاریخ از گیرٹ میں اُن کے بارے میں اُن کے بعض شاگردوں کے بیانات درج ہیں، یہ بیانات کیا ہیں، خراج ہائے عقیدت واحترام ہیں۔

۱- رائے بہادر چونی لال ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن جج میانوالی نے لکھتے ہیں، مولانا اکثر اپنی جیب سے اپنے شاگردوں کی پھل وغیرہ سے تواضع بھی کیا کرتے تھے۔ بلا شبہ بڑے حوصلے اور فیاضی کی بات ہے لیکن در حقیقت اُس وقت گنتی کے چند شاگرد ہوتے تھے۔ زمانہ سستا تھا، تنخواہ معقول تھی۔ ایسا کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔

۲- رائے بہادر پنڈت شیو نرائن پنجاب چیف کورٹ نے بڑی تفصیل سے آزاد کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے،

آزاد اردو نثر کا باپ اور ہندی فارسی ادبیات کا بہت بڑا ماہرِ لسانیات اور مورخ اکبر ہے۔ پروفیسر آزاد کی یاد ابھی تازہ ہے۔ وہ اپنی تصانیف کے سبب ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ اُن کا کوئی بھی شاگرد ایسا نہیں جو اِن کی عظیم شخصیت کو یاد نہ کرتا ہو۔ میں نے اُن کے فارسی

لیکچرز کے پریڈ میں جو وقت گزارا ہے اُس سے زیادہ خوشگوار لمحات کا مَیں تصور بھی نہیں کر سکتا۔ مولانا ایک ہی وقت میں پڑھاتے، ہدایات دیتے اور تواضع سے نوازتے۔ اُن کی کلاس کا وقت ختم ہوتا تو اُن کے شاگرد کلاس چھوڑتے وقت کچھ افسردہ سے ہو جاتے۔ کیا آج کوئی اِس بات کا یقین کرے گا کہ پروفیسر آزاد نے برف خانے، جو کالج کی عمارت سے ملحق تھا میں اکثر ٹھنڈے لیمونیڈ سے ہماری تواضع کی۔

۳۔ حصار ڈویژن کے ڈویژنل اینڈ سیشن جج خان بہادر مولوی شیخ امام کا بیان بھی لائق ملاحظہ ہے۔ خان بہادر نے ۱۸۸۰ کے اوائل میں گورنمنٹ کالج میں داخلہ لیا تھا۔ اِن کے مطابق آزاد ایک اُستاد ہونے کے ساتھ دوست بھی تھے۔ کلاس میں اپنے شاگردوں کو فارسی اور اردو اشعار سنا کر محظوظ کرتے۔ کالج میں دستور تھا کہ ہر پریڈ کے اختتام پر طلبا کالج ہال میں چلے جاتے، جہاں وہ یا تو اپنی کتابوں میں منہمک ہو جاتے یا باہم گفتگو میں مصروف ہو جاتے۔ اِس عالم میں اگر کبھی لڑکوں کو مولانا کی کلاس میں پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی تو وہ خاموشی کے ساتھ مشفقانہ انداز میں اپنے کمرے سے باہر نکلتے اور جلد ہی طلبا بھیڑوں کے ریوڑ کے مانند اِن کے سامنے جمع ہو کر کمرے میں داخل ہوتے۔ اُن کے پیچھے آزاد بھی اُس طرح داخل ہوتے جس طرح کوئی گڈریا اپنے ریوڑ کے پیچھے آ رہا ہو۔ اِس موقع پر طلبا کا رویہ بہت عقیدت مندانہ ہوتا۔

۴۔ لالہ کاشی رام فیروز پوری ۸۴-۱۸۸۰ چار برس تک گورنمنٹ کالج میں زیرِ تعلیم رہے۔ ظاہر ہے اُنھوں نے آزاد کو خاصا قریب سے دیکھا تھا۔ اب ذرا لالہ جی کا بیان بھی دیکھ لیں۔

ایک عجیب روح، جس کا مَیں خاص کر ذکر کرنا چاہوں گا، شمس العلما مولوی آزاد مشہور شاعر اور اردو نثر کے اُستاد تھے۔ وہ اپنے شاگردوں سے بڑے بے تکلف تھے۔ مذاق

مزاح اور لطیفوں سے طلبا کا دل بہلاتے۔ اکثر ایسا ہوا کہ اُنھوں نے فارسی پڑھانے کی بجائے، جو واقعی پڑھنے کے لائق مضمون ہے اور طلبا بھی محض فارسی پڑھنے کی خاطر اُن کے لیکچروں میں شامل ہوتے، وہ طلبا کو اردو اور فارسی کے ایسے اشعار سنا کر محظوظ کرتے جن کا نصاب سے کوئی تعلق نہ ہوتا۔ کبھی کبھی اُن کی کلاس میں مشاعرہ بھی ہو جاتا۔ اس طرح مولوی صاحب اپنے شاگردوں میں شعر کا زندہ ذوق پیدا کرنے میں خاصے مستعد رہتے۔ وہ زیادہ تر سال اول اور سال سوئم کی کلاسیں لیا کرتے۔

۵- لالہ کنور سین ۱۸۸۱ میں بطور ایک طالب علم کے گورنمنٹ کالج میں آئے اور بعد میں ۱۸۹۷ تک یہاں بطور سٹاف ممبر کے بھی رہے اور پھر لا کالج کے پرنسپل بنے۔ وہ بھی آزاد کے شاگردوں میں تھے۔ لالہ اپنے اساتذہ، سنسکرت اور فارسی اور عربی کا ذکر احترام کے ساتھ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ سب اساتذہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی محمد شعیب ہمیشہ مہربان رہے اور اکثر بڑے مونس و ہمدرد تھے۔ اِن مولوی حضرات کو طلبا دلی طور پر پسند کرتے تھے۔ طلبا اُن کے ساتھ بڑے بے تکلف اور راحت و اطمنان سے رہتے اور ان سے ہر طرح کا مذاق کرتے۔ لالہ کنور سین آنجہانی نے اُنھی اُستادوں میں سے کسی کا ایک واقعہ بیان کیا ہے لیکن صراحت کے ساتھ اُس اُستاد کا نام نہیں لیا۔ بہر حال واقعہ چونکہ دل چسپ ہے اس لیے اگر جملہ معترضہ کے طور پر یہاں درج ہو جائے تو کیا حرج ہے۔

ایک موقع پر ایک کلاس میں دو لڑکوں کے درمیان گرائمر کے کسی نکتے پر باقاعدہ کشتی ہو گئی۔ جناب اُستاد چپکے سے کلاس سے کھسک گئے تاکہ دو پہلوان اس مسئلے کو لڑ کر طے کر لیں۔ یہاں یہ بتانا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ باقی تمام طلبا نے کلاس روم کو اندر سے تالا لگا دیا اور پوری جنگ مزے سے دیکھی۔ شکرِ ایزد ہے آج کے طالب علم ایسی علمی بحثوں میں اُلجھتے

ہی نہیں بلکہ اُن سے کوسوں دُور رہتے ہیں۔ ورنہ صاحب آج اسلحے کا زمانہ ہے، خدانہ خواستہ ایسا معاملہ ہوتا تو بیک وقت کئی پستول چل جاتے۔ اللہ کے ہر کام میں بہتری ہوتی ہے۔

آزاد اپنے طلبا سے اُنس و موانست کا ایسا رویہ رکھتے تھے جس میں ذاتیات سے مبرا فقط علم و تعلم کا اخلاص پایا جاتا تھا۔ اُنھیں اس بات سے کچھ غرض نہ تھی کہ وہ زندگی کے کس دور سے گزر رہے ہیں اور تہذیب جدید کے کن انسانوں کے درمیان اپنا وجود رکھتے ہیں جہاں ذہنی کدورتیں اور نجی مفاد پیشِ نظر ہوتے ہیں، وہ سب سے ماورا اپنے شاگردوں کی علمی بصیرت کی سیرابی کے واسطے وقف تھے۔ اُنھیں فارغ اوقات میں پڑھاتے اور خوشی کے ساتھ پڑھاتے۔ جب پرنسپل لائٹنر نے اپنے بغض کے سبب اُنھیں فالتو وقت میں پڑھانے سے تحریری طور پر روکا تو مولانا نے پرنسپل کے نام درخواست لکھی،

> ''حضور پر روشن ہے کہ مجھے ان کی تعلیم میں وقت صرف کرنے میں خوشی ہوتی ہے۔ میری دانست میں سب سے بہتر ہوگا کہ بعدِ برخواست دو تین گھنٹے کالج میں رہا کروں۔ اس میں اگر کسی کو کچھ پوچھنا ہوا تو پوچھ لیا کرے، نہ پوچھے تو میری طرف سے کوئی خواہش نہیں''

حمید یزدانی لکھتے ہیں:

> ''مولانا شاگردوں کی محبت میں بے قیمت صرف تھے۔ ہر طالب کے واسطے ایسا قیمتی گوہر جو اُن کے کہیں بھی کام آسکتا ہو۔ کسی بازار میں بھی چل سکتا ہو۔ مولانا کام آنے اور کام کرنے میں بڑی مسرت محسوس کرتے اور یہ سلسلہ شاگردوں کے کالج میں موجودگی تک ہی نہ تھا بلکہ فارغ التحصیل شاگردوں کے معاملے میں بھی اُن کا رویہ ویسا ہی تھا۔ چنانچہ اُن کے مجموعہ مکاتیب میں بہت سے خطوط فارغ التحصیل شاگردوں ہی کے نام ہیں۔ اور اُن خطوط میں بیشتر اُن شاگردوں کے کسی نہ کسی کام کے کرنے کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں مولانا کے بعض خطوط کا حوالہ بے جانہ

ہوگا۔ لالہ ڈنی چند مولانا کے ایک خاص شاگرد تھے جو بعد میں جگراؤں
ضلع لدھیانہ کے رئیس وکیل پیشہ اور کانگریس کے مشہور لیڈر بنے اور
۱۹۲۳ تک زندہ رہے۔ لالہ کے نام مولانا کے کئی خطوط ہیں۔ ایک خط
سے پتا چلتا ہے کہ لالہ نے اِن سے بعض کاغذات بھجوانے کو کہا ہوگا جو
مولانا باوجود نہ بھجوا سکے، دیکھیں کس شدت کے انداز میں اپنی اِس کوتاہی
کو قبول کرتے ہیں۔"

ہزار لعنت ہے مجھ پر کہ تم جیسے شخص کو ایسے اضطراب میں ڈالتا ہوں اور لاکھ لعنت
ہے میرے اعمال اشغال پر کہ مجھے ایسے عالم میں ڈال رکھا ہے کہ جو جی بھی چاہتا ہے اور
واجب وفرض عینی ہے، وہ کر نہیں سکتا۔ بھائی تم تو بچے ہو مگر تمھیں میرے حال کی بھی خبر ہے؟

شور نے نامِ خدا اُن کے بلا سر کھینچا
میر سا ہے عالم میں علم کا ہے کو

ڈاکٹر لائٹنر سے بگاڑ

اب ذرا پرنسپل کی بات ہو جائے۔ لائٹنر صاحب مولانا کو کالج میں لائے، انھیں پروفیسر بنوایا، ترقی کی سیڑھی سامنے رکھی اور اُس پر چڑھایا۔ مولانا خوشی خوشی ترقی اور کشادگی کے زینے چڑھتے گئے۔ لائٹنر مولانا کے اور مولانا لائٹنر صاحب کے دادرس ہوئے مگر یہ ہوا کہ ڈاکٹر لائٹنر مولانا سے وہ کچھ طلب کرنے لگے جس کا بار شاید مولانا نہیں اٹھا سکتے تھے۔ یہ بار ایک تو خود مولانا کی تصانیف پر قبضہ جمانا تھا، دوئم انھیں دوبارہ جاسوسی کے کاموں میں لانا تھا جبکہ مولانا آزاد اپنے آپ کو اب صرف تعلیم اور علم کے لیے وقف رکھنا چاہتے تھے۔ یہ باتیں صاف مولانا کے خطوں میں ظاہر ہوتی ہیں کہ وہ کس طرح سے لائٹنر سے آہستہ آہستہ بدظن ہوتے گئے اور لائٹنر کیسے اُن کو دق کرنے لگا۔

آغا محمد اشرف نے لکھا ہے، لائٹنر نے مولانا کی سرپرستی کی اور گورنمنٹ کالج میں پروفیسر مقرر کرانے میں اُنھوں نے مدد کی لیکن بعد میں مسلسل بگاڑ ہوا۔ اُس بگاڑ کے سلسلے میں آغا محمد اشرف نے کچھ مزید وجوہات بھی لکھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ مولانا نے لائٹنر کے لیے کچھ کتابیں تصنیف کیں، جنھیں اُنھوں نے اپنے نام پر شائع کیا، بہر حال ملازمت کے کوئی ایک سال بعد ہی اُن تعلقات میں دراڑیں پڑنا شروع ہوئیں، جن کا سبب غالباً کچھ حاسدوں کی ریشہ دوانیاں تھیں اور کچھ ڈاکٹر لائٹنر کی شعلہ مزاجی۔ لائٹنر کے نام مولانا کے

ایک خط سے اُن کے دشمنوں کے ہاتھوں مجبوراً لاچار ہونے کا ذکر ملتا ہے۔

''خدا جانتا ہے کہ میں نے جس کام کو چھوڑا ہے، دشمنوں کے ہاتھوں مجبور و لاچار ہو کر چھوڑا ہے، کہ وہ عداوت کے سبب سے آپ کے کاموں کو بھی خراب کرتے ہیں، اس معاملے میں بھی یہی حال ہے۔ اگر آپ اِن شیطنتوں کو روک سکتے ہیں تو میں بھی خدمت کے لیے حاضر ہوں اور اگر آپ بھی مجبور ہیں تو مجھے بھی معاف رکھیے۔

لائٹنر اور مولانا کے درمیان جھگڑے کا اضافہ انجمن پنجاب کے رسالے ''ہمائے پنجاب'' میں ایک قابلِ اعتراض خط چھپنے سے ہوا تھا۔ مسئلہ اُس خط کا یہ تھا کہ ہمائے پنجاب ،تعلیماتِ پنجاب کے دفتر سے ایک رسالہ نکلتا تھا، جس کے مدیر مولانا محمد حسین آزاد تھے۔ اس رسالے کے مدیر کو کسی سائل کا خط آیا، جس میں جنرل پوسٹ ماسٹر لاہور پر کرپشن کا الزام عائد کیا گیا تھا۔ یہ جنرل پوسٹ ماسٹر ایک انگریز تھا اور ڈاکٹر لائٹنر کا دوست تھا۔ مولانا آزاد کو اس بات کی قطعی خبر نہ تھی۔ اُس نے وہ خط عین اپنے رسالے ''ہمائے پنجاب'' میں چھاپ دیا۔ خط کا چھپنا تھا کہ متعلقہ محکمے میں ہڑبونگ مچ گیا۔ اور بہت لے دے ہوئی۔ جنرل پوسٹ ماسٹر نے مولانا کی شکایت ڈاکٹر لائٹنر سے کی۔ یہ زمانہ گرمیوں کی چھٹیوں کا تھا۔ اِن دنوں میں مولانا کشمیر جانا چاہتے تھے۔ لائٹنر نے مولانا سے بہت ناراضی کا اظہار کیا اور کہا کہ وہ اس بات کا جواب دے کہ اُس نے خط چھاپنے سے پہلے تحقیق کیوں نہ کی اور وہ یہ جواب مذکورہ خط کی کاپی کے ساتھ مجھے دیں۔ جب تک جواب نہ دیں، انھیں شہر سے باہر جانے کی اجازت نہیں ہے۔ مولانا نے پنجاب کے سیکرٹری سے رابطہ کیا جس کے پاس مذکورہ خط محفوظ پڑا تھا مگر سیکرٹری لاہور سے باہر تھا۔ جب تین چار روز تک کوئی صورتِ حال واضح نہ ہو سکی تو مولانا نے پرنسپل لائٹنر کو ایک اور خط لکھا۔

جی ڈبلیو لائٹنر ایم اے

پرنسپل

گورنمنٹ کالج لاہور

سر میں آپ سے نہایت عاجزانہ درخواست کے ساتھ ایک بات توجہ میں لانا چاہتا ہوں کہ مجھے چھٹیوں کے دوران شہر سے باہر جانا ہے، اُس کے لیے آپ کی اجازت درکار ہے۔

پرنسپل لائٹر نے اِس درخواست پر سخت نوٹ لکھا، جو دوسرے لفظوں میں مولانا کو مزید مجرم بنانے کی کوشش تھی۔

یہ اجازت آپ کو اِس لیے درکار ہے کہ آپ کو پوسٹ ماسٹر جنرل کے سوالات کا سامنا نہ کرنا پڑے جو اُس نے مولوی آزاد کے زیرِ سایہ چھپنے والے رسالے (ہمائے پنجاب) کے اداریے کے بارے میں اُٹھائے ہیں، جن میں پوسٹ ماسٹر پر مکاتیب کے ردوبدل کرنے کا الزام لگایا گیا ہے، چونکہ مولوی کی دیانت داری پر پرنسپل کو شک کرنے کی معقول وجہ موجود ہے، اِس لیے اُس کو اجازت نہیں مل سکتی جب تک معاملہ صاف نہ ہو جائے۔

بات یہاں سے آگے تیزی کے ساتھ جھگڑے کی راہ میں نکل گئی اور مولانا اور لائٹر کھل کر ایک دوسرے کے مقابل آگئے۔ جس کا اظہار مولانا جا بجا کرتے نظر آتے ہیں۔ اصل میں یہ خط کا چھپنا تو ایک بہانہ تھا قصہ اصلاً یہ تھا کہ اب لائٹر کو مولانا کسی طرح وہ کام مزید نہیں دینا چاہتے تھے جس کی وہ خواہش رکھتا تھا۔ اِس میں زیادہ تر کتابوں کی تصنیف و تالیف کا کام تھا اُدھر لائٹر اپنی اَنا میں گھرا ہوا آدمی تھا۔ ڈاکٹر لائٹر سے آزاد کے بگاڑ کی تفصیل اُن کے شاگردِ خاص لالہ ڈنی چند کے نام کئی خطوں میں بھی موجود ہے۔ البتہ ہم یہاں ایک ایسا خط نقل کرتے ہیں جو مولانا نے ڈاکٹر لائٹر کو تنگ آمد بجنگ آمد کے طور پر لکھا ہے۔

بندہ پرور جو احکام حضور نے اب تک میرے حق میں جاری فرمائے، اُن کا صدقِ دل سے شکر گزار ہوں، قسمیہ کہتا ہوں کہ آزاد اب بھی وہی بندہ خدمت گزار ہے اور دل سے عہد

پر قائم ہے۔ آپ کو یاد ہو گا کہ آخر کے دنوں میں مَیں نے عرض کی تھی کہ جو سختیاں اپنے جانی دشمنوں پر آپ نے نہ کی ہوں گی، وہ آپ کے ہاتھ سے میرے دشمن مجھ پر کروادیں گے اور آپ نہ سمجھیں گے۔ وہ خوشیاں کرتے ہیں اور ہنستے ہیں کہ دشمن کو دشمن کے ہاتھ سے ہی اس طرح مارتے ہیں، ہزاروں کتے جو شیر کی کھالیں پہنے تھے، آپ نے انھیں مارا مگر اب تک آپ کو یہ نہ معلوم ہوا کہ شیر فقط ایک ہی بات میں شکار ہو جاتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حضور نے مجھے چھٹی میں روک لیا مگر کس کو روکا، وہی بندہ آزاد، قیدی و بے زنجیر۔ بجائے طول کلام کے فقط اتنا کہہ دیتے کہ جاؤ کالج کے کام کے سوا تمھیں اب کون روکتا ہے، واللہ کہ آزاد ایک قدم بھی نہ اٹھا سکتا اور وہیں گر پڑتا۔

خیر جو کچھ کیا اچھا کیا، مجھے اپنے خراب ہونے کا افسوس نہیں کہ جو سنتا ہے افسوس کرتا ہے۔ اگر دشمنوں کے ہاتھ سے مجھے خاک میں بھی ملوادیں تو مجھے افسوس نہیں کیونکہ میرا فخر تنخواہ اور کرسی اور عہدے پر نہیں۔ مَیں اسی خاک پر بیٹھا، آپ کو دعائیں دوں گا اور درختوں کے پتوں پر وہ باتیں لکھ کر پھینکوں گا کہ جو پڑھے گا افسوس کرے گا یعنی کون تھا جس نے ایسے شخص سے ایسا سلوک کیا۔ اگر قتل بھی ہو جاوں تو جو کچھ اب تک لکھ چکا ہوں، یہ خلق عالم کو رلانے کے لیے کافی ہے۔ اب شکوے کی جگہ رہی نہ شکایت کا موقع۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ بموجب اپنے وعدے کے جاوں گا اور سینہ چیر کے دکھاوں گا کہ کتنے زخم لگے ہیں۔ مجھے یہ زخم بھی عزیز ہیں کہ آپ کے لگائے ہوئے ہیں۔ مَیں اس تحریر سے آپ کا وقت ضائع نہ کرتا مگر کئی دن سے سُنتا ہوں کہ سنین الاسلام کی ترکیب ہی غلط ہے۔ مجھے ضبط کی طاقت نہ رہی چنانچہ اس ضرورت نے مضطرب کر دیا اور یہ مختصر سی عرض داشت انگریزی میں لکھتا ہوں۔

اُلجھاو پڑ گیا سو سُلجھی نہ اپنی اُس کی
جھگڑے رہے، بہت سے گزرے بہت قضایا

ڈاکٹر لائٹنر کی خفیہ طور پر ریشہ دوانیاں

سرکاری طور پر باس ہونے کی حیثیت سے لائٹنر جو کچھ کرسکتا تھا وہ کھلے عام کرتا رہا مگر ہوا یہ کہ اِس سے اُس کی تسکین نہ ہوتی تھی کیونکہ مولانا اِن سب باتوں میں لائٹنر سے مار کھانے والے نہ تھے اور نہ اُن پر ایسا کوئی الزام تھا جس پر گورنمنٹ کی طرف سے مولانا کی پُرسش ہوتی یا اُنھیں ملازمت کے جانے کا خطرہ پیدا ہوتا۔ علمی اور اخلاقی لحاظ سے مولانا کی ذات ایک برتر سطح پر تھی۔ شاگرد اُن پر جان چھڑکتے تھے۔ اس لیے اُن پر لائٹنر مزید سختی نہیں کرسکتا تھا۔ مگر اُن کو دق کیے بغیر رہ بھی نہیں سکتا تھا۔ چنانچہ بعض ایسی حرکتیں کرنے لگا جن کا تعلق یوں تو کسی طرح لائٹنر سے ثابت نہ ہوتا تھا مگر تھیں اُسی کی طرف سے، کسی بھی وقت میں جاہل اور سازشی لوگوں کی کمی نہیں رہی جو باس کی چاپلوسی میں بھی کمال رکھتے ہیں۔ وہ لوگ مولانا کو طرح طرح کی حرامکاریوں کے ذریعے مولانا کو ستانے لگے اور اُن کے صبر کو آزمانے لگے۔ کبھی کاغذ پر مغلظات لکھ کر مولانا کی کتابوں میں رکھ دیتے، کبھی چلتے ہوئے اچانک پھبتی کستے اور منہ دوسری طرف پھیر رکھتے۔ مولانا اِن تمام باتوں کو جان رہے تھے مگر وہ خاموش اپنی دُھن میں کام کرتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے۔ دراصل مولانا جانتے تھے کہ یہ تیر کدھر سے آتے ہیں اور کس ترکش سے نکلتے ہیں یعنی کمان غیروں کی ہوتی تھی ترکش لائٹنر کا ہوتا تھا۔ پھر ایک دن ایسا واقعہ ہوا جس کے متعلق مولانا نے لائٹنر

کو ایک خط لکھا اس سے آپ خود اندازہ کرلیں۔

ہوا یوں کہ ۱۸۷۱ء میں گورنمنٹ کالج دھیان سنگھ کی حویلی سے اُٹھ کر انارکلی کی ایک عمارت میں منتقل ہوا۔ یہ عمارت پرانی انارکلی میں اُس جگہ تھی جہاں ٹولنٹن مارکیٹ کی عمارت کا اگواڑہ ہے۔ اُس کے آگے مال روڈ کے پار سامنے والا حصہ تھا اور ساتھ میں ڈائریکٹر تعلیمات کا دفتر تھا۔ آج کل یہ جگہ بالکل ویران پڑی ہے۔ ایک چھوٹا مندر بھی اس میں موجود ہے۔ جس کا دروازہ انارکلی میں کھلتا ہے اور اندر گھانس پھونس کے ڈھیر اُوپر تلے لگے ہیں۔ اس کے سامنے لنڈے کی پتلونوں کا بازار لگتا ہے۔ اُس وقت بھی وہ علاقہ بہت ویران تھا اور جلدی جلدی سے ایک عمارت خستہ سی تیار کی گئی تھی۔ عمارت کی چھتیں جگہ جگہ سے چاک ہو چکی تھیں۔ عمارت میں اوپر ہاسٹل بنایا گیا اور نچلے حصے میں کلاسیں ہونے لگیں۔ اسی عمارت میں مولانا اپنی کلاس لے رہے تھے کہ چھت پر سے ایک دم مولانا کی میز پر پانی ٹپکنے لگا حالانکہ بارش کے دور تک آثار نہ تھے۔ یعنی معلوم ہوتا ہے یہاں بھی اُنھیں جان کر تنگ کیا گیا تھا۔ آگے آپ مولانا کی ہی زبانی اس کا احوال سُن لیں جو اُنھوں نے اس واقعے کی اطلاع دیتے ہوئے لائٹنر کو لکھا ہے

جنابِ عالی!

۷ تاریخ ماہ حال دو بجے کے بعد، جبکہ سیکنڈ ائیر کلاس میرے ساتھ بیٹھی تھی۔ دفعتاً چھت سے ٹھیک میز پر میرے آگے پانی گرنے لگا۔ مَیں مع طالب علموں کے فوراً اٹھ کھڑا ہوا مگر میز اور کتابیں نجس ہو گئیں۔ احتیاطاً نبین چپراسی کو اور پھر سید نیاز علی، ممتاز علی اور محمد اشرف طالب، علموں کو بھی بھیجا گیا کہ جا کر دیکھیں۔ اُنھوں نے آ کر بیان کیا کہ صورتِ حال سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی نہیں کسی نے پیشاب کیا ہے بعد اس کے گنگا رام چپڑاسی اور بعض طالب، علم اوپر گئے، مضمونِ واحد معلوم ہوا۔ اگرچہ اس امر میں شک نہیں تھا مگر نظر مزید تحقیق اومن صاحب بہادر سے کیا گیا۔ اُنھوں نے لٹمس پیپر عنایت کیا۔ اُس سے امتحان

کیا تو کوئی شک نہ رہا۔ چنانچہ وہ کاغذ بھی موجود ہے۔ چونکہ پہلے بھی اکثر یہ عمل نجس اُوپر کے کمروں میں ہوتے ہیں بلکہ یہ نجاست کا عملِ صغیر تھا اور وہ اعمال نجاستِ کبیرہ کے ہیں۔ پس بڑھتے بڑھتے یہ نوبت پہنچ گئی ہے۔ اس لیے اطلاع حضور میں واجب ہے، کہ آئندہ اس سے زیادہ ترقی نہ کرے معاملہ نازک ہے۔ حضور کو یہ بھی خیال رہے کہ عملِ مذکور کسی تنہا طالبعلم کا فعل معلوم نہیں ہوتا، اس میں اور بھی تائیدیں شامل ہوں گی۔ حضور تفتیش فرماویں گے تو معلوم ہو جائے گا۔ واجب تھا عرض کیا۔ آفتابِ دولت تاباں رہے۔

محمد حسین عفی عنہ

پروفیسر عربی ۱۸۷۲

پہلے اِس خط میں درج ذیل نکتوں پر غور کریں

۱۔ میز اور کتابیں نجس ہو گئیں۔

۲۔ چپڑاسی اور ممتاز علی اور دگر طالب علموں کی گواہی کے مطابق یہ پیشاب ہے۔

۳۔ لٹمس پیپر سے مزید تحقیق کی

۴۔ پہلے بھی یہ عمل نجس ہوا ہے

۵۔ آئندہ اِس سے آگے ترقی نہ کرے

۶۔ تنہا طالب علم کا فعل نہیں ہے، اس میں اور بھی تائیدیں شامل ہوں گی۔

اِن تمام نکات کو اگر ترتیب سے جمع کیا جائے تو صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ مولانا سیدھا سیدھا ڈاکٹر لائٹنر پہ اِلزام لگا رہے ہیں کہ چھت کے اُوپر سے عین مولانا کی میز پر نجاست گرانے کا بیہودہ کام لائٹنر کی ایما پر ہو رہا تھا ورنہ کس کی جرات تھی کہ اِس قبیح عمل کو انجام دے سکتا کیونکہ اول تو کالج کے اندر کوئی غیر متعلقہ شخص داخل نہ ہو سکتا تھا، دوئم کسی کو کیا خبر کہ یہاں مولانا کلاس لے رہے ہیں اور جہاں وہ پیشاب کر رہا ہے، عین اِسی کے نیچے اُن کی میز ہے۔ سوئم مولانا کہ اشارہ کرنا کہ اس میں کسی کی تائید شامل ہے اور یہ کہ آئندہ یہ عمل ترقی

نہ کرے صاف صاف لائٹنر کو انتباہ کرنا تھا، حضرت یہ حرکت تمھاری ہی ایما پر ہو رہی ہے اور یہ مت سمجھیو کہ ہمیں اس کی خبر نہیں ہے۔ اِسی خط میں یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ مولانا کہ لہجہ بہت دوٹوک ہو چکا تھا اور اب وہ لائٹنر کو بتا دینا چاہتے تھے کہ وہ ایک دوست نہیں دشمن انسان ہیں۔

اورینٹل کالج میں تقرری:

اکثر یہ بات دہرائی جاتی ہے کہ جب مولانا کی ڈاکٹر لائٹنر سے چپقلش زیادہ بڑھ گئی تو اُنھوں نے مولانا کو اورینٹل کالج میں منتقل کر دیا اور گورنمنٹ کالج سے اُنھیں فارغ کر دیا گیا۔ یہ بات صریحاً غلط ہے۔ دراصل اورینٹل کالج اُن دنوں پنجاب یونیورسٹی کے علومِ شرقی یا مشرقی زبانوں کے شعبے کے طور پر وجود میں آیا تھا۔ مولانا چونکہ عربی، فارسی اور ہندی کے عالم بے بدل تھے اور جیسی کچھ اِن زبانوں پر مولانا کی دسترس تھی، کسی اور کے پاس وہ استعداد نہ تھی۔ چنانچہ اُنھیں اورینٹل کالج میں عارضی طور پر اس لیے منتقل کیا گیا کہ وہ اُن کی بہتر ترویج کے واسطے متحرک ہوں۔ جیسا کہ سب کو معلوم ہے اورینٹل کالج عین گورنمنٹ کالج کے پہلو میں واقع ہے اور یہ دونوں جگہیں مال روڈ پر ٹولنٹن مارکیٹ کے بالکل سامنے پڑتی ہیں اور فاصلہ اِن دونوں کالجز کے درمیان چند قدم کا نہیں۔ مولانا اورینٹل کالج میں بطور پروفیسر عربی اور فارسی ادبیات کی تعلیم دیتے ضرور رہے لیکن یہ تقرر اُن کا اضافی تھا بکمل ٹرانسفر نہ تھا کہ اُنھی دنوں میں وہ گورنمنٹ کالج میں بھی یہی کچھ تعلیم دیتے تھے۔ فرق یہ تھا کہ گورنمنٹ کالج سے عربی اور فارسی کی زبانوں کی تعلیم ڈگری کلاسز کی ختم کر دی گئی تھیں اور وہ کلاسز اورینٹل کالج میں منتقل کر دی گئیں جبکہ گورنمنٹ کالج میں اِنھی زبانوں کی تعلیم انٹر تک محدود کر دی گئی۔ اگرچہ محمد حسین آزاد اِس بات پر کافی جز بز تھے اور وہ پنجاب یونیورسٹی کو اِس سلسلے میں ایسی چڑیل کہتے تھے جو سب کچھ نگل جائے گی مگر وہ مجبور تھے اور کچھ اختیار اُن کے پاس نہیں تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں یہ علم کی چڑیل (پنجاب یونیورسٹی

)تعلیم کو ہضم کیے جاتی ہے۔ کالج کا بھی کلیجہ کھا چکی ہے۔ چند مہینے میں سن لیجیے گا کہ نگل گئی۔ باوجود اس کے کورس بنانے کے لیے ہم پکڑے جاتے ہیں۔ حکم ہے کہ جلدی دو۔ اگرچہ کورس کا جھگڑا پیچھے لگ گیا ہے مگر میں مصروف کار ہوں۔ مشکل یہ ہے کہ طبیعت محنت پسند واقع ہوئی ہے۔ انتخاب میں آسان بات یہ ہے کہ کتاب اُٹھائی اور لکھ دیا کہ فلاں صفحے سے فلاں صفحے تک مگر اسے دل پسند نہیں کرتا۔ جی چاہتا ہے کہ انتخاب ایسا ہو کہ طلبا کے لئے مفید تعلیم بھی ہو اور پڑھنا اُس کا ہر شخص کے لئے باعث شگفتگی ہو۔ البتہ اس میں محنت بہت ہے"۔

مولانا کے اِس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلیبس کی تیاری اور دوسرے اہم اُمور کے واسطے مولانا کو زحمت دی جاتی تھی۔ اُنھیں اورینٹل کالج کی کلاسز پڑھانے سے معذور کیا گیا تھا۔ کبھی کلاس بھی لیتے ہوں گے لیکن مولانا کے اس خط سے ظاہر ہوتا ہے کہ کام اورینٹل کالج میں فقط سلیبس کی تیاری اور امتحانی پرچے بنانا، اُن کی جانچ کرنا اور ممتحن تک محدود تھا مگر یہ کام بھی شیطان کی آنت کی طرح اتنا طویل اور سر کھپا دینے والا تھا کہ مولانا اس کام سے پہلوتہی کرنے لگے۔ بعد ازاں جب کام حد سے بڑھ گیا اور مولانا محمد حسین کی طبیعت پر گراں گزرنے لگا تو اُنھوں نے اِس کام سے دست برداری لے لی اور اورینٹل کالج سے اپنے کو بری کر لیا۔ فقط گورنمنٹ کالج کی ملازمت پر اکتفا کر لیا۔ واقعہ یہ تھا کہ جس وقت مولانا صرف گورنمنٹ کالج میں کلاسز لیتے تھے، تب اُن کو تصنیف و تالیف کے لیے بہت وقت فرصت کا ہوتا تھا اور وہ اُن میں دل جمعی سے کام کرتے تھے مگر اورینٹل کالج کی مصروفیات کے سبب اس کام میں اُنھیں وقت کی قلت ہوگئی۔ وہ ذہنی طور پر پریشان رہنے لگے اور کسی طرح سے جان چھڑانے کے چکر میں ہوئے۔

اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

"میرا یہ حال ہے کہ تقریباً آٹھ دن ہوئے ہوں گے جو" آب حیات" اور "نیرنگ خیال" سے چھٹکارا ہوا مگر اِس سال یونیورسٹی مجھ پر پھر مہربان

ہوئی۔ زبان اردو میں طلبائے داخلہ کا ممتحن مقرر کیا اور زباندانی میں اردو
اور فارسی کا اور ایک حصہ عربی کا۔ اِن کے سوالات بنانے ایسا وقت نہیں
لیتے مگر کاغذات جو نمبر لگانے کو آئے ہیں وہ چھاتی پر پہاڑ ہیں۔ ۶۱۸
پرچے کاغذ ہیں اور آج سے دس دن کی مہلت باقی ہے۔ خدا اِس بلا سے
مخلصی دے۔ یہ درست ہے کہ اِس میں ڈیڑھ سو روپے کا فائدہ مجھے ہو
جائے گا یا شاید کچھ زیادہ ہو مگر خدا گواہ ہے کہ میں اِس پر خاک ڈالتا
ہوں۔ منظور فقط اِس لیے کیا کہ اِس دفعہ کالج کا معاملہ نازک ہو رہا ہے۔
رجسٹرار ناراض ہو جائے گا تو لوگ مجھے احمق بنائیں گے اور کہیں گے کہ
ڈاکٹر لائٹنر تو بہ اسباب خاص ناراض ہو گئے اور اُن کی ناراضی بے شک
تدارک پذیر نہ تھی۔ انھیں تُو نے کیا سمجھ کر ناراض کیا۔ اسی سبب سے یہ
بوجھ سر پر لیا۔ ورنہ آپ یقین مانیے کہ آزاد روپے کا لالچی نہیں۔ ڈاکٹر
لائٹنر نے کئی دفعہ ممتحن کیا اور میں نے انکار کر دیا۔ اب بات فقط اتنی ہے
کہ ایک منشی بھی میں نے ملازم رکھ لیا ہے، وہ میرے ساتھ کام کر رہا ہے۔
مولا اسد اللہ الغالب مظہر العجائب کا فضل شامل ہونا چاہیے۔ آپ دیکھیں
گے میں تیسرے ہفتے کچھ نہ کچھ نئی تصنیف لے کر حاضر ہوں گا"۔

مولانا گورنمنٹ کالج واپس آ گئے، ڈاکٹر لائٹنر سے اُن کی مکمل طور پر دشمنی چل رہی تھی اور وہ مزید دشمنیاں مول نہیں لینا چاہتے تھے اِس لیے گاہ گاہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے بھی کام کر گزرتے تھے مگر اِس کے ساتھ اپنی تصانیف کے معاملے میں کسی قسم کا سمجھوتا بھی اُنھیں گوارا نہ تھا اور وہ اُن پر دلجمعی سے لگے ہوئے تھے۔ ۱۸۸۰ میں آبِ حیات نے چھپ کر وہ شہرت اور عروج مولانا کو دیا کہ اُس کی چھاؤں میں وہ کسی بھی دھوپ کا مقابلہ کر سکتے تھے اور وہ یہ مقابلہ کر رہے تھے یہاں تک کہ ۱۸۸۵ کا زمانہ آ گیا اور مولانا کی دلی آرزو کہ جسے حج کے برابر کہا جا سکتا تھا اُس کے پورا ہونے کا موقع بھی تھا، وہ اُن کی ایران کی طرف نکلنے کا تھا۔

وہ دشت خوفناک رہا مرا وطن
سُن کر جسے خضر نے سفر سے حذر کیا

ایران کی طرف رواں

ایران کی سیر کو جانے کے کئی اسباب تھے، اول تو یہ کہ وہ کالج اور تصنیفات کی بے پناہ مشقت سے ایک گونہ گھبرا چکے تھے، پھر مستزاد اُس پر یہ تھا کہ عرصہ سے اُن کے پاوں ملازمت کی زنجیر سے بندھے ہونے کے سبب اُن کی سیلانی طبیعت کو آزادی چاہیے تھی اور یہ آزادی کہیں لائٹنر کی سختی اور مولانا کی مجبوری کے نیچے ایسی دبی ہوئی تھی کہ اُٹھائے نہ اُٹھتی تھی۔ اُدھر بیٹی کے مرنے کا غم اور اپنی بواسیر کی بیماری نے دماغ پریشان یوں کیا کہ بعض حالات میں جنون کے آثار نکل آتے تھے۔ اِن سب معاملوں کو آزاد خوب سمجھ رہے تھے اور ایسا کرنا چاہتے تھے کہ طبیعت بحال ہو جائے اور کوئی نیا بہانہ زندگی کے بے آب دنوں کو سیراب کردے۔ آخر اُنھوں نے کالج سے چھٹی لے لی اور سفر کی طرف نکل پڑے۔ دوست احباب اور عزیز و اقارب کی یہ سُن کر جان حلق میں آتی تھی مگر وہ نہ رُکنے والے تھے، نہ رُکے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے ۱۸۸۵ میں ایران کی طرف کوچ بولا۔ تب اُن کی طبعی عمر ۵۸ برس تھی، نوکری سے بیزاری کی حد تک پُرے ہو چکے تھے اور کافی تھکے ماندے ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے ایران کی طرف جانے کے واسطے جہاز کی سواری کا سہارا لیا۔ یہ جہاز بحری تھا اور نام اِس کا عربیہ تھا۔ کراچی سے جہاز دو اکتوبر کو چلا۔

مولانا ایران کیوں گئے؟ کیا اس میں محض کتابوں کی خریداری مقصود تھی یا کچھ اور بھی!

س راہ نکلنے کا مقصود تھا۔ اصل قصہ تحریر میں یوں آتا ہے کہ مولانا کی نظر میں ولایت اپنے گھر کی حیثیت رکھتا تھا، انھیں جس قدر فارسی ادب اور لغت سے تعلق تھا اور جیسا انھیں مذہب تشیع کی اصل سے رغبت تھی اور جس قدر وہ ایرانی تہذیب وتمدن اور شعر و ادب کے دلدادہ تھے، اُس کا تقاضا تھا کہ وہ اِس دیار کی زیارت کو روانہ ہوتے۔ یہ کام مولانا بہت پہلے کر چکے ہوتے اگر انھیں مصائب و آلائم نے قید نہ کرلیا ہوتا۔ مولانا نے اپنے بچپن میں فارسی زبان کی تربیت اور اساتذہ کی فارسی فضا سے رغبت کے زیر اثر اِس مُلک کی آب و ہوا کو بہت اپنے اندر بسالیا تھا، جسے وقت کی آزمائشوں نے کبھی ماند نہ ہونے دیا۔ وہ جس وقت وسط ایشیا کی طرف نکلے تھے۔ ضرور انھیں ایران کی رغبت تھی مگر تب وسائل اور اجازت کی نایابی نے روکے رکھا۔ واپس لوٹے تو کالج کی ملازمت بلکہ ملازمت سے بڑھ کر ڈاکٹر لائٹنر کی جبری مشقت نے سر نہ اُٹھانے دیا۔ بے جا قسم کی پابندیاں اور طعن و تشنیع کے ساتھ آزاد کے کام میں مختلف قسم کے نقائص نے انھیں بے زار کر کے رکھ دیا تھا۔ پھر ایک وقت تھا کہ آبِ حیات کی تیاری اور اُس کے بعد پے در پے مختلف قسم کی تصنیفات و تالیفات میں مصروفیت کا تقاضا تھا کہ ایران کا سفر ذرا ملتوی کیا جائے مگر کب تک اور اب یہ وقت آگیا تھا کہ آزاد میاں اپنا بستر باندھ لیتے لد کوچ کرتے اُس ولایت کی طرف، جہاں سے اُن کے خمیر کا لہو بلاتا تھا۔ سلمان فارسی، جو اُن کے اجداد میں سے تھے، اُس کی زبان پکارتی تھی اور یہ لبیک کہتے ہوئے دوڑے چلے جاتے تھے۔ ایک جگہ آغا باقر لکھتے ہیں۔

> ”غدر کی مصیبتیں اور حوادث زمانہ نے ۵۸ برس کے بوڑھے کو بے حد کمزور اور نحیف کر دیا تھا۔ اُس پر غضب یہ ہوا کہ اُن کی چہیتی بیٹی کا جو انھیں سات بیٹوں سے گراں بہا تھی، انتقال ہو گیا۔ یہ اُن کی تصنیف میں اُن کا داہنا ہاتھ تھیں۔ اُن کے مرنے سے آزاد کا دل ٹوٹ گیا۔ بلکہ اس حادثے کا اُن کے دل و دماغ پر ایسا اثر ہوا کہ اکثر احباب اور عزیزوں کو

جنون کا شبہ ہونے لگا۔ جب اُنھوں نے سفر ایران کا ارادہ ظاہر کیا تو سب
نے اُس کی مخالفت کی۔ ہر شخص نے انھیں طرح طرح سے سمجھانا چاہا مگر
یہ اپنی دھن کے پکے تھے۔ اس لیے اپنی بات پر اڑے رہے۔ دس ہزار کی
رقم اُنھوں نے بنک میں پہلے الگ کر رکھی تھی۔ لاہور کے مشہور رئیس
نواب نوازش علی خاں قزلباش نے اُس کے عوض ایران کے سوداگروں
کے نام خط لکھ دیے۔ گورنمنٹ کالج سے رخصتیں ملنے میں بھی مشکلیں پیش
آئیں لیکن یہ مرحلے بھی اُنھوں نے طے کر لیے۔ دورانِ سفر میں اُنھیں
ہر وقت کتابوں کا خیال لگا رہتا تھا۔ اس لیے کم سے کم سامان لے کر روانہ
ہوئے۔ جہاز پر تیسرے درجے میں سفر کیا جس سے بہت تکلیف ہوئی۔
ایک رفیقِ سفر جو دوسرے درجے کے مسافر تھے، اُنھیں اپنے آرام دہ
کمرے میں لے گئے۔ آزاد کو بھی خیال آیا کہ ٹکٹ بدلوا لیں، پھر کرائے
کے فرق پر غور کیا تو دل نے خیال کیا کہ اس روپے سے کتابوں کی الماری
کا ایک خانہ بھر سکتا ہے۔ سفر میں ہر وقت لوگوں کی بول چال اور لب و لہجے
میں اُن کے کان لگے ہوئے تھے۔ جب اُن کے جہاز نے بندر عباس میں
لنگر ڈالا تو آزاد نے ہر شخص کو فارسی بولتے سنا۔ سفر نامے میں فوراً لکھ لیا
کہ یہاں سے ایران کی سرزمین شروع ہوتی ہے۔ مگر سب سے زیادہ خوشی
اُنھیں بوشہر میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے اور فارسی بولتے ہوئی۔
بوشہر سے یہ ایک قافلے کے ساتھ گھوڑے پر سوار ہو کر شیراز روانہ ہوئے۔
راستے میں جہاں کہیں قافلہ ٹھہرتا دوسرے لوگ کھانے پینے کی چیزیں
تلاش کرنے نکل جاتے۔ آزاد اپنے مقصد کے حصول میں علما اور فاضلوں
کو ڈھونڈتے پھرتے چنانچہ ہر قصبے اور گاؤں میں جا کر جس کسی اہلِ علم کا
نام سنا اُس سے ملاقات کی۔ اکثر اہلِ ایران کو اُن کی علمیت اور زبان پر
حیرت ہوتی تھی۔ ایک گاؤں میں ایک ملا صاحب نے امتحان کے طور پر

عربی کتاب کے چند صفحے پڑھوا کر بھی سنے ۔ کہیں کہیں ٹوکا بھی مگر آزاد نے
جب انھیں قائل کر دیا تو بہت خوش ہوئے اور سند کے طور پر فرمایا: شما
زبانِ عربی را خوب ورزیدہ اید"

آغا اشرف نے اپنے ایک مضمون میں آزاد کے سفر ایران کی جو تاریخیں بتائی ہیں وہ کچھ یوں ہیں۔

۲ اکتوبر ۱۸۸۵	کراچی سے روانگی
۱۰ اکتوبر	آمد بوشہر
۱۷ اکتوبر	بوشہر سے روانگی
۲۶ اکتوبر	آمد شیراز
۱۰ نومبر	روانگی از شیراز
۲۵ نومبر	آمد اصفہان
۳۰ نومبر	اصفہان سے روانگی
۱۰ دسمبر	آمد تہران
یکم مارچ ۱۸۸۶	روانگی از تہران
۲۹ اپریل	آمد مشہد
۹ مئی	روانگی از مشہد

آغا اشرف لکھتے ہیں:

"مشہد سے ہرات اور قندھار اور وہاں سے کوئٹہ ہوتے ہوئے اوائل
جولائی ۱۸۸۶ میں آزاد لاہور پہنچے"۔

مولانا آزاد ایران کے لیے اپنے خواب رکھتے تھے، اُن خوابوں کی سیر گاہیں جنت سے مشابہہ تھیں، چونکہ اُن کے مذہبی عقائد کی بنیادیں بھی کسی حد تک وہیں کے سلسلوں سے

بندھی تھیں اس لیے مولانا آزاد ایران میں ہر چیز اور ہر امر اپنی تخیل میں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایک شے کو اُن کتابوں کے عکس اور اُن آئنوں کے جلو میں دیکھتے تھے جو سعدی و حافظ کی لافانی سبزہ گاہوں میں دیکھ چکے تھے، اُن کو حرف و معنی کی خوردبینوں سے پرکھ چکے تھے مگر اب یہاں ۱۸۸۵ کے زمانے تھے، شیراز شہر کے چہرے پر مہ و سال کی گرد جمی تھی، ایک بے در و دیوار سا قصبہ تھا، جہاں پرندوں سے لے کر انسانوں تک، ہر شے میں مایوسی کی پرچھائیں چڑھی تھیں۔ آبادی کم، مکان کم، کھنڈرات آباد اور گھانس پھونس کی سوغات زیادہ تھی۔ گویا ایک ایسا اُجڑا ہوا قصبہ رہ گیا تھا جہاں نہ وہ رونقِ شعر و سخن تھی، نہ انہار و گلگشتانِ جہاں تھیں۔ کچھ نفوس بیگانۂ حُسن اِدھر اُدھر کی ہوا میں بھٹکے پھرتے تھے۔ سڑکیں ٹوٹی ہوئی، روشیں خراب و خستہ، باغات اُجڑے ہوئے تھے۔ آپ یوں سمجھیے کہ شیراز کو مولانا نے یوں پایا جیسے کچی پکی گلیوں اور بے چارہ سی آبادیوں کے پرتو اُڑتے ہوں اور شیراز کہیں زمانوں کی دھول میں گم ہو گیا ہو۔ شیراز کو دیکھ کر مولانا کا دل ڈوب ہی تو گیا۔ یونہی جیسے کسی مسافر کو چشمے کی تلاش ہو، وہاں پہنچے تو سوکھ چکا ہو اور فقط تشنگی کا احساس رہ گیا ہو۔ یہی کچھ مولوی صاحب کے ساتھ ہوا، کہ شیراز تو کہیں غائب تھا اور ایک خرابہ انھیں وہاں آواز دیتا تھا۔ البتہ مولانا کو شیراز کی آب و ہوا میں پچھلی خوشگواریوں کے طرارے بہت بھائے، ٹھنڈی اور طراوت بخش ہوائیں وہاں پھریریاں لیتی تھیں اور مولانا کے جسم سے نرم رو پریوں کی طرح چھوتی ہوئی نکلتی تھیں۔ پانی وہاں کا میٹھا اور حیات بخش تھا اور خوبی پھلوں کی شیرینی سے بھری تھی۔ جانوروں کے رنگ گہرے تھے اور مٹی سبز شیشوں کی طرح باس مارتی تھی۔ مولانا کو سب کچھ اپنا اپنا لگا۔ اسی اپنائیت میں ایک امیر سے ملنے چلے گئے کہ کچھ شیراز کے معاملے میں کہنے سُننے کا موقع پائیں اور اُس سے اس شہرِ پُرنور کا مزید سراغ لگائیں مگر اُس امیر نے مولانا کو شیراز کی شیرینی میں تلخی کا گھونٹ دیا یعنی بے رُخی سے منہ موڑ لیا اور ملنے سے نفور ہوا۔ مولانا ایک دفعہ تو اُس کی بے رُخی سے بہت دل گرفتہ ہوئے پھر سوچا ایسا بھی کیا دل

پر لگانا، ابھی تو وطنِ محبت میں بہت کشادگی ہے، کسی اور دروازے کی زنجیر ہلا کر دیکھتے ہیں۔ شہر کو بہت طرزوں سے دیکھا، کتابوں کی دکانوں کی سیر کی، بہت کچھ نسخے اُن کے خریدے۔ ایک حافظ کا دیوان اُن کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا خریدا۔ یہ دیوان ابھی تک آغا سلمان باقر اُن کے پڑپوتے کے پاس محفوظ ہے اور دیکھنے کے لائق ہے۔ مولانا نے شیراز کے درودیوار کو سو سو بوسے دیے اور تب اُن کی وہاں کے ایک اور رئیس سے ملاقات ہوئی۔ یہ بہت پڑھے لکھے اور بامروت تھے۔ اُنھوں نے مولانا کی بہت کچھ تواضع کی۔ یہ رئیس انتہا درجے کے پڑھے لکھے اور نفیس آدمی تھے۔ مولانا آزاد کو اپنے گھر لے گئے، ڈیوڑھی کے دالان میں بٹھایا۔ مہمان نوازی کا ہاتھ بڑھایا۔ بہت آؤ بھگت کی کھانے کے ساتھ شیریں اور نمکین کھانے کے ساتھ سخن کی حلاوت بھی بخشی دیر تک شیراز کے حالات بتاتے رہے اور باتوں میں دل گرماتے رہے۔ پڑھے لکھے بلا کے تھے اور مہمان نواز دل صفا کے تھے۔ مولانا روز اُن کی طرف نکل جاتے تھے، اور وہ اُنھیں شیراز کی گلیاں دکھاتے تھے، جو نہ دیکھی تھیں وہاں لے جاتے تھے۔ پُرانے اور نئے کوچوں پھراتے تھے۔ مولانا کو اُن سے مل کر دل کا غبار دُھل گیا اور شیراز کی محبت کی سردی گرمی کے تپاک میں متحرک ہو گئی اور مولانا شیراز سے محبت کی چٹکی اُٹھا کر روانہ ہوئے۔ شیراز میں مولانا نے کُل پندرہ دن گزارے اور کوچہ و بازار و باغ و بہشت کی سیر گاہ گاہ کی اور دل و دماغ سے واہ واہ کی۔ یہاں سے آپ کی اگلی منزل اصفہان تھی۔ اصفہان جیسا کہ نصف جہان ہے اور دنیا کا اس بات پر ایمان ہے کہ جس نے اصفہان دیکھ لیا اُس نے آدھا جہان دیکھ لیا۔ مولانا کو حد درجہ شوق تھا، اِسی رغبت میں اُن کے قدم شیراز کی سیر گاہوں سے نکلے اور ایک دوسری بہشت کی طرف روانہ ہوئے۔ وہ ۲۵ نومبر کو اصفہان پہنچے۔ آغا اشرف لکھتے ہیں۔

اُنھیں اصفہان کی تاریخی عمارتیں اور مسجدیں دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ دن بھر یہ عمارتوں کی سیر کرتے تھے اور شام کو تھک کر بستر پر آن گرتے تھے۔ آزاد نے اصفہان کو

صفویہ ہمتوں کا عجائب خانہ کہا ہے۔

اصفہان کے قالین باف، کوزہ ساز، تیغ وتوزہ کار، ایک ایک حرفت میں اپنے کمال کو پہنچے ہوئے لوگ یہیں ملیں گے اور حسنِ عالم جہاں تاب کا عالم یہ ہے کہ جو وہاں گیا، وہیں کا ہو رہا۔ قطار در قطار دکانیں سجی ہوئیں، دوکانوں کے چبوتروں پر اشیائے نادر و نازک لگیں ہوئیں۔ بازار ایسے کہ سب الف لیلوی انداز تھا اور کوچے اصفہان کے پورے اساطیری مزاج رکھتے تھے گویا شہریار زمانہ یہاں سے پھر گیا ہو اور جہاں زاد ان گلیوں کی سیر کو نکلتی چلی گئی ہو۔ مولانا ان بازاروں، کوچوں، قریوں اور باغوں میں پھرتے چلے جاتے تھے اور دل لہراتے جاتے تھے۔ لیکن سردی کا موسم چلا آتا تھا۔ اس لیے یہ وہاں پانچ روز سے زیادہ نہ ٹھہر سکے۔ اصفہان سے کاشان کے راستے تہران آئے اور راستے میں معصومہ قم کے مزار پر حاضری دی۔ مولانا اصفہان سے چل کر ۱۰ دسمبر کو تہران میں پہنچے اور طویل دنوں کے لیے اپنا بستر کھول دیا۔ تہران اُن کی مرکزی منزل تھی اور مقصد کی پناہ وہیں تھی۔ یہاں مولانا نے قریب قریب تین ماہ بسر کیے اور ولایت کی ہواؤں کے لمس لیے، آب و دانہ سے جسم کی پرورش کی، زبان و بیان سے آشنائی کا طلسم کھولا اور منظر باغ و بلبل سے آئینہ نگاہ کو صیقل کیا۔ ایک دو دن آرام کر کے اور سفر کی تکان کو اجازتِ رخصت دے کر طہران کے گلی کوچوں میں چل نکلے۔ ایک ایک شے کو دیکھتے جاتے تھے اور سینے میں پروتے جاتے تھے۔ مولانا کو آئمہ اطہار سے جو نسبت تھی اور عقیدے کی پاکیزگی جس قدر ساتھ لے گئے تھے، وہ اصرار کرتی تھی کہ اُن کے نام پاک کی تسبیح پڑھتے جایئے اور چلے جایئے۔ یہاں جب مولانا گاہ گاہ جاتے ہیں تو اُن کے سیرِ ایران کی بیان کردہ تحریروں میں ذکرِ آلِ محمد تواتر سے ملتا ہے۔ ایک بار جب وہ مشہد کی راہ میں تھے اور قریب امام علی رضا علیہ السلام کا روضہ پُر انوار نگاہ میں آیا تو اُن کی چشمِ شیشہ سے آبِ مطہر یوں جاری ہوا کہ اشکوں کی لڑی بندھ گئی۔ گریہ رواں ہوا۔

آغا اشرف اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"آزاد کو آئمہ معصومین اور آلِ عبا سے جو روحانی تعلق تھا، اس کا اظہار سفر نامے میں اُنھوں نے جا بجا کیا ہے۔ خاص طور سے مشہد مقدس کے قریب جب یہ پہنچتے ہیں اور ایک منزل پہلے سے امام علی رضا کے مزار کا قبہ مبارک نظر آتا ہے تو اُن کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگتے ہیں اور زمین پر سجدہ شکر بجالاتے ہیں، اسی طرح راستے میں جہاں کہیں، کسی بزرگ یا صاحب کرامت کی قبر مل جاتی ہے اُس پر ٹھہر کر فاتحہ ضرور پڑھتے ہیں۔ علما اور فضلا کی جس قدر عزت اُن کے دل میں ہے اُس کا مظاہرہ شیراز، اصفہان، کاشان، بستان، نیشاپور، سبزوار، مشہد، جام اور ہرات میں حافظ، سعدی، میر باقر داماد، ملا محسن کاشانی، حضرت بایزید بسطامی، بہاالدین عاملی، شیخ بہائی، فردوسی، اسعدی، جامی، شیخ جام، امام فخرلدین رازی اور ملا حسین واعظ کاشفی کے مزاروں پر عقیدت کے پھول چڑھا کر کرتے۔
کسی گاڑی میں بڑے ترازو پر سامان تل رہا ہے، پاس ہی ایک ٹوٹی ہوئی قبر نظر آتی ہے، پوچھنے پر پتا چلتا ہے کہ یہ نادر شاہ کی قبر ہے۔ آزاد ایک لمحے کے لیے عبرت سے ٹھہر جاتے ہیں کہ اللہ اکبر، وہ نادر جس کی تلوار سے امان نہ تھی، جس کے گھوڑے کی جھپٹ سے لشکر پھوس کی طرح اُڑ جاتے تھے، وہی نادر ایک ٹوٹے چبوترے پر پڑا سوتا ہے۔ مگر رخصت ختم ہو رہی ہے، اور سفر لمبا ہے، اِس لیے کہیں تک کر دم نہیں لیتے"۔

صرف تہران میں آزاد نے قریباً تین مہینے قیام کیا۔ یہاں جو وقت علمی صحبتوں اور ادبی مجلسوں میں گزرا اُسے سیاحتِ ایران کا ماحصل سمجھنا چاہیے۔ ناصرالدین قاچار کی سیاحت یورپ سے ایران کی تاریخ میں ایک نئے باب کی ابتدا ہوتی ہے۔ اِس اثر کو آزاد نے طہران کی سوسائٹی میں سرایت کرتے دیکھا مگر اُنھیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ تمام طہران میں کوئی مشہور شاعر نہیں تھا۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ تمام اہلِ دربار قدیم شاعری اور خیال بندی کو

چھوڑ کر تاریخ فلسفے اور علم و حکمت کی طرف مائل تھے۔ پھر خود ہی لکھتے ہیں جب شاہِ ایران کی اُدھر توجہ نہیں تو پھر کس اُمید پر شاعری سے نکاح کر کے بیٹھیں۔ طہران کی علمی مجالس میں جا کر آزاد کو یہ خوشگوار احساس ہوا کہ اکثر شہزادے اور رؤسا صاحبِ تصنیف ادیب تھے اور علم و ادب کی سرپرستی کرتے تھے۔ حجت الدولہ شہزادہ فرہاد مرزا اور اُن کے صاحبزادے احتشام الملک اور مرزا رضا خان افشار بگشلو کا نام اِس سلسلے میں اُنھوں نے خاص طور سے لیا ہے۔ بہت سے شہزادے برلن اور پیرس سے تعلیم حاصل کر کے لوٹے تھے۔ اُسی عہد میں عربی الفاظ کی جگہ قدیم فارسی الفاظ کو استعمال کرنے کی تحریک کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ اِس بحث پر آزاد کی مرزا رضا خان سے جو ذی علم اور عربی فارسی ترکی اور فرنچ کے ماہر تھے، بہت دلچسپ بحث رہی۔ مرزا چاہتے تھے کہ تمام عربی الفاظ کا استعمال یک قلم موقوف کر دیا جائے۔ آزاد کی رائے تھی کہ یہ کام ایک دن کا نہیں، بتدریج کرنا چاہیے اور اِس باب میں اخبارات اور شاہی دارالترجمہ سے بھی مدد لینا ضروری ہوگی۔ یہاں یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ اِس تحریک کا عروج رضا شاہ پہلوی کے عہدِ حکومت میں ہوا اور اِس وقت ایرانی حکومت نے ایرانی اخبارات اور دارالترجمہ کی مدد سے یہ کام انجام دیے۔

تہران کے دورانِ قیام میں آزاد نے کتابوں کے انبار کے علاوہ لغت کے لیے الفاظ کے ذخیرے اور قندِ پارسی اور آموزگارِ پارسی کے لیے اہلِ زبان سے روزمرہ کے محاورے بھی جمع کیے۔ جب مارچ کے مہینے میں لشکرِ بہار کی آمد کا اعلان ہوا اور آخری برف باری ختم ہوئی تو آزاد شوق کا زادِ راہ اور عقیدت کا کارواں باندھ کر مشہدِ مقدس روانہ ہو گیا۔ مشہد سے ہرات اور قندھار کے راستے ہندوستان کو واپسی بہت مشکل اور صبر آزما ثابت ہوئی۔ مشہد سے ایک راستا بندر عباس بھی جاتا تھا۔ آزاد اُسے طویل سمجھ کر ہرات کے راستے روانہ ہوئے تھے۔ یہ قیاس غلط ثابت ہوا۔ طوالت کے علاوہ اِس راستے پر برف باری ابھی تک جاری تھی، دوسرا ایران کی سرحد سے افغانستان کے علاقے میں قدم رکھتے ہی ایرانی محبت

اور مہمان نوازی کی جگہ انھیں بار بار تعصب، جہالت اور سرد مہری کا مقابلہ کرنا پڑا۔ مصیبت پر مصیبت یہ آئی کہ قندھار کے راستے میں ایک رات نیند نے غفلت کا شب خون مارا اور آزاد اونٹ پر سے اونگھتے ہوئے گر گئے۔ سر اور گدی کے بل گرے تھے اس لیے مرنے میں کوئی کسر باقی نہیں تھی مگر خدا کی قدرت سے بچ گئے۔ سینے پر سخت چوٹ آئی اور ایک پسلی بھی ٹوٹ گئی۔ ساربان نے مردہ سمجھ کر لحاف میں لپیٹ کر، اونٹ پر ڈال کر، رسی سے کس دیا مگر خیر ہوئی صبح منزل پر پہنچ کر ہوش آ گیا اور پسلی بغیر کسی جراح کی مدد کے خود جُڑ گئی۔

ان مشکلات کے باوجود تحقیق کا شوق ایک آن کل سے بیٹھنے نہیں دیتا تھا۔ جہاں موقع ملتا، پرانی تاریخی مسجدوں اور سراؤں کے کتبے پڑھنے نکل جاتے۔ ہرات کی ایک مسجد میں کتبہ اس لیے پوری طرح نہیں پڑھ سکے کہ مسجد میں خون خوار آنکھوں والے پہاڑی ملا بیٹھے تھے۔ آزاد کو ڈر لگا کہ کہیں مار نہ دیں کیونکہ اُس زمانے میں وہاں کسی شخص کو کافر کہہ کر آسانی سے قتل کیا جا سکتا تھا۔ راستے اب سکوں کی جگہ چیزوں کا آپس میں مبادلہ ہوتا تھا۔ جہاں کہیں انھیں پانی کے نزدیک کوئی صحرا نشین قبیلہ ملتا، یہ سوئیاں، انگشتانے، کنگیاں، سُرمہ اور کالی مرچیں دے کر روٹی، دودھ دہی اور گھی اُن سے لے لیتے تھے۔ ایک جگہ کسی ملا کے پاس دو نایاب کتابیں تھیں مگر یہ کسی قیمت پر انھیں دینے کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ آزاد نے آخری ہتھیار کے طور پر اپنی ہاتھی دانت کی سُرمے دانی انھیں دکھائی، جس پر ملا صاحب کی رال ٹپک پڑی اور یہ سُرمے دانی کے بدلے کتابیں لے کر خوشی خوشی چلے آئے۔

قندھار سے کوئٹہ کا سفر صرف پانچ روز کا تھا لیکن آزاد نے یہ راستہ گیارہ روز میں طے کیا۔ راستے میں روٹیاں جو پکوا کر انھوں نے ساتھ لیں تھیں، وہ پانی میں بھیگ کر سڑ گئیں، انھیں سکھایا مگر ہر جگہ کتابیں اُن کی جان کے ساتھ تھیں۔ ایک مقام پر بہت زور کی بارش ہو رہی تھی اور زمین ایسی خراب تھی کہ اونٹ پھسلنے لگے۔ قافلہ ایک میدان میں اُتر پڑا۔ آزاد نے سب سے پہلے کتابوں کو بچایا۔ اُن پر موٹے موٹے گدیلے ڈال دیے اور خود توکل بخدا

بیٹھ گئے۔ ایک اور جگہ لکھتے ہیں کہ رات کو پھر ترشح ہوا۔ میری عجیب حالت تھی۔ کتابوں کی طرف سے تکلیف جاتی تھی مگر انشا پردازی کو بھی اس عالم میں بھی ہاتھ سے نہیں دیا۔

رفیقوں نے کارسازی کہ اونٹ بٹھائے اور باجگیروں کی آنکھوں میں ایسی خاک ڈالی کہ ایک اونٹ لاد پھاند کر اُوپر اُوپر غائب کر دیا۔ راستے میں لوگ راہ چلتے روک کر سوال کرتے تھے اور اِن سوالوں سے یہ بہت دق ہوتے تھے۔ بچے سے لے کر بوڑھے تک اور بہادر سپاہی سے لے کر بڑھیا تک ہر شخص سوال کرتا کہاں سے آئے ہو، کیوں آئے، کس راستے سے آئے ہو، کہاں کے ہو، کتابیں کیوں لائے ہو، اتنی کتابیں کیوں لائے ہو، انھیں کیا کرو گے، یہ کیا کیا کتابیں ہیں، کس کس علم کی کتابیں ہیں، تم اِس رستے کیوں آئے ہو، یہاں کیوں بیٹھے ہو، کس رستے جاؤ گے، اِس رستے کیوں جاتے ہو، الٰہی تری پناہ۔ اِن تمام منازل کو طے کرنے کے بعد وطن پہنچنے کا جو نقشہ آزاد نے کھینچا ہے یہ ایک ایسے عاشق کی تصویر ہے، جو الف لیلیٰ کے ہیرو کی طرح ہفت خوان رستم طے کرنے کے بعد اپنی منزل پہنچا ہو۔ کس اہتمام سے آزاد کتابیں لے کر اپنے مشن کی تکمیل کے بعد کوئٹہ سے روانہ ہوتے ہیں

"ایک چھکڑا کرائے پر لیا، اس میں کتابیں لادیں اور آپ بچھونے بچھا کر اُوپر بیٹھا، دو دن ایک رات میں رندلی پہنچا، وہاں سے ریل میں بیٹھ کر (جولائی ۱۸۸۶ میں لاہور) حاضر خدمت ہوا"۔

گھر اُس کے جا کے آتے ہیں پامال ہو کے ہم
کریے مکاں ہی اب سرِ بازار ایک طرح

اندرون شیراں والا گیٹ بنگلہ ایوب شاہ

مولوی محمد حسین آزاد تعلیمات کے محکمے میں ملازم ہونے کے بعد تمام عمر لاہور میں رہے۔ وہ گاہے دہلی کی طرف نکل جاتے رہے اور وہاں کئی کئی دن دوست واحباب کے ساتھ گزارتے تھے پھر لاہور چلے آتے تھے۔ اسی سلسلے میں علامہ رشد الخیری صاحب ایک واقعہ سناتے ہیں۔

انقلاب ۱۸۵۷ کے بعد جب شاہجہان آباد پر انگریزی تسلط پوری طرح ہو گیا تو حکومت کا اثر محکوم پر پڑنا تجدید تھی۔ غدر کو پچیس تیس سال ہو گئے تھے۔ ایک شام کا ذکر ہے، شمس العلما منشی ذکا اللہ، جو چیلوں کے کوچے میں رہتے تھے، روزانہ شام چھ بجے گھر سے نکلتے تھے اور ٹاؤن ہال آجاتے تھے۔ یہ کمپنی باغ میں تھا جہاں اب کمیٹی کا دفتر ہے۔ بتاشوں کی گلی سے مولوی نذیر احمد، دریبہ سے ماسٹر پیارے لال، اور اکثر رہٹ کے کنویں سے مولوی ضیالدین بھی آتے تھے تو مولوی نذیر احمد کے ہاں پہنچ جاتے تھے۔ چنانچہ جس شام کی یہ صحبت ہے اُس روز مولوی نذیر احمد کے مکان پر منشی ذکا اللہ آگئے تھے۔ مَیں کچھ رشتہ کے، کچھ شاگردی کے تعلق کی وجہ سے زیادہ وقت مولوی نذیر احمد صاحب کی خدمت میں بسر کرتا تھا۔ یہ دونوں بزرگ ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے کہ محض اتفاق سے مولانا آزاد تشریف لے آئے۔ مولوی نذیر احمد پیدل ٹاؤن ہال جاتے تھے اور آٹھ نو بجے تک تشریف رکھتے

تھے۔ اُن کے پاس وکٹوریہ گاڑی تھی۔ کبھی کبھی ہوا خوری کو اُس میں نکل جاتے تھے۔ اُس دن مولانا آزاد کے آنے پر اُنھوں نے گاڑی کا حکم دیا اور تینوں باہر نکلے۔ مَیں ہم رکاب تھا۔ سامنے کی سیٹ پر بیٹھنے میں کچھ دیر تکلف رہا۔ آخر کوچوان کے ساتھ میں، مولوی ذکاءاللہ سامنے اور مولوی نذیر احمد اور مولانا آزاد بڑی سیٹ پر بیٹھے۔ کھاری باولی میں مولانا حالی سے ملاقات ہوئی، مولانا آزاد کے اصرار پر وہ بھی اندر تشریف لے آئے اور ہمارے برابر بیٹھ گئے۔ مَیں اُس وقت شاید نویں جماعت میں تھا اور مولانا حالی سے پڑھتا تھا۔ ہمارا زمانہ طالب علمی آج کے زمانہ سے مختلف تھا۔ آج کے اُستاد برابر کے دوست ہیں اُس وقت ڈر کے مارے اُستاد کے سامنے آنکھ اُٹھانی بھی مشکل تھی۔ مَیں سکڑ رہا تھا۔ کئی دفعہ ارادہ کیا کہ آگے جا کر کوچوان کے ساتھ بیٹھ جاوں لیکن اجازت نہ ملی۔

گفتگو شاعری پر ہونے لگی اور ذوق و غالب کا مقابلہ شروع ہو گیا یہاں تک کہ لاہوری دروازے کے باہر پہنچے۔ یہ مقام اِس وقت گلزار بنا ہوا ہے، دو منزلہ سہ منزلہ عمارتیں ہیں، گنجان آبادی ہے۔ منڈی ہے، دکانیں ہیں، اُس وقت جنگل بیابان تھا۔ جہاں ایک مسجد کے سوا، جو شاید ابھی تک موجود ہے یہاں کچھ نہ تھا۔ ایک طرف کچھ لڑکے گلی ڈنڈا کھیل رہے تھے۔ دوسری طرف کبڈی ہو رہی تھی اور سڑک کے برابر مداری تماشا کر رہا تھا۔

زندگی اُن لوگوں میں بھی تھی۔ مولانا آزاد کی تحریک، مولوی نذیر احمد کی تائید اور منشی ذکاءاللہ کی خواہش پر گاڑی روک ٹھہرائی گئی اور مداری نے پوری طاقت سے اپنے کرتب دکھانے شروع کیے مولوی نذیر احمد اور مولانا حالی میرے اُستاد تھے۔ مولانا آزاد اور منشی ذکاءاللہ واجب الاحترام بزرگ اس لیے مَیں اُن کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ہاں مجھے تعجب ضرور ہے کہ یہ مداری کے اِس راگ میں باوجود علم و فضل کے کیوں کر آ گئے کہ وہ سانپ اور نیولے کی کشتی دکھائے گا۔ مگر مداری کا راگ اور چیز ہے اور اِن کی قابلیت دوسری چیز یہ آخر وقت تک یہی سمجھے رہے کہ کشتی اب ہوئی حالانکہ اُس کے پاس ایک نیولا تھا اور ایک سانپ

تھا۔ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک زخمی ہوتا۔اگر مداری اس طرح سے روز کشتیاں دکھاتا تو
اُس کو ایسا کیا مل جاتا کہ روز سانپ اور نیولے لاتا۔ایک چونی مولانا آزاد نے اور اسی
طرح سے تینوں نے دو دو آنے، چار چار آنے دیے اور مداری سب پیسے خلطے میں رکھ سیدھا
ہولیا۔اِن سب نے کہا کشتی دکھاو مگر وہ ہنس کرٹالتا ہوا یہ جا وہ جا۔

گاڑی میں کچھ دیر مداری کے متعلق بحث رہی، آخر مولوی نذیر احمد نے وہی غالب و
ذوق والا مضمون چھیڑ دیا مولانا حالی کا واسطہ غالب سے تھا اور مولانا آزاد کا ذوق سے
۔دونوں بزرگ اپنے اپنے ثبوت پیش کر رہے تھے اور منشی ذکا اللہ اور مولوی نذیر احمد بحث
کے مزے لُوٹ رہے تھے۔مولانا آزاد نے کہا نثر ہو یا نظم، اگر لطفِ زبان نہ ہو تو سب بے
کار ہے۔مولوی حالی کی رائے تھی کہ لطفِ زبان ہو تو سبحان اللہ مگر اصلی جوہر تخیل ہے۔اگر
یہ نہیں تو محض زبان کو لے کر چاٹا کیجیے۔مجھے تعجب ہے کہ اِن بزرگوں کی نظر کس قدر وسیع،
حافظہ کیسا پختہ اور ذہن کیسا رسا تھا۔طرفین سے سینکڑوں شعر برسنے لگے۔مولانا آزاد نے
سینکڑوں شعر نواب مرزا شوق کے پڑھ ڈالے، میر حسن اور مرزا شوق کا مقابلہ تھا، فراق کی
کیفیت میں مولانا آزاد نے شوق کا یہ شعر پڑھا۔

طلاطم میں شب بھر طبیعت رہی
نہ صورت رہی وہ نہ رنگت رہی

اِس شعر کی چاروں نے داد دی۔مولانا حالی نے اِسی کیفیت میں میر حسن کا یہ شعر فرمایا

نہ ملنے کے دکھ اُس کے سب نے سہے
مگر اپنے جی سے وہ جیتا رہے

اِس کی سراہت مولانا نے کچھ ایسے کی کہ سب آبدیدہ ہو گئے۔مَیں اُس وقت تو خاک
نہ سمجھا مگر اب اِس شعر کا لطف آتا ہے سبحان اللہ

محبت کی اِس سے زیادہ کیفیت کیا ہوگی۔اِس کے بعد پھر وہی غالب اور ذوق کے

شعر کی گردان اور لطفِ بیان کی رت شروع ہوئی۔ ذوق کے اس شعر پر سب نے بے ساختہ مرحبا کہا۔

یہ نصیب اللہ اکبر لوٹنے کی جائے ہے
سر بوقتِ ذبح اپنا اُس کے زیرِ پائے ہے

زبان کے اعتبار سے مولانا حالی نے غالب کے بہت سے شعر پڑھے مگر وہ بات پیدا نہ ہو سکی لیکن اُن کے اس شعر کو سب نے پسند کیا اور نزاکتِ خیال کی داد دی۔

وہ بادہ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھیے کہ بس اب کے لذتِ خوابِ سحر گئی"

لاہور میں اُنھوں نے اپنی زندگی کے اُن ایام میں جب وہ عالمِ جذب میں نہیں گئے تھے، کبھی اپنا مکان مول لے کر نہیں رہے بلکہ ایک سے دوسرے مکان میں کرائے پر منتقل ہوتے رہے ہیں

لطف اللہ گو ہر ایک جگہ لکھتے ہیں:

"آزاد نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ لاہور میں گزارا، پہلے مستی دروازے، پھر بنگلہ ایوب شاہ اور بعد میں شاہ محمد غوث کی درگاہ سے ملحق اپنے کتب خانے میں چلے آئے مگر کچھ عرصہ بعد آزاد اپنے اکبری منڈی کے مکان میں منتقل ہو گئے"۔

اُن کے تمام مکانوں کی تفصیل جہاں وہ رُکے ہیں، ہمارے پاس محفوظ تو نہیں رہی۔ خاص کر مستی دروازے میں وہ کس جگہ رہے۔ اِس کی خبر ابھی تک نہ ہو سکی مگر دو جگہیں ایسی ہیں، جہاں اُنھوں نے اپنی زندگی کے بیشتر دن گزارے ہیں۔ اِن دو میں سے پہلا مکان بنگلہ ایوب شاہ والا تھا۔ بنگلہ ایوب شاہ کہاں واقع ہے، اِس بارے میں اصلاً کسی کو معلوم نہیں تھا، مَیں کافی عرصے سے اِس کی تلاش میں مارا مارا پھرا۔ آغا سلمان باقر سے جب رجوع کیا

فصیل یہاں سے بالکل سلامت ہے اور تیس فٹ تک اونچی ہے۔ گیٹ بھی اُسی پرانی طرز پر باقی ہے۔ فصیل کے باہر دیوار کے ساتھ بہت کھلی اور وسیع جگہ چلنے پھرنے کو موجود ہے کہ یہاں کسی گاڑی اور ٹریفک کا گزر نہیں ہے یا پھر ہم اتوار کو گئے تھے اور تب وہاں سب کچھ بند بند تھا۔ چھوٹی اینٹوں سے دیوار کے ساتھ ساتھ فرش دور تک بچھا ہوا ہے اور سامنے اُس کے باغ در باغ ہیں۔ ہم نے اِس گیٹ سے اندر داخل ہو کر کئی گلیاں اور محلے چھان مارے بیسیوں آدمیوں سے سُن گن لی، یہاں تک کہ رات کے دس بج گئے۔ ایک جگہ ایک لڑکا ملا، اُس نے کہا، مجھے اُس بنگلے کی خبر ہے کہ کہاں واقع ہے، مَیں تمھیں لیے چلتا ہوں۔ تب ہم اُس کے پیچھے پیچھے چلے اور چند ہی ثانیوں بعد وہ ہمیں ایک کھنڈر میں لے گیا۔ وہاں ایک تختی بنگلہ ایوب شاہ کی لگی تھی۔ اردگرد کے تمام احاطے کو لوہے اور پینا فلیکس کی چادروں سے چھپایا ہوا تھا۔ ہم ایک دیوار سے چڑھ کر اُوپر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ہر شے تہس نہس تھی۔ کچھ بُرجیاں، کچھ ستون اور چند ٹوٹی پھوٹی اینٹوں کی دیواریں کھڑی تھی، جن پر حکومت کی طرف سے نوٹس لگے تھے کہ خبردار یہاں کسی کو قبضہ کرنے کی اجازت نہیں۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ یہاں اردو ادب کے ایک نابغے کے بیس سال گزرے ہیں۔ جی ہاں یہی وہ گھر تھا، جس میں مولوی آزاد ڈاکخانے میں نوکری سے لے کر محکمہ تعلیم اور پھر پروفیسر بننے تک رہے ہیں۔ بنگلہ ایوب شاہ کی حقیقت یہ ہے کہ یہ بنگلہ ۱۸۴۹ میں تعمیر کیا گیا تھا جو وقت کے ساتھ خستہ ہو گیا۔ اِس بنگلے کی تین منزلیں تھیں۔ بعد میں اِسے افغانستان سے آئے ہوئے ایک آدمی ایوب شاہ نے خرید لیا اور بنگلے کی نئے سرے سے تعمیر کی اور اُس کے بعد اِسے افغانستان کے شہزادے سلطان کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ ۱۹۶۰ میں اِس کے مالک خاندان نے بنگلے کا بیشتر حصہ فروخت کر دیا اور ایک حصہ رہ گیا۔ بنگلہ ایوب شاہ کے اندر سے سُرنگیں دریا تک جاتی تھیں اور فرار ہونے کا راستہ رکھا گیا تھا۔ اُس کے بعد یہ بنگلہ گر کر تباہ ہو گیا۔ آج کل یہ عمارت بالکل مسمار ہو چکی ہے، بس ایک کھنڈر موجود ہے۔ یہ بھی کوئی دن

تو انھوں نے فقط اتنا کہا کہ یہ شیرانوالا گیٹ اندرون لاہور میں کہیں موجود تھا لیکن باوجود کافی تلاش وجستجو کے، ابھی تک انھیں نہیں ملا۔ میں نے خود کئی بار شیرانوالا کے اندر جا کر مختلف گلیوں کے بیسیوں چکر گھمائے مگر اُس خاص بنگلے یا مکان کا پتا نہ پایا جہاں مولانا نے بسران کیا تھا۔ اول تو مسئلہ یہ تھا کہ جس کو شیرانوالا گیٹ کہا جاتا ہے اُس کو کشمیری گیٹ بھی کہا جاتا ہے۔ ایک انجان آدمی کو یہ نہیں پتا چلتا کہ یہ دونوں ایک ہی گیٹ کے نام ہیں، دوسرا امر یہاں یہ ہے کہ آپ شیرانوالا گیٹ سے اندرون میں داخل ہوں تو اِس پورے علاقے کو جس میں کوئی چار ہزار گھر ہوں گے سب کو بنگلہ ایوب شاہ کہا جاتا ہے۔ اب ہمارے لیے مشکل یہ تھا کہ مولوی صاحب کا یہاں کس جگہ مقام تھا۔ اِس گیٹ سے اندر داخل ہونے کے بعد خاص کر جن تنگ گلیوں اور کوچوں سے واسطہ پڑتا ہے وہ آج کی بھیڑ میں طے کرنا کار مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے۔ ایک سے دوسری گلی ایسے پھنسی ہوئی نکلتی ہے کہ کسی طرف سے جائے پناہ نہیں بنتی۔ سینکڑوں انسان ایک ہی وقت میں یہاں ایک ہی جگہ گھوم رہے ہوتے ہیں۔ آپ کسی سے بھی رستہ پوچھنے کی کوشش کریں وہ لاپتا ہونے کی خبر دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اندرون شہر کی اکثر قدیم آبادی نئے علاقوں میں منتقل ہو چکی ہے اور پرانی گلیوں میں بیشتر پٹھان سرحدی علاقوں سے آن آباد ہوئے ہیں۔ اُن کو کسی شے کی خبر نہیں ہے۔ اب وہی اُن کوچوں اور گلیوں کے وارث بنے بیٹھے ہیں۔ کچھ پتا پوچھو وہ لاعلمی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دن قسمت کی بات دیکھیے یہ معما بھی حل ہو گیا۔ معاملہ یہ ہوا کہ میں مرزا اسکندر بیگ اور ارسلان احمد راٹھور صاحب، تینوں پھر اُس کی تلاش میں نکلے۔ اول جا کر شیرانوالا گیٹ کے سامنے پہنچ کر دو گھڑی سانس لی۔ یہ جگہ سچ پوچھیں تو لاہور میں اپنی طرز کی ایک نایاب تعمیر ہے۔ گیٹ کے سامنے دو پیپل کے درخت بہت پرانے دائیں بائیں کھڑے ہیں اور سایہ اِن کا نیچے بنی ہوئی دکانوں کے چبوتروں پر صبح شام چھاؤں کرتا ہے۔ دروازے کے آگے وسیع باغات ہیں اور گیٹ ایک ٹیلے کی سی کیفیت میں ہے۔ شہر کی

ہے۔ خیر یہی وہ شیرانوالا گیٹ ہے جہاں سے باہر نکل کر مولانا سامنے کے باغوں میں چلتے چلتے گورنمنٹ کالج تک آتے تھے اور اُن کا گھوڑا اُن کے ساتھ ساتھ چلا آتا تھا۔ یہیں باغوں میں وہ نہر بہتی تھی جس کے سائے مولوی صاحب چہل قدمی کیا کرتے تھے۔ اس بنگلے میں جانے کے لیے آپ کی راہنمائی کیے دیتے ہیں۔

اگر آپ شیرانوالا گیٹ سے شہر میں داخل ہوں تو سیدھی گلی چلتے ہوئے آپ کے دائیں ہاتھ میں ایک سکول آئے گا۔ اس سکول کے سامنے نکو سے بائیں ہاتھ ایک گلی نکلے گی۔ آپ اس گلی میں داخل ہو جائیں۔ گلی میں بائیں ہاتھ کے دو گھر چھوڑ کے سامنے ایک بڑا گیٹ آتا ہے۔ اُس کے اندر ایک حویلی ہے، اسے بنگلہ ایوب شاہ کی حویلی کہتے ہیں۔ اس مکان کا ایک حصہ مولوی محمد حسین آزاد نے کرائے پر لیے رکھا اور کافی دیر یعنی زندگی کے بیس سال یہاں قیام پذیر رہے۔ یہی وہ مکان تھا جہاں اُن کی پھوپھی رہتی تھیں۔ یہ پھوپھی مرزا محمد علی کی والدہ تھیں اور آزاد کو بہت عزیز رکھتی تھیں۔ اسی مکان کو ایک بار آگ نے لپک لیا اور گھر کا سب کچھ جل کر راکھ ہو گیا۔ یہاں تک کہ اسی مکان میں آزاد کی پھوپھی بھی جل مری۔ شیرانوالا گیٹ سے اکبری دروازے تک اور دوسری طرف داتا صاحب کے مقبرے تک یہ علاقہ باغات سے گھرا ہوا تھا اور اندرون لاہور کے اردگرد بھی باغات کی پوری فصل ہوا کرتی تھی اور جہاں آجکل سرکلر روڈ ہے، یہ نہر ہوا کرتی تھی، جسے راوی سے کاٹ کر ان باغات میں پھیرا گیا تھا۔ مولوی آزاد صاحب اکثر جب گورنمنٹ کالج جاتے تو اس بنگلہ ایوب شاہ سے نکل کر اور باغات کے بیچوں بیچ سے ہو کر پہلے کربلا گامے شاہ آتے، وہاں سلام کرتے، اس کے بعد گورنمنٹ کالج چلے آتے۔ ایک گھوڑا اُن کے پاس ہوتا تھا۔ وہ اُس پر کبھی بیٹھتے نہ تھے۔ بس پہلو بہ پہلو پھرائے چلے لاتے تھے۔ کبھی اُن کے شاگرد ساتھ ہو لیتے۔ گورنمنٹ کالج کی ملازمت کے آخری دنوں میں مولانا کا روحانیت کی طرف رجوع بہت ہو گیا تھا۔ ان دنوں اُنھوں نے گھوڑا چھوڑ دیا تھا اور ایک گدڑی کاندھے پر رکھ

لی تھی۔ تب ایک بزرگ سید بدھن شاہ کے مزار کے متولی سید دھیان شاہ سے اُن کی بہت جذباتی اور روحانی نسبت بڑھ گئی۔ سید دھیان شاہ اُن دِنوں لاہور کے مضافات میں ایک آبادی نواں کوٹ میں رہتے تھے جہاں سید بدھن شاہ کا مزار تھا۔ وہ یہاں باہر کے کسی دیار سے آئے تھے۔ عمر اُن کی نوے سال کے قریب تھی اور آزاد کی نظر میں بہت اللہ والے تھے۔ مولوی آزاد ہر دوسرے دن اُنھیں پیدل ملنے آتے۔ پیدل کا سفر دراصل مولانا کی گھٹی میں پڑ چکا تھا۔ وہ جس طرف چاہتے میلوں پیدل نکل جاتے اور کبھی کئی کئی دن باہر دور دور تک چلے جاتے۔ ایک دفعہ شام کے قریب پیر سید دھیان شاہ کے پاس پہنچے، اُنھوں نے کہا، آزاد میاں، مجھے تیرے واسطے دہلی کا حکم ملا ہے، تُو فوراً دہلی نکل جا۔ مولانا کو سید دھیان شاہ کے حکم پر اِس قدر یقین تھا کہ وہ وہیں سے دہلی کو روانہ ہو گئے۔ تب بھی اُن کے پاس نہ گھوڑا تھا اور نہ دوسرا کچھ سامان سفر کا تھا۔ سب جانتے ہیں لاہور سے دہلی کا سفر کم و بیش پانچ سو کلو میٹر کا ضرور ہے۔ یہ تمام سفر مولانا نے پیدل طے کیا اور پچیس دن بعد دہلی جا پہنچے۔ لوگوں نے جب مولانا کو دہلی میں دیکھا تو سب حیران پریشان ہو گئے۔ ایک دم میں نقارہ پٹ گیا کہ مولانا دہلی آئے ہیں۔ اُس قت اِن کے دماغ کا اختلال بہت کچھ زیادہ ہو چکا تھا ۔ اتنا پیدل سفر کرنے سے اِن کے پاؤں سوج چکے تھے اور خون جاری ہو گیا تھا۔ کپڑوں اور چہرے کی حالت فقیروں جیسی ہو گئی۔ لوگ اُن کی حالت پر بہت افسوس کر رہے تھے۔ اِدھر یہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ باپ دادا کی قبروں پر گئے، فاتحہ پڑھی اور بے نیازی سے بازاروں میں پھرتے تھے۔ دہلی میں اِن کے بچپن کے دوست مولوی ذکا اللہ تھے۔ مولانا اُن سے بہت مانوس تھے۔ آخر وہ آئے اور مولانا کو اپنے گھر لے گئے، اِنھیں نہلایا دُھلایا، کپڑے پہنائے اور پاؤں کا علاج معالجہ کیا۔ یہاں تک کہ لاہور سے آغا ابراہیم دہلی پہنچے اور اُنھیں لے کر واپس آئے۔

دیکھو نہ چشمِ کم سے معمورۂ جہاں کو
بنتا ہے ایک گھڑیاں سو صورتیں بگڑ کر

اندرون لاہور! اکبری منڈی میں سکونت

مولانا نے لاہور میں بہت سے مکان تبدیل کیے اور وہ ہمیشہ کرائے پر مسکن اُٹھاتے رہے۔ یہاں تک کہ ۱۸۹۰ میں وہ مکمل طور پر جذب میں چلے گئے۔ اُن ایام میں اُن کے بیٹے آغا ابراہیم امرتسر میں جج تھے۔ خود مولانا کی یافت اتنی تھی کہ وہ آغا ابراہیم کے کام آسانی سے آ رہی تھی۔ مولانا کی کتابوں کی رائلٹی، اُن کی پینشن ،مِل ملا کر بہت کچھ بچت ہو جاتی تھی، اِدھر مولانا کا ذاتی خرچہ کچھ نہ رہا تھا، فقط علاج معالجہ کی بات تھی، اور وہ بھی ایسا تھا کہ مولانا کبھی ہاتھ نہ آتے تھے۔ علاج پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ آغا ابراہیم کی تنخواہ بھی کافی تھی۔ اُنھوں نے موقع کو غنیمت جانا اور اندرون لاہور موچی دروازے کے اندر ایک وسیع جگہ خرید کر، وہاں اپنا مکان بنوالیا اور وہیں مکان کے اندر ایک امام بارگاہ بنوائی، اُسی کے ساتھ دو کمرے مولانا کے سونے بیٹھنے اور لکھنے پڑھنے کو رکھے اور اُس کے بائیں ہاتھ ایک کمرہ مہمانوں کے لیے بنوایا۔ مکان میں داخل ہونے کے لیے پہلے ایک ڈیوڑھی آتی تھی۔ اِس کی چھت نوے درجے کی ڈاٹ کی گولائی میں ہے۔ چھت کی اُونچائی مشکل سے دس فٹ ہوگی۔ یہ ڈیوڑھی اٹھارہ فٹ طویل اور بارہ فٹ چوڑی ہے۔ ڈیوڑھی کے سامنے ایک چھوٹا سا صحن ہے، صحن کے بائیں ہاتھ مہمانوں کے بیٹھنے کا مقام یعنی کمرہ ہے۔ اِسی کمرے میں ڈاکٹر محمد صادق ڈھائی سال رہے ہیں اور مولانا پر تحقیق کا کام کرتے رہے ہیں۔ یہ کمرہ

آج بھی اُسی حالت میں موجود ہے۔ صحن کے سامنے مولانا کا ایک کمرہ گولائی میں تھا مگر اِب جن لوگوں کے پاس اس مکان کا قبضہ ہے اُنھوں نے اِسے گرا کر چوکونہ کر دیا ہے۔ اسی میں مولانا بیٹھتے تھے، لکھتے پڑھتے تھے۔ اس مکان سے دائیں جانب امام باڑہ تھا، اس امام باڑے کے صحن میں مولانا اکثر چارپائی بچھا کر پڑھا کرتے اور دھوپ سینکا کرتے تھے۔ آج کل یہ امام باڑہ جوتوں اور مٹھائی وغیرہ کے ڈبوں کا سٹور بن چکا ہے۔ مولانا کے کمرے کے بائیں جانب سے سیڑھیاں اُوپر کو اُٹھتی ہیں۔ اِن پر سے ہوتے ہوئے دوسری منزل آتی ہے۔ گھر کی خواتین اور دوسرا کنبہ اِسی اُوپر والے حصے میں بستا تھا۔ بیٹا ابراہیم بھی اوپر بسیرا رکھتا تھا۔ اس مکان میں جانے کے لیے تین راستے اہم ہیں۔ ایک راستہ موچی دروازے سے ہے۔ جب آپ سرکلر روڈ سے موچی دروازے میں داخل ہوں تو کچھ ہی دور تک ایک گلی میں چلتے ہوئے ایک چھوٹا سا تراہا آتا ہے، اِسے چوک نواب صاحب کا تراہا کہتے ہیں۔ اس چوک نواب کے تراہے سے ایک گلی بائیں ہاتھ کو نثار حویلی اور مبارک حویلی کی طرف نکلتی ہے۔ یہ علاقہ زیادہ تر شیعہ آبادی پر منحصر ہے۔ شاید یہاں آغا ابراہیم کو مکان بنوانا کچھ اس لیے بھی مناسب لگا۔ نثار حویلی اور مبارک حویلی یوں سمجھ لیں مولانا کے مکان کے پچھواڑے میں ہیں۔ مولانا اکثر یہاں مجلسوں میں سلام، منقبت، اور نوحے پڑھا کرتے تھے۔ تراہے سے دائیں ہاتھ کو ایک گلی اور نکلتی ہے۔ اسی گلی میں مولانا کا یہ مکان ہے اور نواب کے تراہے سے دو گھر چھوڑ کر گلی کے بائیں ہاتھ کا تیسرا گھر مولانا کا ہے۔ اس گلی کو آزاد بازار کہا جاتا تھا۔ آج بھی کاغذات میں اِس کا نام آزاد بازار ہی ہے مگر اکثر لوگوں کو علم نہیں ہے۔ ہاں کچھ بڑی عمر کے یہاں بسنے والے جانتے ہیں۔ اسی بازار میں جب آگے نکلیں گے تو اکبری منڈی شروع ہو جاتی ہے۔ بلکہ اس علاقے کو بھی اکبری منڈی کا علاقہ ہی کہا جاتا ہے۔ تیسرا راستہ اِس مکان کی طرف دہلی دروازے اور کشمیری بازار سے ہو کر آتا ہے۔ جب آپ کشمیری بازار سے دہلی دروازے کی طرف آ رہے ہوں تو سنہری مسجد کے

اگواڑے سے دائیں ہاتھ کی چھوٹی گلی کو مُڑ جائیں۔ یہ گلی بل کھاتی ہوئی اور مختلف چھوٹی تنگ گلیاں بناتی ہوئی خلیفہ بیکری کے پاس سے ہو کر سیدھی نثار حویلی کی طرف آ نکلے گی۔ نثار حویلی سے آگے وہی تراہا دوبارہ آ جائے گا جس کا ذکر ہم نے پہلے کیا ہے۔

میں اس مکان تک کیسے پہنچا، یہ ایک الگ داستان ہے اور بہت دلچسپ ہے۔ حقیقت کچھ یوں ہے۔ جس وقت میں مولانا کی تمام کتابیں پڑھ چکا تھا، تب میری عمر سولہ سترہ برس تھی اور میں مولانا کا عاشق و شیدا ہو چکا تھا۔ اکثر خواب میں مولانا کو دیکھتا تھا۔ تب میں اوکاڑا کے ایک گاؤں میں رہتا تھا اور غریب ایسا تھا کہ کہیں ایک پائی جیب میں نہ ہوتی تھی۔ اُس وقت میں نے محنت مزدوری بھی شروع کر دی تھی۔ اوکاڑا میں اکثر پھرتا تھا۔ اوکاڑا کی ایک امام بارگاہ ایوانِ حسین میں بہت جانا ہوتا تھا۔ وہیں ایک دن مجھے نفیس حیدر صاحب ملے۔ اُن کی اوکاڑا میں موٹروں کی ایک ورکشاپ تھی اور سیکنڈ ہینڈ سامان بیچتے تھے۔ جب میری اُن سے بات چلی تو پتا چلا کہ وہ اچھے خاصے پڑھے لکھے اور کتابیں پڑھنے کا اُنھیں جنون ہے۔ ایک دن وہ مجھے اوکاڑا کے کرپا رام محلہ میں اپنے گھر لے گئے۔ یہ کرپا رام محلہ وہی ہے جہاں جدید اردو غزل کے شاعر ظفر اقبال کا گھر ہے۔ دیکھا تو وہاں ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ وہیں اُن کے والد صاحب مجتبیٰ حیدر فرشی نشست پر بیٹھے تھے اور کچھ اُوپر نوّے سال اُن کی عمر تھی۔ نفیس حیدر نے میرا اُن سے تعارف کرایا۔ تب تو مجھے ایک خزانہ ہاتھ آ گیا۔ اُن کے گھر میں بے شمار کتابیں ادب، تاریخ اور مذہب پر موجود تھیں۔ لیجیے اب نفیس حیدر کا گھر میرا قیام خانہ ہو گیا۔ ایک دن وہیں مولانا محمد حسین آزاد کا ذکر چھڑ گیا۔

مجتبیٰ حیدر صاحب نے مجھے کہا، میں نے بچپن میں اُنھیں دیکھا ہے، یہ ۱۹۰۹ کی بات ہے۔ جب میری عمر ے سال تھی اور میں اپنے والد کے ساتھ کربلا گامے شاہ گیا تھا۔ ان دنوں لاہور اور مضافات کے شیعوں کے لیے بی بی پاک دامن اور کربلا گامے شاہ ہی دو بڑی زیارت گاہیں تھیں۔ میں زیارت کرنے کے لیے آگے بڑھا تو امام پاک کی ضریح کے پاس

ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا۔ سر پر بڑی پگڑی بندھی تھی۔ ایک کپڑے کا تھیلا پاس رکھا تھا۔ اُس کے اندر کچھ کاغذات تھے۔ سفید پاجامہ تھا اور سفید ہی کُرتا تھا مگر دونوں کچھ میلے سے ہو گئے تھے۔ ہر طرف سے بے نیاز کچھ منہ ہی منہ میں پڑھ رہے تھے۔ میرے والد نے اُنھیں سلام کیا، اُنھوں نے غالباً اُس کا کوئی جواب نہ دیا، یا اگر جواب دیا تو بالکل سرسری سا کہ مجھے پتا نہ چلا اور ویسے ہی بیٹھے رہے۔ پھر والد صاحب نے مجھے کہا، آگے بڑھ کر مولانا کو سلام کہو، یہ بہت بڑے بزرگ اور مولا حسین کی بارگاہ میں مقبول ہیں۔ مَیں نے جیسے ہی آگے بڑھ کر اُن کو سلام کیا، وہ ایک دم متوجہ ہو گئے۔ کچھ دیر کو ایک ٹکٹکی باندھ کر مجھے دیکھا، پھر میرے سر پر ہاتھ رکھا، اُس کے بعد دونوں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر دعا دینے لگے۔ اُن کی یہ دعا بہت طویل ہو گئی۔ دعا پڑھ کر مجھ پر ایک پھونک ماری۔ پھونک مار کر جلدی سے اپنا کپڑے کا تھیلا اُٹھایا اور اُلٹے قدموں ہو کر باہر نکل گئے۔ اُس کے بعد یہ جا وہ جا، گامے شاہ کے باغیچے سے گویا بھاگ ہی تو گئے۔ اُن کو جاتے ہوئے لوگ دُور تک دیکھتے رہے مگر آگے بڑھ کر کسی نے نہ اُنھیں روکا، نہ سلام کیا۔ بس کھڑے دیکھتے رہے۔ یہ نظارہ میرے لیے ایسا تھا جیسے کوئی آدمی کسی دوسری دنیا کا ہو اور مسافر ہو کر یہاں پھرتا ہو۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے اپنے والد سے پوچھا، ابا جی یہ کون بابا تھا؟ اُنھوں نے کہا، یہ اردو کے سب سے بڑے ادیب اور شاعر پروفیسر محمد حسین آزاد ہیں اور شمس العلما بھی ہیں اور ولی اللہ بھی ہیں۔ اُس وقت مجھے اِن چیزوں کی کوئی سمجھ نہیں تھی۔ مَیں نے اپنے والد صاحب سے پوچھا! یہ لوگ اِن سے ڈرتے کیوں ہیں اور آپ کے سلام کا بھی اُنھوں نے کوئی جواب دیا؟ والد صاحب نے کہا، وہ بس اپنے موڈ کے بندے ہیں، کہتے ہیں اِن پر بہت صدمے گزرے ہیں جس کی وجہ سے جذب میں چلے گئے ہیں، مَیں نے اُنھیں کئی بار اِسی طرح دیکھا ہے۔

تب مجھے اِن چیزوں کی کچھ سمجھ نہیں تھی۔ بعد میں جب میں نے ان کی کتابیں پڑھیں تو اندازہ ہوا میں کتنے بڑے آدمی سے ملا ہوں اور اُن سے دعا لی ہے۔ شاید اُس دعا کا

اثر ہے کہ خدا نے میری تمام عمر آلِ محمد سے مودت، علم اور کتابوں کی محبت میں صرف کرا دی۔

اُدھر تو مجتبیٰ صاحب کی یہ باتیں چل رہی تھیں، اِدھر میرے آنسو جاری تھے۔ یہ اُن کا مولانا کو دیکھنے کا پہلا اور آخری موقع تھا۔ اُن کی اس گفتگو سے میری تشنگی بہت بڑھ گئی۔ مَیں نے اُن سے مولانا کے مکان کا پوچھا کہ وہ کہاں ہے؟ اور پوچھا! کیا بعد میں اُن کے بیٹے سے نہیں ملے؟ اور اُن کا مکان لاہور کے کسی حصے میں آج بھی ہے یا نہیں؟ اُنھوں نے کہا! بیٹے اُن کا مکان تو مَیں نے نہیں دیکھا، نہ مَیں اُن کے بیٹے سے ملا البتہ کتابوں میں لکھا ہے کہ وہ کہیں اکبری منڈی کے آس پاس واقع ہے اور اس وقت اُن کے پوتے بھی وہیں رہتے ہیں۔ اس بات سے میرا اشتیاق وہ گھر دیکھنے کا ایسا بڑھا کہ بے چین رہنے لگا لیکن اُن دِنوں میرے افلاس کی حالت یہ تھی کہ اکثر کتابیں بھی چوری اُڑا کر پڑھا کرتا تھا اور مولانا پر تحقیق کی کتابیں نہیں پڑھی تھیں اِس لیے لاہور جا کر مولانا کی اولاد اور اُن کا گھر ڈھونڈنا آسان نہ تھا۔ اِدھر میری لاہور کے ادبی لوگوں یا ادبی اداروں سے دُور دُور تک صاحب سلامت نہ تھی۔ دو بار ایسا ہوا کہ اوکاڑا سے ریل پر بیٹھ کر لاہور آیا اور اکبری منڈی میں اِدھر اُدھر پھر کر اور ٹکریں مار کر چلا گیا۔ ہاں مگر یہ ہوا کہ کربلا گامے شاہ میں مولانا کی قبر مل گئی۔ اُن کی قبر پر ایک گنبد بھی تھا، وہ گنبد آج بھی ہے۔ مَیں بہت دیر مولانا کی قبر کے ساتھ لگ کر لیٹا رہا، گویا اُنھی کے پہلو میں لیٹا ہوں۔ وہاں بہت سکون سے شام تک ٹھہرا رہا اور دعائیں اور آیتیں پڑھتا رہا۔ اُس کے بعد وہاں کئی بار آیا اور گیا۔ یہ باتیں ۱۹۹۳ کی ہیں اور مجتبیٰ صاحب کی زندگی کا بھی یہ آخری سال تھا۔ وہ اللہ کو پیارے ہو گئے۔ اِدھر مَیں روزگار کے دھندے میں ایسا پڑا کہ مولانا کا گھر تلاش نہ کر سکا کیونکہ جب آپ کو بتانے والا بھی کوئی نہ ہو اور نہ آپ وہاں کے رہنے والے ہوں تو یہ کام مشکل ہو جاتا ہے۔ اُس کے بعد ۲۰۰۹ کا زمانہ آ گیا۔ اُن دِنوں مَیں اکادمی ادبیات اسلام آباد میں کتاب گھر کا انچارج تھا اور لاہور کے پبلشروں سے اُس کتاب گھر کے واسطے کتابیں خریدنے کے لیے مسلسل لاہور

کے چکر لگا رہا تھا۔ اکادمی ادبیات میں میرے لیے سہولت یہ تھی کہ وہاں اکثر ادبا و شعرا کے فون اور پتے موجود ہوتے تھے۔ مَیں نے سُراغ لگایا کہ مولانا کی اولاد میں سے کون ہے، جس سے ملا جائے، ایک دن وہاں آصف فرخی صاحب آئے، اُنھوں نے مجھے اسلم فرخی صاحب سے بات کرائی۔ اسلم فرخی صاحب نے آغا سلمان باقر کا نمبر دے دیا۔ اگلے دن جب مَیں لاہور آیا تو مَیں نے آغا سلمان باقر کو فون بجایا۔ آغا سلمان باقر مولانا محمد حسین آزاد کے سگے پڑپوتے، اقبال ٹاؤن لاہور میں رہتے تھے، اُنھوں نے کہا، بھئی یہیں آ جایے۔ مَیں ایک سرشاری کی کیفیت میں اُن کے ہاں پہنچ گیا۔ اُنھوں نے مجھے بڑی عزت سے بٹھایا، چائے بسکٹ سے خاطر بچھائی اور آنے کا سبب دریافت کیا۔ مَیں نے کہا حضور مَیں تو مولانا کا شیدائی ہوں، فقط وہ گھر دیکھنا چاہتا ہوں جہاں مولانا محمد حسین آزاد نے اپنی زندگی کے شب و روز گزارے ہیں اور جس مکان میں بسیرا رکھا ہے۔ اب یہاں قصہ ایک الگ ہوا کہ اُنھوں نے مجھے کوئی جاسوس سمجھ لیا۔ معاملہ دراصل یہ تھا کہ اُن کے آپس میں خاندانی جھگڑے چلے آتے تھے۔ مولانا کے مسودات کے بارے اُن میں اور اُن کے رشتہ داروں کے درمیان اختلافات تھے۔ اُنھی کو مدِ نظر رکھ کر وہ مجھے دیگر اقربا کی طرف سے جاسوس سمجھے۔ مَیں نے اُنھیں لاکھ یقین دلایا کہ مجھے کسی کی کچھ خبر نہیں ہے، آپ فقط مجھے مولانا کا عاشقِ صادق سمجھیں جو زیارت کو آیا ہے اور اُس گھر کا پتا بتا دیں۔ تب آغا سلمان باقر نے مجھے وہ پتا بتایا، جسے اکبری منڈی والا گھر کہا جاتا تھا۔ مَیں آغا صاحب کے ہاں سے نکل کر سیدھا وہیں چلا آیا اور اُس گھر میں پہنچ گیا جس کا نقشہ میں نے اُوپر بیان کیا ہے اور جو شکل گھر کی بتائی ہے، وہ اُس وقت وہاں موجود تھی۔ آغا سلمان باقر کا چھوٹا بھائی آغا سلطان باقر مجھے وہاں ملا اور یہ دیکھ کر سخت افسوس ہوا کہ وہ بالکل اَن پڑھ تھا۔ آغا سلطان سے مل کر مجھے مولانا آزاد کی وہ باتیں یاد آ گئیں جو اُنھوں نے مرزا رفیع سودا کے نواسے کی بابت کہی تھیں کہ مچھ سازی کا کام کرتا تھا اور بچارا بالکل اَن پڑھ تھا۔ یہاں آغا سلطان کی مثال عین

ویسی ہی تھی۔ اُن کی بیگم بھی وہیں تھیں اور محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اپنی بیگم کے زور میں تھا۔ میں صحن میں نیچے کھڑا تھا تو وہ اوپر سے بول رہی تھی اور سلطان باقر کو بالکل بات نہیں کرنے دے رہی تھی۔ میں نے کہا بی بی مجھے آپ کے ذاتی جھگڑوں سے کچھ تعلق نہیں ہے۔ میں تو یہ در و دیوار دیکھنے آیا ہوں اور مولانا کا ایک معتقد ہوں مگر وہ میری بات کا یقین نہ کرتی تھی اور سلطان باقر کو کہتی جاتی تھیں، کسی کا بھیجا ہوا آیا ہے۔ مجھے اس چیز سے کیا لینا تھا۔ میں نے صحن میں آ کر گھر کے در و دیوار کو بوسے دیے۔ اُس کمرے کو دیکھا جہاں مولانا بستر جماتے تھے، یہ کمرہ چھوٹی اینٹوں سے بنا تھا۔ گھر کی دوسری دیواریں بھی چھوٹی اینٹ سے تیار ہوئی تھیں۔ اس سب کچھ کو دیکھنے کے بعد اُس جگہ آ کر بیٹھ گیا، جہاں کبھی ناصر نذیر فراق آن کر بیٹھا تھا۔ وہ مولانا کو عالمِ جنون میں مل کر آغا یوسف کے ساتھ دروازے کے باہر چوکی پر بیٹھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ اُس وقت ناصر نذیر فراق کے ساتھ مولوی محمد حسین آزاد کا پوتا آغا یوسف بیٹھا مولانا کی باتیں بتا رہا تھا اور اندر مولانا محمد حسین آزاد بیٹھے تھے جبکہ میرے ساتھ اُن کا ایک اَن پڑھ پڑپوتا بیٹھا مسلسل اپنے بھائی کا شکوہ شکایت کر رہا تھا اور اندر اُس کی زور آور بیوی بیٹھی تھی۔ یہ صاحب بھی مجھے آغا سلمان باقر کا جاسوس سمجھ رہا تھا بلکہ اُن کی بیوی نے تو یہ تک کہہ دیا، دیکھو، یہ لڑکا مولانا کے مسودے چرانے آیا ہے۔

یہاں میں کافی وقت بیٹھا رہا۔ اُس کے بعد نکل کر اُس لائبریری کی طرف چلا آیا جس کی بنیاد مولوی محمد حسین آزاد نے رکھی تھی اور اُس کے لیے اکثر کتابیں ایران سے لے کر آئے تھے۔ یہ لائبریری سرکلر روڈ پر موچی دروازے سے تھوڑا آگے دہلی دروازے سے پہلے موجود تھی۔ اور اب یہ وہ لائبریری نہیں رہی تھی۔ یعنی سب کچھ بدل گیا تھا۔ یہ میری اس گھر کی پہلی سیر تھی۔ کچھ عرصہ بعد یعنی ۲۰۱۷ میں دوبارہ آغا سلمان باقر کے ساتھ گیا۔ اب یہ مکان مکمل طور پر بک گیا تھا اور اُن کا بھائی آغا سلطان باقر بھی وہاں نہیں تھا اور اُن کے خاندان کا کوئی فرد اب وہاں نہیں رہتا۔ اِس سیر کے بارے میں میں نے اُسی وقت رپورٹ لکھی تھی

وہ ہو بہو درج کیے دیتا ہوں۔

کتاب میلہ پر ہی آغا صاحب سے طے پا گیا تھا کہ صبح گیارہ کے عمل میں ہم پاک ٹی ہاؤس اکٹھے ہوں گے، وہاں سے اندرون لاہور اکبری منڈی یعنی بندہ آزاد مولوی محمد حسین آزاد کے مکان پر چلیں گے۔

آج صبح ذیشان کو ساتھ لے کر ہم وعدہ گاہ کی طرف نکلے۔ چونکہ مولویوں کی طاقت سے لاہور کی سڑکوں پر کشمیر آزاد ہو رہا تھا یعنی احتجاج ہو رہا تھا چنانچہ سب رستے بند تھے مگر ہم کہاں تھمنے والے تھے۔ مال کے اوپر سے غوطہ کھا کر پاک ٹی ہاؤس جا ہی نکلے، جہاں آغا سلمان باقر ہیٹ نما ٹوپی اور اونی کوٹ پہنے کسی گیان میں کھڑے تھے۔ ہم اُن سے ایسے ملے جیسے آ ملے سینہ، چاکانِ چمن سے سینہ، چاک۔ اس کے بعد روانہ ہوئے اکبری منڈی کی طرف مگر جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، موچی دروازے کے سامنے کشمیر کی آزادی کے سبب سڑکیں ہر طرف سے بند تھیں چنانچہ خدا جانتا ہے اور ہمیں یاد نہیں کہ کن کن تماشا گلیوں کو چکر دے کر اور وزیر خاں مسجد کا پچھواڑہ لے کر آخر پہنچے وہیں پہ جہاں کے خمیر تھے یعنی آزاد بازار میں۔ ہم نے بتایا ہوگا اور آپ نے سُنا ہوگا کہ پہلے بھی یہاں سہ بار چہار بار آ چکے ہیں مگر آج آغا سلمان باقر صاحب خود ہمارے ساتھ تھے اور آپ کیا جانیں آغا صاحب کون ہیں؟ میاں یہ بیٹے ہیں آغا محمد باقر کے اور آغا محمد باقر ہوئے آغا محمد ابراہیم کے بیٹے اور آغا ابراہیم بیٹے ہیں مولوی محمد حسین آزاد کے۔ یوں آغا سلمان باقر سید ھے مولوی محمد حسین آزاد کے پڑپوتے ہوئے۔ پہلی سیروں میں اس لیے پہلے وہ باتیں نہ کھلی تھیں جن کی گرہیں آج کھلیں۔ ہم سمجھے تھے کہ یہ مکان خود مولانا نے بنوایا تھا مگر آغا سلمان باقر نے آج بتایا کہ اس مکان میں مولوی آزاد نے صرف عالم جنون کے سال گزارے ہیں، اُن کی عالم ادراک کی عمر کرائے کے مکانوں میں کٹی تھی۔ مولوی صاحب کے بیٹے آغا ابراہیم نے یہ مکان بنوایا تھا اور ایک کنال رقبے پر محیط تھا۔ اسی کے اندر ایک طرف وہ امام بارگاہ بھی

تھی، جس کا ذکر ناصر نذیر فراق نے اپنے ایک مضمون میں کیا ہے کہ مولانا اُسی امام بارگاہ کے صحن میں بیٹھتے تھے جس سے ملحق وہ کمرہ ہے، جو مولانا کے لکھنے پڑھنے اور جینے مرنے کا سامان تھا۔ وہ کمرہ آج ہم نے دیکھا، اُسے بوسا دیا۔ اِسی کمرے میں بیٹھ کے مولانا نے ابراہیم ذوق کے دیوان کا بے مثال پیش لفظ لکھا تھا، جسے اگرچہ مولانا نے عالمِ جنوں میں لکھا مگر آج بھی وہ پیش لفظ وحی ہے۔ نہ جانے ابراہیم ذوق کا دیوان چھاپنے والے پبلشر مولانا کا وہ پیش لفظ کیوں قلم زد کر دیتے ہیں؟ مکان میں موجود امام بارگاہ اب نہیں رہی کہ مکان کے بکنے سے، بہت کچھ بدل گیا۔ مرکزی دروازہ، جس کے کچھ آثار باقی ہیں، وہیں آغا آغا یوسف کے ساتھ ناصر نذیر فراق ایک چوکی پر بیٹھ کے مولانا کے جنون کے بارے میں باتیں کرتے رہے تھے۔ ناصر نذیر فراق مولانا کے شاگرد دہلی سے خاص مولانا کو اُن کے عالمِ جنوں میں ملنے آتے تھے۔ مولانا کے کمرے کے دائیں ہاتھ سامنے کی طرف وہ کمرہ ہے جس میں تین سال تک ڈاکٹر محمد صادق رہے ہیں اور مفت رہے ہیں اور مولانا پر پی ایچ ڈی کی، مگر اپنے مقالے میں مولانا کے بارے میں بہت کچھ اول فول ایسا لکھ گئے کہ بعد میں اسلم فرخی صاحب نے اُسے دور کیا۔ وہ کمرہ اور اُس کا دروازہ اپنی اصلی حالت میں موجود ہے۔ مرکزی دروازہ درمیان سے کاٹ کر اب ایک پہلوان زادے نے وہاں اپنی دوکان کھول رکھی ہے۔ اصل جگہ یہ دروازے کی ہے اور وہ دوکان زبردستی کی ہے۔ آغا صاحب نے بتایا کہ دروازہ کو پہلوان سے آزاد کروانے میں چالیس سال تک عدالت میں کیس چلا مگر دروازہ آزاد ہو کے نہ دیا، آخر تنگ آ کر کیس بند کیا۔ واہ میرے وطن کی عدالتو! تم پر لعنت پڑے میری اور مولانا کی۔ ابھی ہم ڈیوڑھی میں کھڑے مولانا کا کمرہ دیکھ ہی رہے تھے کہ چبوترے سے ایک خاتون بی بی کی آواز آئی، میاں کچھ کام ہے؟ ہم نے عرض کیا، بی بی ہم مولانا محمد حسین آزاد کا گھر دیکھنے آئے ہیں، وہم نہ کیجیے، دیکھ کر چلے جائیں گے۔ اللہ بھلا کرے اُس بی بی کا، کہنے لگی، میاں چائے پیو گے۔ ہم نے کہا کیوں نہ پئیں گے؟ لیجیے

صاحبو! تھوڑی دیر میں ایک نیک دل آدمی تین کپ چائے لے کر زینوں سے اُتر آئے۔ واللہ، ہم نے وہ چائے مولانا آزاد کی طرف سے سمجھ کے پی۔ دیکھیے کیسے مولانا نے تواضع کی؟

ہم نے مولانا کے گھر میں بیٹھ کر آج گویا صدی پار کی چرخی کو گھمایا اور مولانا آزاد کا دیدار پایا۔ اینٹوں کو بوسے دیے، دہلیزوں کی جبہ سائی کی، اور دروازوں اور ڈیوڑھی کے لمس لیے۔ مولانا آپ نہ ہوتے تو کون قلم کے نور سے آبِ حیات کے چاندوں کو منور کرتا؟ کون میر و غالب و ذوق و انشا کے چہروں کو چمکاتا، کون خیال کی نیرنگیاں دکھاتا، کون دربارِ اکبری لگاتا اور کون سیرِ ایران کو جاتا۔ کون ہمیں نثر کا صدقہ عطا کرتا۔ دوستو، کچھ نہ پوچھو وہاں چند لمحے بیٹھ کر دل کو کیسا سکون ملا۔ خدا شاہد ہے اُن کی روح وہیں تھی اور ہم سے باتیں کرتی تھی۔ غرض بعد چند ساعتوں کے ہم وہاں سے نکلے اور مولانا کے گھر کے پچھواڑے میں موجود مبارک حویلی کی دہلیز پر جبینیں رکھیں۔ یہی وہ حویلی ہے جہاں محرم کے دس دن مولانا سلام پڑھا کرتے تھے اور مجلس سنا کرتے تھے اور گریہ کیا کرتے تھے۔ یہ باتیں ہمیں آغا سلمان باقر نے بتائیں اور اُن کو اُن کے والد صاحب نے کہیں۔ مبارک حویلی میں ٹھیکی نہ تھی ہمارا اسلام تھا۔ پھر کچھ دیر میں کشمیری بازار سے ہو کر سنہری مسجد پہنچے۔ مسجد کا حال کیا لکھیں کہ ایک نمونہ ہے تعمیر کا۔ ایک سنہری مسجد بیرم خاں کے تراہا پر دہلی میں بھی موجود ہے۔ ہم وہاں جا کر اُس کے صحن میں چند گھنٹے راحت فرما چکے ہیں اور اُس تراہے کو جی بھر کر دیکھ چکے ہیں، جہاں نادر شاہ نے کھڑے ہو کر دہلی کا قتلِ عام کیا تھا پھر محمد شاہ رنگیلا کی منت سماجت پر آرام کیا تھا۔ وہ یعنی دہلی کی سنہری مسجد اور لاہور اور آگرہ کی سنہری مسجدیں دراصل بیرم خاں کی جیبِ شاہی سے بنی ہیں مگر ہمارے قصہ گوؤں نے اِن کے بنانے والے عجیب عجیب لوگ پیدا کر دیے ہیں۔ اللہ تاریخ لکھنے والوں سے بچائے۔ غرض یہ کہ یہ مسجد دیکھنے کے لائق ہے۔ مولانا آزاد سُنا ہے اکثر اِس مسجد کی سیڑھیوں پر جا کر بیٹھ رہتے تھے اور دہلی اور آگرہ

کے اکبری دنوں کو یاد کرتے تھے۔اور اُن دنوں کو بھی آنسوؤں کے پانی میں بہاتے تھے جو دہلی کی جامع مسجد اور سنہری مسجد کی سیڑھیوں کے آس پاس بیتے۔اے وہ دوستو، جو وزیر خاں مسجد، شاہی حمام اور دھیان سنگھ کی حویلی دیکھ کر لاہور کی سیر پوری سمجھ بیٹھتے ہو، سنہری مسجد دیکھے بغیر مت باہر نکلیو کہ اِس مسجد کا اندرون ایک کارخانہ قدرت ہے، آنکھیں رنگوں میں اور دل محرابوں اور ڈاٹوں میں کھو جاتے ہیں۔

ہے چاروں طرف خیمے کھڑے گردباد کے
کیا جانیے جنوں نے ارادہ کدھر کیا

حالتِ جذب اور اسفار

ہمارے لیے مولانا محمد حسین آزاد کو سمجھنے کے لیے اُن کی زندگی کے اُن نشیب و فراز کی بہت اہمیت ہے جو اُن کی والدہ کی وفات سے شروع ہو کر باپ کو گولی لگنے اور وہاں سے ہوتے ہوئے بے دری کے پے بہ پے حادثے ہیں۔ آزاد علمی اور فکری طور پر جس قدر حساس اور دل گداز شخص تھے، اُن پر ٹوٹنے والے مصائب اُسی قدر جاں گداز تھے۔ وہ مسلسل ایک حادثے سے دوسرے میں مبتلا رہے۔ اُنھیں فرصتِ زندگی جس قدر ملی، مصائب و آلائم کی قیمت پر ملی۔ جیسے ہی اُن کی روح کو کشادگی کے دن میسر ہوئے وہ جذب میں چلے گئے۔ یہ جذب دراصل اُنھوں نے پہلے پہل خود پر طاری کیا، بعد میں وہی جذب اُن پر خود طاری ہو گیا اور پورے بیس سال رہا۔ عملی طور پر مولانا آزاد جذب میں ۱۸۹۰ میں گئے اور دوست دشمن سب سے بے نیاز ہو گئے۔ اُنھیں نہ کسی سے ستائش کی تمنا رہی نہ صلے کی پروا مگر دیکھا جائے تو اُن کی یہ حالت سیرِ ایران کے وقت ہو چلی تھی۔ خیر جو بھی ہو اُن کی تصنیفات کو دیکھا جائے تو آبِ حیات، نیرنگِ خیال، دربارِ اکبری اور سخن دانِ فارس، قصص الہند، نگارستانِ فارس دراصل اُسی جذب کا نتیجہ ہیں جو اُن کی ذہنی کیفیتوں کی آئینہ دار ہیں اور اُس کی رفتگی کی علامت دار ہیں۔ اِن کتابوں کے موضوعات اور اُن کی زبان اور اُن میں متخیلہ کی پرواز جس قدر نظر آتی ہے وہ بتاتی ہے کہ میاں آزاد کبھی اُس دنیا کے انسان تھے ہی

نہیں جس دنیا میں اُنھیں وقت کی قید نے لا بٹھایا تھا۔ لہٰذا اُن کی مجذوبی کے اسباب کا حقیقی سُراغ لگانا اتنا ہی مشکل ہے جتنا اُن کی تخلیقی قوتوں کے منبع کا اسباب لگانا مشکل ہے۔ اس کے باوجود جس قدر محققین نے اُن کی حالتِ جذب کے اسباب بتائے ہیں ہم اُن پر نظر کرتے ہوئے دیکھتے ہیں کہ اُن کے زیرِ اثر مولانا صاحب کی عادات واخلاق کس قدر متغیر ہوئیں۔

آزاد کی پھوپھی جو ۱۸۷۷ میں مکان بنگلہ ایوب شاہ میں آگ لگنے کے حادثے میں جل کر ہلاک ہو گئیں، ایک شدید ذہنی صدمہ تھا، جسے آزاد نے یوں لکھا کہ

"میری پھوپھی صاحبہ، جنھوں نے مجھے پالا تھا، کا انتقال ہو گیا، اُن کے سبب دل قوی رہتا تھا، گھر میں اندھیر انظر آتا ہے، وحشت ہوتی ہے"۔

آغا سلمان باقر نے اُن کے جذب کی بعض تحریروں کو اکٹھا کیا ہے۔ اُن سے معلوم ہوتا ہے، آزاد دل کے ساتھ ساتھ عملی طور پر بھی آزاد ہو چکے تھے اور وہ اپنی اس آزادی میں کسی کو دخیل نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ جہاں کبھی اُنھیں کسی کی طرف سے اس آزادی میں رکاوٹ نظر آتی تھی، آزاد اُس کے دشمن ہو جاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ وہ اُن کی جان کا لاگو ہے، یہ بدگمانی یہاں تک پہنچ چکی تھی کہ سگے بیٹے ابراہیم تک سے شکایات ہو گئیں تھیں۔ اور یہ شکایات بے سبب نہیں تھیں۔ آزاد نے جس لمحہ بھی کسی پر اعتماد کیا، اُنھیں وہیں سے دھوکا دیا گیا تھا۔ یہ رویے آہستہ آہستہ اُن کے دماغ کو انسانوں کے بارے میں شک میں مبتلا کر گئے۔ اُن کی اسی عالم میں ایک تحریر دیکھیے۔

"اُن سب نے بیٹے (ابراہیم بیٹا) کو ساتھ لے کر چیتا سنگھ کی ضرب کے نیچے دے کر پروفیسر آزاد کو دھر دیا، دیکھ اُسے ہم بچاتے رہے ہیں۔ فرنگ اُس کی جان پر ہماری قدرت کا امتحان لے رہے ہیں اور قتل اور موت، اُس کی (پروفیسر آزاد) قتل اور موت۔ ہم اُسے بچا رہے ہیں۔ ہم پروفیسر آزاد کو دے رہے ہیں"

آزاد کی ذہنی پرورش جس ماحول میں ہوئی اور جس رنگ و بو میں اُن کے دن گزرے وہ سائنسی سے زیادہ تہذیبی دور تھا جس پر سائینس نے جبر کے ساتھ اپنی حکمرانی قائم کی۔ آزاد اُس جبر کے نیچے مجبوراً زندگی گزارنے پر رضا مند ہوئے تھے مگر اُن کے دل و دماغ نے اُسے قبول نہیں کیا تھا۔ جب اُنھیں اپنی زندگی کے اُن بکھیڑوں سے آزادی ملی جن کے ساتھ وابستہ ہونے سے جانی اور معاشی بچاؤ ممکن ہوا تھا تو وہ فوراً اپنی اُسی کیفیت اور دنیا میں پلٹ گئے جس کے اصل باشندے تھے، یہ دنیا روحانی، اخلاق اور مکمل ادبی تہذیب کی دنیا تھی۔ روحانیت کی اِس دنیا میں آزاد اُس بندی خانے کے قیدی تھے جس میں دل کے قیدی بے ارادہ کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اِسی عقیدت اور محبت کے امر میں اُنھوں نے اپنا مربی ڈھونڈ لیا تھا اور وہ تھا سید دھیان شاہ۔ سید دھیان شاہ لاہور کے مضافات میں ایک بستی نواں کوٹ میں رہتا تھا، نواں کوٹ کی آبادی اُن دنوں چوبرجی سے ملتان روڈ پر جاتے ہوئے جنوب کی طرف ۴ کلومیٹر پر آتی تھی۔ آج کل یہ جگہ عین لاہور میں ہے اور یتیم خانے کے بالمقابل ہے۔ سید دھیان شاہ کی عمر تب نوے برس تھی اور آزاد نے اُنھیں اپنا مرشد کامل مان لیا تھا۔ وہ مسلسل سید دھیان شاہ سے راہ و رسم بڑھانے لگے اور اُن کے حکم احکام پر سر جھکانے لگے۔ دھیان شاہ پروفیسر آزاد کو جو کہتے، وہ بلا چون و چرا مان لیتے تھے اور باقی دنیا سے بے نیازی اختیار کر لیتے تھے۔ آپ یوں سمجھیے ڈاکٹر لائٹر جیسے جبر کے ذریعے اُن پر مسلط ہوا تھا، یہ دھیان شاہ خود آزاد کی رضا سے اُن پر حاکم تھا

ایک جگہ خود لکھتے ہیں:

''میں نے یہی دل میں خیال کیا تھا، اُس کا نام دھیان شاہ ہے، لاہور سے کوس بھر دور یہ نواں کوٹ میں جا بیٹھا اور ۹۶ برس کی عمر میں وہاں سے آ کر کرم علی پلس کے گھر میں بیٹھا۔ وہاں ہو سکا مگر نہ ہو سکا وہ جو چاہتا تھا۔ اُٹھ کر سلطان کی سرا میں آ گیا اور اُس کی بیوی دو وقت کھانا دینے لگی۔

پروفیسر آزاد اُس کے حکم میں ہے''۔

جس وقت پروفیسر آزاد سید دھیان شاہ کے حکم میں تھے، یہ زمانہ ۱۸۸۸ کا تھا اور مکمل وارفتگی ابھی نہ ہوئی تھی۔ انھیں لاہور کے مضافات میں سیر کرنے، مقابر و آثار کی سیاحت کی فکر دامن گیر تھی، جو اشیا و مناظر عوام الناس یا اُس وقت کے پڑھے لکھوں کی نظر میں بے معنی تھے، مولانا آزاد کی نظر میں وہ اشیا و آثار معنویت رکھتے تھے، مولانا آزاد کئی کئی دن باہر گھومتے رہتے، چونکہ وہ اپنی دنیا اور اپنے عالم کے آدمی تھے اس لیے اپنے جذب کے سوا کسی کی خبر نہ تھی۔ لاہور کے قُرب و جوار کی بستیاں اُن کے چلنے پھرنے اور سیاحت کرنے کی زمین تھیں۔ ایک گدڑی اُن کے کاندھے پر ہوتی جسے اُٹھائے پھرتے۔

ایک جگہ آزاد لکھتے ہیں:

''وہ آخیر دن تھا۔ ۵ کوس کی گردش کر کے آیا اور کیسا خوش آیا کہ کام تو آج ہوا،، پر اچھا ہوا، گھر میں آیا کہ اب کچھ کھاؤں گا اور آرام کرلوں گا۔ کیسی محبت ہے، اُسے کہا بیٹی لاؤ کچھ کھائیں، وہ منہ بسور کر بولی، ہمارے پاس آج کچھ ''ہے'' نہیں، ہم بھی بھوکے بیٹھے ہیں، ہم حیران، دیکھا، پروفیسر آزاد حیران، تمام جواہر مجردہ حیران، ہم نے کہا جا بازار سے کھالے۔ ٹو نے عرض کیا اے پروردگار، حضرت سے دس روپے آئے ہیں، یہ چاہتی ہے دسوں روپے لے لے۔ ہم نے کہا ٹو جا لاہور کو ٹو نے کہا ابھی؟ ہم نے کہا ابھی۔ ٹو نے اسی حالت میں آرام ایک پل نہ کیا اور بیگ میں کپڑے ڈال، کنٹوپ اور اُس کی چھوٹی سی رضائی بھی وہیں چھوڑی اور چل کھڑا ہوا۔ راہ میں کہیں سٹیشن پر کھانا نہیں تھا۔ اللہ کے نام پر تجھے دو مٹھی آٹے کی روٹی، ایک چوہڑے سے ہم نے دلوائی، ٹو نے اُس میں رات کاٹی۔ ہم نے یہ دن بھر گزارا۔ رات کے نو بجے تو لاہور میں پہنچا، غنیمت ہے کہ بیٹے نے دروازہ کھول دیا۔ جاڑے میں کیا ہوتا ہے، ہم جانتے

ہیں کیا ہوتا ہے"۔

اس پوری عبارت کو غور سے پڑھیں تو پتا چلتا ہے کہ مولانا آزاد لاہور سے باہر کسی بستی میں موجود ہے اور کسی غیر کے گھر میں بسیرا رکھتا ہے۔ جس کے پاس رہتا ہے، اُسے بیٹی کہہ کر پکارتا ہے۔ آزاد دن بھر کہیں باہر گھومتا پھرا ہے اور اپنے زعم میں کوئی کام اس سیر میں اُس نے کیا ہے یا کوئی جگہ دریافت کی ہے۔ جب اپنے اُس کام سے کامیابی کے ساتھ خوش خوش واپس لوٹتا ہے تو بہت بھوکا ہے۔ مولانا اُس سے کھانا مانگتا ہے، وہ عورت کہیں مولانا کی جیب میں دس روپے دیکھتی ہے اور اُس سے حاصل کرنا چاہتی ہے یعنی لالچی خاتون ہے، مولانا اس چیز کا بُرا مناتے ہوئے اُسی وقت اُس کے گھر سے نکل کر لاہور کی طرف پیدل روانہ ہو جاتے ہیں۔ رستے میں اُنھیں کہیں کھانا نہیں ملتا، ایک چوہڑے سے ایک روٹی ملتی ہے، وہ روٹی کھا کر وہیں قریب والٹن کے اسٹیشن پر رات بسر کرتے ہیں۔ اگلے دن سردیوں کی رات اپنے گھر کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں اور گھر میں داخل ہوتے ہیں۔ یہ پوری عبارت بتاتی ہے مولانا کس قدر اپنی مجذوبیانہ کیفیت میں دور دور تک اور کئی کئی دن لاہور کے مضافات میں پھرتے رہتے تھے، اسی کیفیت میں جب چاہتے تھے گھر لوٹ آتے تھے، ظاہر ہے اس حالت میں آغا ابراہیم کس قدر پریشان رہتے ہوں گے، یہ اندازہ وہی کر سکتے ہیں

مَیں صیدِ رمیدہ ہوں بیابانِ جنوں کا
رہتا ہے مرا موجبِ وحشت مرا سایہ

آزاد میاں کا جذب وجنوں

آغا سلمان باقر نے عالمِ وارفتگی کے متعلق کچھ باتیں مولانا کی اپنی کتاب میں درج کی ہیں، آیے اُنھیں ایک نظر دیکھتے ہیں۔

۱۔ مولانا عبد اللہ عمادی کو وارفتگی کے عالم میں آزاد کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ وہ بیان کرتے ہیں، آزاد مرحوم سے پہلی دفعہ ۱۹۰۴ میں شرفِ نیاز حاصل ہوا تھا۔ اختلال کے باعث اگرچہ ذہنیت متغیر ہو چکی تھی۔ تاہم مفادات اور استفسارات کے کافی مواقع مل جاتے تھے۔ اختلالِ ذہن کے زمانے میں بھی دہلی جاتے تو دن بھر اُستادِ ذوق کی قبر پر گزار دیتے۔

۲۔ پروفیسر محمد شفیع اپنے بچپن کا ایک واقعہ آزاد سے ملاقات کا یوں بیان کرتے ہیں کہ ۱۹۰۰ میں جب بغرضِ تعلیم لاہور آیا تو مرحوم زندہ تھے مگر جنون میں مبتلا تھے۔ اُس زمانے میں وہ سیر کے لیے باغوں میں نکلتے تھے۔ کئی بار مَیں نے اِن کو دیکھا ۔ ۱۹۰۷ کے ابتدائی مہینوں میں ایف اے کا امتحان قریب تھا اور مَیں شیرانوالا دروازے کے باہر ایک باغ میں فارسی کورس پڑھ رہا تھا۔ مَیں اِس حصے کو دیکھ رہا تھا کہ آزاد سیر کرتے ہوئے اُدھر سے گزرے۔ کسی شعر میں مجھے اشکال کا سامنا تھا۔ مَیں اُن کی طرف بڑھا اور سلام کر کے شعر کے معنی پوچھے، جہاں میں نے

اِس شعر کو پڑھا، اُنھوں نے اِس مقام کے متعدد اشعار زبانی پڑھ دیے اور مطلب بھی بیان کیا۔ دیوانِ ابو العتاہیہ بھی داخلِ نصاب تھا اور اُس وقت میرے پاس موجود تھا۔ اُس میں سے مَیں نے ایک شعر پوچھا جس میں سلیم بمعنی لدیغ آیا تھا۔ فرمایا اِس لفظ کے معنی یاد نہیں۔ ہمارے یہاں آؤ، لغت میں دیکھ کر بتائیں گے۔ وہ اکثر باغوں میں گھومتے رہتے۔ چلتے چلتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے آپ سے باتیں کیے جاتے ہیں۔

۳۔ شمس العلما خواجہ حسن نظامی وارفتگی میں آزاد سے ملاقات کا ایک واقعہ مکتوباتِ آزاد کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''آخری ایام میں جب اُستاد عالمِ استغراق میں تھے اور دیوانی دنیا اُن کو دیوانہ کہتی تھی، میری نظروں نے بھی دیکھا۔ ڈاکٹر غلام نبی زبدۃ الحکما کی کوٹھی میں بیٹھا تھا۔ جو شہر لاہور کے باہر واقع ہے۔ دیکھا ایک سفید ریش بزرگ سفید عمامہ باندھے، لکڑی ہاتھ میں لیے خراماں خراماں چلے جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا، یہی آزاد ہیں۔ مَیں بے تاب ہو کر دوڑا کہ زیارت کا شرف حاصل کروں۔ وہ تیزی سے چلتے گئے، مگر میں ہمت کر کے اُن کے قریب پہنچ گیا۔ تعاقب نے پہلے تو اُن کو تیز خرام کر دیا تھا، قریب دیکھا تو ٹھہر گئے اور مڑ کر دیکھا، مَیں نے جھک کر سلام کیا۔ اُنھوں نے دونوں ہاتھ اُٹھا کر دعا کی۔ اللہ تم کو خوش رکھے کہ مجھ جیسے آدمی کو سلام کرتے ہو۔ مَیں نے عرض کیا زیارت کا بے حد شوق تھا، فرمانے لگے لعنت ہے اُس شخص پر جس نے تم کو میرا مشتاق بنایا، یہ کہا اور پوری تیزی سے روانہ ہو گئے۔ یہ پہلی ملاقات تھی اور یہی آخری کہ اُس کے بعد کبھی دیدار میسر نہ آیا''۔

۴۔ خواجہ حسن نظامی کے ہم عصر اور دست و بازو مولانا سلطان احمد وجودی نے آزاد کو

بہت قریب سے اپنے بچپن میں دیکھا۔ وہ آزاد کی زیارت کا واقعہ یوں بیان کرتے ہیں کہ مَیں بہت چھوٹا تھا اور اپنے والد کے ساتھ مال روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ اُس وقت ہم عجائب گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے کہ ایک بزرگ سفید عمامہ باندھے، سیاہ چوغہ پہنے، ہاتھ میں چھڑی لیے ہمارے پاس سے کوئی شعر پڑھتے گزر گیا۔ میرے والد نے بتایا کہ تم نے اردو کی پہلی کتاب پڑھی ہے، مَیں نے کہا جی ہاں، ماں بچے کو گود میں لیے بیٹھی ہے، باپ حقہ پی رہا ہے، کہا ہاں، اُس کے مصنف پروفیسر آزاد یہی ہیں جو ابھی شعر پڑھتے ہمارے پاس سے گزرے ہیں۔ مَیں یہ سُن کر وہیں رُک گیا اور دیر تک پروفیسر آزاد کو دیکھتا رہا۔

۱۹۰۰ کے قریب آزاد کی بیوی کا انتقال ہوا، آزاد اپنی بیوی کو بہت چاہتے تھے۔ اب دیکھنے والے کہتے ہیں آزاد کا کبھی اپنی بیوی سے جھگڑا یا تکرار نہ ہوا تھا۔ بیوی کے انتقال کے بعد آزاد کا خیال تھا کہ لوگ مجھے بیوی کے سلسلے میں دھوکا دیتے ہیں۔ اسی سلسلے میں آغا محمد باقر اپنی والدہ سے سُنا ہوا قصہ بیان کرتے ہیں۔ مولانا آزاد کی بیوی کے انتقال کو ابھی تھوڑی مدت گزری تھی کہ ایک دن کہار دروازے پر ڈولی لے کر آئے اور آواز لگائی کہ محمد حسین کوتوال کے گھر سے سواری آئی ہے۔ یہ آواز کہیں مولانا کے کان میں بھی پڑ گئی۔ وہ سیدھے اپنے مکان سے نکلے اور بہت تیزی سے زنانہ مکان میں داخل ہوئے۔ محمد حسین کوتوال شہر کی بیوی آگے آگے تھی اور آزاد بیوی بیوی کہتے ہوئے پیچھے پیچھے تھے۔ ہر چند گھر کی عورتوں نے کہا یہ وہ نہیں ہے، وہ تو مر چکی ہیں۔ یہ تو محمد حسین کوتوال کی بیوی ہیں لیکن اُنھوں نے کہا تم سب غلط کہتے ہو، یہ تو میری بیوی ہے۔ مَیں ان کی شکل ضرور دیکھوں گا۔ تم لوگ مجھے دھوکا دیتے ہو کہ وہ مر گئی ہے۔ اتنے میں وہ بیچاری پلنگوں کے نیچے گھس گئی۔ مولانا آزاد سب کے سمجھانے کے

باوجود زبردستی اُسی پلنگ کے نیچے گھس گئے اور زبردستی باہر نکالا اور شکل دیکھی، صورت دیکھ کر کہنے لگے، لاحول ولا قوۃ یہ تو واقعی وہ نہیں ہے۔ وہ تو سچ مچ مر چکی ہے۔ یہ کہہ کر لاحول کہتے ہوئے اپنے مکان میں آ گئے۔

۶۔ آزاد کی طبیعت ہر چند عالمِ وارفتگی میں کسی حد تک شکی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے تھے کہ ہر شخص مع اُن کے بیٹے آغا ابراہیم سمیت اُنھیں کسی نہ کسی طرح دھوکا دینے کی فکر میں رہتا ہے۔ اِسی سلسلے میں امتیاز علی تاج نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جس میں شکی طبیعت کی تائید ہوتی ہے۔

یاد نہیں کہ کس سن کی بات ہے مگر میرا بچپن کا زمانہ تھا۔ میں اپنے ریلوے سٹیشن کے مکان کے پھاٹک میں کھڑا تھا کہ چوک کی جانب سے مولانا آزاد آتے دکھائی دیے۔ ان کے جنون کا آغاز ہو چکا تھا مگر دیکھنے میں کوئی غیر معمولی بات اُن میں نظر نہ آتی تھی۔ لمبا کُرتا، کالا چوغہ، کھلے پائنچے کا پاجامہ، گھر کے باہر ایک لیٹر بکس نصب تھا۔ آ کے چپ چاپ اُس کے قریب کھڑے ہو گئے۔ میری طرف نظر اُٹھائی تو میں نے سلام عرض کیا۔ یاد نہیں کہ مولانا آزاد نے جواب دیا کہ نہ دیا بہر حال میرے قریب آئے اور بولے، ایک پان اندر سے لا دو۔ میں نے کہا ابھی لاتا ہوں اور اندر بھاگ گیا۔ نہ جانے کس سے پان لگوایا اور کلیہ کے ڈھکنے میں رکھ کر مولوی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے خوش ہو کر گلوری اُٹھائی مگر کھاتے کھاتے رُک گئے۔ گلوری کھول کر غور سے دیکھنے لگے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ نہ جانے اُس میں کیا نظر آیا، ممکن ہے آلائچی کے دانے ہوں، برہمی سے بولے، اِس میں زہر ڈلوا کے لایا ہے۔ یہ کہہ کر غصے سے پان پھینک دیا اور سر جھکائے ریلوے سٹیشن کی جانب چل کھڑے ہوئے۔

تا گور کے اُوپر وہ گُل اندام نہ آیا
ہم خاک کے آسودوں کو آرام نہ آیا

دہلی اور علی گڑھ کا پیدل سفر

مولانا کی زندگی جیسا کہ آپ دیکھ آئے ہیں، ایک عجوبۂ عالم تھی، یعنی ایک چکر ہے میرے پاوں میں زنجیر نہیں کے مصداق، کبھی اس گلی کبھی اُس گلی، کبھی یہ دیار کبھی وہ دیار، اور اس معاملے میں نہ سواری کی ضرورت نہ سامانِ سفر کی علت، جب جی چاہا اور جہاں جی چاہا پیدل نکل لیے۔ جس آدمی کو زندگی کی گردشوں نے مصائبِ غدر میں پورے ہندوستان کا چکر گھما کر وسط ایشیا سے ایران و توماں کی چکی تلے پسوایا ہو، اُس کے سامنے دہلی اور علی گڑھ کی پیادہ پائی کیا معنی رکھتی تھی۔ آپ خود تصور کیجیے ایک عمر کا مسافر کنجِ قفس میں کیونکر رُکے جبکہ وہ ایک بے نیازی کے خلاوں میں اُڑان بھر چکا ہو۔ بس یہی بات تھی کہ زمانوں کا مسافر صدیوں کے فاصلے لمحوں میں طے کرنے نکلا تھا، وہ طے کیوں نہ کرتا۔

مولانا ایک دن اکبری منڈی والے مکان سے گُدڑی اُٹھا کر نکلے، چہل قدمی کرتے، سیر بھرتے نواں کوٹ جا پہنچے۔ اُن کی منزل سید بڈھن شاہ کا ڈیرہ تھا، کہ وہیں آزاد کو اپنی تسکین کے سلسلے ملتے تھے۔ ابھی وہ بڈھن شاہ کے آسن سے کئی قدم دُور تھے کہ سید دھیان شاہ صاحب کی نظر اُن پر جا پڑی، وہ مولانا آزاد کی طرف دیکھ کر ایک بار معنی خیز نظروں سے مسکرائے اور دُور ہی سے فرمایا "جا محمد حسین! تیرے لئے دہلی کا حکم آیا ہے، دہلی چلا جا۔ مولانا آزاد نے وہیں سے قدم پھیر لیے، ایک پل وہاں رُکنا حکم کے منافی سمجھا اور دہلی کی

سمت چل پڑے۔ نہ سواری کا بندوبست، نہ خرچ راہ کی فکر کی۔ بس خدا کو سہارا کر کے علی کا نام بھر کے لاہور سے منزلیں مارتے، گاؤں گاؤں پھرتے سب سے پہلے پٹیالہ پہنچے اور وہیں سے دہلی چلے۔ آغا محمد باقر لکھتے ہیں:

خدا جانے اس بزرگ کے طرز کلام میں کیا جادو بھرا تھا کہ یہ الفاظ بجلی کی طرح خرمن ہوش وحواس پر گرے اور حضرت آزاد اسی حال میں دہلی پیدل روانہ ہو گئے۔ پہلے پٹیالے گئے۔ سیدھے مرحومہ بنتی کے مکان پر پہنچے۔ وہاں سب لوگ ان کا یہ حال دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ کچھ دیر توقف کیا۔ اس کے بعد نظر بچا کر وہاں سے بھی روانہ ہو گئے۔ وہ لوگ سمجھے کسی سے ملنے کے لئے ادھر ادھر گئے ہیں۔ غرض جنگلوں اور بیابانوں کو پاؤں پیدل طے کرتے ہوئے دہلی پہنچے۔ حالت یہ تھی کہ سر سے پگڑی غائب۔ پاؤں میں جوتا ندارد۔ کپڑے پھٹے ہوئے، پریشان حال، ویران دل۔ آناً فاناً دہلی میں شور مچ گیا کہ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد اس حال میں دہلی آئے ہیں۔ ہر شخص دیکھتا تھا اور انگشت بدنداں تھا کہ یہ کیا ہو گیا۔ رشتہ داروں اور عزیز دوستوں کو یقین نہ آتا تھا۔ جب اپنی آنکھوں سے دیکھتے تو بے اختیار روتے تھے۔ منت سماجت کرتے کہ چلو گھر چلو۔ برائے خدا اپنے اور ہمارے حال پر رحم کرو مگر اِن باتوں کی کسے پرواہ تھی۔ کبھی قدم شریف اپنے پیارے اُستاد ذوق کے مزار پر، کبھی جنگل میں، کبھی شہر میں۔ غرض جہاں طبیعت لے جاتی جا نکلتے۔ بھوک لگتی تو کسی دکان سے مٹھی بھر چنے اُٹھا کر کھا لیتے۔ لوگ کھانے اور مٹھائیاں پیش کرتے۔ وہ آنکھ اُٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ اِدھر گھر کا حال سنیے۔ گھر والے سب لاہور میں حیران تھے کہ مولانا کہاں چلے گئے۔ آخر دہلی سے اِن ناگہانی واقعات کی خبر آئی تو گھر میں کہرام مچ گیا۔ والد مرحوم چھٹی لے کر دہلی گئے۔ بہت سمجھایا کہ خدارا گھر چلیے مگر اُنہوں نے ایک نہ مانی۔ والد مرحوم ملازمت سے مجبور تھے۔ اس لئے واپس آنا پڑا۔ ایک دو آدمی نگہبانی کے لئے ساتھ لئے اور زبردستی مولانا کو ساتھ لے کر سوار ہو گئے۔ جب گاڑی جگادھری پہنچی تو مولانا موقعہ پا کر اُتر

گئے۔ ہر چند ڈھونڈا کہیں پتا نہ چلا۔ ایک ملازم کہ خاص اُن کی دیکھ بھال کے لئے رکھا تھا، اُس کو وہیں اُتار دیا۔ وہ کئی دن تک ڈھونڈتا رہا لیکن ناکامیاب رہا۔ آخر اُس نے خط لکھا۔ اتنے میں دہلی سے اطلاع آئی کہ مولانا پھر دہلی پہنچ گئے ہیں۔ چنانچہ وہ ملازم بھی دہلی پہنچ گیا اور مدتوں اُن کے آگے پیچھے سائے کی طرح پھرتا رہا۔ کچھ عرصے بعد یہ جذبہ بے اختیار سکون کی طرف مائل ہوا۔ آخر ان کے بچپن کے دوست منشی ذکاءاللہ صاحب کسی طرح منا کر انہیں اپنے دولت کدے پر لے آئے۔ بہت مدت مہمان رکھا اور ہر قسم کی ناز برداریاں کیں۔

اب یہ ہوا کہ آزاد میاں مولانا ذکاءاللہ کے گھر رہتے ہیں، کبھی سیانے ہیں کبھی، جذبی ہیں، کبھی ہنس دیتے ہیں، کبھی رو دیتے ہیں۔ کبھی دوستوں میں کوش ہیں کبھی ناراض ہیں۔ مولوی ذکاءاللہ اُنھیں پر چاتے ہیں اور وہ اُن کی سُن کر چپ ہو رہتے ہیں۔ اپنی مرضی کے مولا ہیں، دہلی کی گلیاں گھومتے پھرتے ہیں، ذکاءاللہ کے ملازم اِدھر اُدھر آگے پیچھے لگے ہیں کہیں پیدل لاہور نہ نکل جائے یا کسی دیوانے کی طرح فتح پور سیکری، آگرے کی طرف منہ نہ کر بیٹھے۔ غرض ہر طور اپنی مرضی کرتے تھے اور ذکاءاللہ بڑی مشکل سے اُن کو قابو کیے تھے ایک دن اسی اپنی مرضی کے بارے میں آغا محمد باقر لکھتے ہیں، ایک دن حجام ذکاءاللہ کا خط بنانے آیا اور اُس نے خط بنانا شروع کیا۔ آزاد وہاں موجود تھے۔ انہوں نے حجام سے کہا ہٹ جا۔ تجھے خط بھی بنانا نہیں آتا، یہ کہہ کر قینچی اُس کے ہاتھ سے چھین لی۔ ذکاءاللہ صاحب نے بھی کہا تم ہٹ جاؤ۔ چنانچہ آزاد نے پہلے داڑھی تراشی پھر استرا لے کر ذکاءاللہ صاحب کا خط بنایا۔ مولوی صاحب نہایت صبر و سکون سے بیٹھے رہے۔ جب کام ختم ہو گیا تو انہوں نے آئنے میں دیکھا۔ واقعی داڑھی نہایت عمدہ تراشی تھی اور اُسترے سے خط بھی خوب بنایا تھا۔

جب احباب میں اِس واقعہ کا ذکر آیا تو منشی صاحب سے لوگوں نے کہا کہ بھئی تم نے کمال کر دیا۔ دیوانے کے ہاتھ میں اُسترا دے کر سکون سے بیٹھے رہے۔ اُنہوں نے مسکرا کر

کہا، مجھے یقین تھا محمد حسین دیوانہ سہی لیکن میرا گلا نہیں کاٹے گا۔

اب طبیعت اور زیادہ سکون پذیر ہو گئی تھی اور وہی سید دھیان شاہ والی حالت ہو گئی تھی۔ کبھی ہوش میں تھے کبھی مجذوب تھے۔ چنانچہ والد محترم پھر دہلی گئے اور اُن کو اپنے ساتھ لاہور لے آئے۔ یہاں مولانا کا علاج معالجہ کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹروں اور حکیموں نے دیکھا اور جس قدر ممکن ہوا علاج بھی کیا۔ آخر تجویز یہ ہوئی کہ پاگل خانے میں داخل کر دیا جائے۔ شاید وہاں کے ڈاکٹر علاج میں کامیاب ہوں۔ یہ بھی کیا گیا۔ ایک دن والد مرحوم دیکھنے گئے تو اپنے باپ کی حالت اُن سے نہ دیکھی گئی۔ صحت پہلے سے زیادہ خراب ہو چکی تھی اور وہاں رکھنے سے کچھ فائدہ بھی مرتب نہ ہوا تھا۔ اس لئے وہ اُن کو واپس لے آئے۔

ایک دن اِسی وارفتگی کا جذبہ تھا، مولانا کے پاؤں کے چکر کا پھیلاو لاہور سے علی گڑھ کھینچتا ہوا لے گیا۔ یہ سفر بھی پیدل کی منزلوں میں مارا۔ آغا سلمان باقر لکھتے ہیں:

''آزاد جنون کی حالت میں علی گڑھ کی طرف روانہ ہوئے، نہ جانے دماغ میں کیا آئی ہو گی۔ جب وہ شہر پہنچے تو پاؤں میں ورم آ چکا تھا اور جگہ جگہ زخموں پر پٹیاں باندھ رکھی تھیں۔ آزاد اسی حالت میں سیدھے سرسید کے مکان پر گئے اور ملازموں سے کہا کہ جاؤ کہو کہ آپ کی ملاقات لاہور سے آزاد آیا ہے سرسید آزاد کا نام سنتے ہی حیران ہو گئے۔ جا کر دیکھا تو واقعی محمد حسین آزاد تھے۔ بڑی گرم جوشی سے ملے جاتے ہی آزاد نے سرسید سے کہا معلوم ہے مَیں یہاں کیوں آیا ہوں، سرسید نے انکساراً کہا صرف میری ملاقات کے لیے یہ تکلیف اُٹھائی، کہا نہیں، بلکہ میرے پاس ابوالفضل کی روح آئی تھی۔ میرے اور ابوالفضل کے درمیان دیر تک اکبر کے نئے مذہب پر مناظرہ ہوا۔ پھر آزاد نے اُسی تفصیل کے ساتھ ابوالفضل کی تقریر اور اپنے جواب سنائے ایک ہفتہ کے بعد سرسید نے

اپنے خادم کی حفاظت میں آزاد کو لاہور روانہ کیا"۔

اب مولانا اپنے علیحدہ مکان میں رہنے لگے۔ آس پاس الماریوں پر کتب خانہ سجا دیا گیا۔ اسی کمرے میں ایک طرف پلنگ تھا، ایک طرف ایک چھوٹا سا بوریا، اُس پر فرش۔ کاغذ، قلم، دوات، قلمدان، سب کچھ پاس رکھ کر بیٹھتے۔ صبح شام دہی کھاتے کہ وہ انہیں بہت مرغوب تھا اور اگر موسم تربوزوں کا ہوتا تو وہ بھی دہی کے ساتھ کھائے جاتے تھے۔ بیدانہ کے موسم میں بیدانہ کثرت سے کھاتے۔ انگوروں کے موسم میں سیروں انگور کھا جاتے۔ تربوز اور آم بھی بہت مرغوب تھے۔ غرض کسی قسم کی روک ٹوک نہ تھی۔ اس زمانے میں انہیں سیر کا بھی بہت شوق ہو گیا تھا۔ صبح شام کئی کئی میل باغوں اور جنگلوں میں گردش کرتے۔ سیر میں ہر درخت اور پتہ ان کا مخاطب ہوتا۔ کہیں کھڑے ہو کر چپکے چپکے باتیں کرتے۔ کہیں درخت کے نیچے لیٹ کر برداشت کا عمل کرتے۔ پھر آگے بڑھتے۔ راہ میں اگر کوئی ملتا اور سلام کرتا تو اس کا جواب دیتے اور کھڑے ہو کر ہاتھ اُٹھا کر اس کے لئے دعائے خیر کرتے۔ اگر کوئی طالبعلم مل جاتا تو اسے بھی دعائیں دیتے۔ وہ اگر کچھ پوچھتا تو اسے بتلا بھی دیتے۔ قاضی فضل حق صاحب پروفیسر گورنمنٹ کالج بیان کرتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ "سہ نثر ظہوری" کا ایک باب ان کے سامنے کھول کر پوچھا کہ یہ کس طرح ہے۔ وہ کتنی ہی دیر اس کے متعلق تقریر کرتے رہے اور مجھے بہت کچھ سمجھایا، لیکن اس کے بعد پھر بگڑ گئے اور چل دیے کہ جاؤ اپنا کام کرو۔

اس زمانے میں انکو غزلیں اور عشقیہ شاعری کہنے کا دوبارہ شوق ہو گیا تھا۔ اُن کی بہت سی غزلیں اسی دور زندگی کی یادگار ہیں۔ مجھ سے ایک صاحب نے بیان کیا کہ ایک دن انہوں نے مولانا کو باغ میں سیر کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ چلتے چلتے رکے۔ پھر ایک درخت کے نیچے جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں بیٹھ کر جیب سے کاغذ اور پنسل نکالی اور کاغذ پر کچھ لکھا۔ لکھنے کے بعد تھوڑی سے زمین کھودی اور وہ کاغذ اُس میں دبا کر چلے گئے۔ جب کافی دور نکل گئے

تو میں نے جا کر وہاں سے کاغذ نکالا۔ اس پر چند شعر لکھے ہوئے تھے۔ غرض اس قسم کے سینکڑوں واقعات سننے میں آتے تھے۔ بات یہ ہے وہ حالت جذب میں اکثر اشعار کہتے اور ان کو یہ کہ کر ہوا میں اڑا دیتے یا زمین میں دفن کر دیتے، کبھی دریا میں بہا دیتے کہ جاؤ اُستاد کی خدمت میں جاؤ۔

اسی عالم میں انہوں نے میری سب سے بڑی دو بہنوں کو لکھنا پڑھنا اور ایک عزیزہ کو قرآن شریف یا قرات پڑھنا سکھایا۔ انہیں اپنے پوتے اور پوتیوں سے بہت محبت تھی۔ اگر کسی کی رونے کی آواز زنانے مکان میں سے آتی تو فوراً بے قرار ہو کر اپنے مکان سے باہر نکل آتے اور وہیں سے شور مچاتے۔ میری والدہ کو برا بھلا کہتے اور کہتے کہ یہ میرے بچوں کو مار ڈالے گی۔ اگر کوئی بچہ روتا ہوا اُن کے پاس چلا جاتا تو مارے غصے کے آپے سے باہر ہو جاتے اور اکثر لکڑی لے کر مارنے کے لیے زنانے مکان کی طرف آتے، لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کبھی مارنے کی نوبت نہیں آئی۔ ہاں زبانی بہت کچھ کہہ ڈالتے۔

اگر بھوک لگتی تو زنانے مکان میں آتے اور جو کچھ ملتا اپنے مکان میں لے جا کر کھاتے اور اگر ایسا نہ کرتے تو ملازم خود اُن کو جا کر دے آتا۔ جب زنانے مکان میں آتے تو سب بچے سلام کرتے۔ وہ ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعائیں دیتے۔ کوئی بچہ پڑھتا ہوتا تو اس کو تھوڑا بہت پڑھا بھی دیتے۔ لکھائی میں اصلاح تو عام طور پر دیا کرتے تھے اور تمام پوتے پوتیوں کے نام بھی وہی رکھا کرتے تھے۔ سب سے بڑے پوتے کا نام اُستاد ذوق کے بیٹے کے نام پر محمد اسمٰعیل رکھا تھا۔ جب میں پیدا ہوا تھا تو میری بڑی بہن اُن کے پاس گئیں اور جا کر کہا دادا ابا! اللہ نے ہمیں ایک اور بھائی دیا ہے۔ انہوں نے فوراً دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور کہا اس کا نام میرے والد کے نام پر محمد باقر ہوگا۔ اُس کے بعد سے جب زنانے مکان میں آتے تو فوراً مجھے آن کر کئی کئی بار سلام کرتے اور ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر دعائیں مانگتے اور یہ کہتے کہ یہ میرے والد کا ہم نام ہے۔ کہتے ہیں بچپن میں ایک دفعہ کسی بہن نے بے دیکھے دروازہ بند کیا

اور میری انگلیاں اُس میں پس گئیں۔ جب انہیں معلوم ہوا تو مارے غصے کے لال پیلے ہو گئے۔ بہن کو بہت برا بھلا کہا اور میری انگلیوں کو بار بار پھونک کر دباتے تھے اور کہتے تھے ارے یہ تو لکھنے پڑھنے کی انگلیاں ہیں۔ یہ تو نے کیا غضب کی۔ یہ وارفتگی کا زمانہ تقریباً بیس سال رہا۔ اس طویل مدت میں نہ تو ان کی ذات سے کسی کو گزند پہنچا اور نہ وہ کسی پر بار گراں ہوئے۔ لطف یہ ہے کہ اس زمانے میں بھی قلم نچلا نہیں بیٹھا۔ وہ ہمیشہ تصنیف و تالیف میں منہمک رہتے۔ ان کی اس زمانے کی تصنیفات سینکڑوں ہیں، لیکن وہ دنیاداروں کے لئے نہیں۔ وہ ان کے اپنے لئے تھیں۔ یہ تمام مسودات نہایت خوشنما لکھے ہوئے ہیں"۔

یہی بستی عاشقوں کی، کبھو سیر کرنے چل تُو
کہ محلے کے محلے پڑے ہیں خراب تجھ بن

لاہور کے مضافات اور میاں آزاد

میاں آزاد کے وقتوں میں لاہور کے مضافات کے بارے میں بہت روایتیں ہیں۔ ہم سب راویوں کو جمع کریں تو لاہور کے آس پاس کا منظر کچھ ایسے ہمارے سامنے آتا ہے۔ ایک لاہور وہ تھا جو ایک فصیل کے اندر تھا اور ایک لاہور فصیل کے باہر تھا۔ اس فصیل کے بارہ دروازے تھے۔ ہر دروازہ ایک چوڑے بازار اور چھوٹے چوکوں کی طرف کھلتا تھا۔ کچھ فاصلے کے بعد اس بازار سے تنگ کوچے، گلیاں اور بازار نکلتے چلے جاتے تھے۔ کہیں کہیں تو ایک آدمی کے گزرنے کا مقام بنتا تھا۔ کہیں بڑے چوک بھی آتے تھے مگر یہ بھی فقط پچاس فٹ سے بڑے نہ ہوتے تھے۔ دکانیں اور چبوترے اور ڈیوڑھیاں یہاں ویسی نہ تھیں جیسی دہلی میں تھی مگر تھیں ضرور۔ اکثر ان گلیوں کی تنگی کا باعث یہ تھا کہ لاہور کو آباد کرنے کا سہرا ہندوؤں کے سر جاتا تھا اور وہ مکان اور حویلیاں اور کوچے زیادہ کھلے نہ رکھتے تھے۔ اندرون شہر کی شمالی طرف کی دیوار کے ساتھ قلعہ تھا اور قلعے کے دوسری طرف راوی بہتا تھا۔ دریائے راوی اور قلعے کے درمیان آموں اور سنگتروں کے بڑے بڑے باغات تھے۔ یہ باغ اکثر پھولوں اور بُور کے موسموں میں خوشبو اور باس مہکاتے تھے۔ باغات کو راوی سے نکالی گئی وہ نہر پانی بھرتی تھی، جسے لاہور کے چاروں طرف گھمایا گیا تھا۔ راوی اور قلعے یا شہر کی فصیل کے درمیان فاصلہ ایک کلومیٹر کا تھا اور یہ سب فاصلہ باغوں اور ہری بھری فصلوں سے بھرا

بھرا یا تھا۔ دریا کے دوسری جانب شاہدرہ کی سرسبز وادیاں اور سیر گاہیں اور چراگاہیں اور جنگلات تھے، جہاں خاص طور پر مغلوں کے ایک بادشاہ جہانگیر نے باغات لگوائے تھے۔ اسی طرح شہر کے مشرق کی جانب اور روای سے اس طرف بھی باغات اور سیر گاہیں مغلوں نے بہت بنوار کھی تھیں ۔ اِسے شالا مار باغ کا نام دیا ہوا تھا، یہ شالا مار باغ آج بھی یہاں موجود ہے اور اندرون شہر سے اس کا فاصلہ یہی کچھ چار کلو میٹر ہوگا۔ اس طرف سے ایک ریلوے لائن نکال کر اندرون شہر اور شالا مار کو آپس سے کاٹ دیا گیا تھا البتہ دو موری گیٹ سے تانگے شالا مار کی طرف نکلتے تھے۔ اندرون شہر کی جنوبی اور شالی طرف کے پورے علاقے وسیع میدان چھوڑ کر لاہور کی نئی بستیاں شروع ہوگئی تھیں اور کافی بڑھ کر داتا صاحب کے آگے کرشن نگر، اور مزنگ تک بڑھ گئی تھیں۔ انھی علاقوں کے درمیان میں مال روڈ اور انار کلی کے ارد گرد انگریزی دفاتر بس گئے تھے۔ مارکیٹیں بن گئی تھیں مگر یہ سب بہت کھلی کھلی تھیں۔ اکثر دور تک صاف میدان پڑے ہوئے تھے۔ اُدھر راوی کے دونوں جانب کہیں باغات تھے، کہیں جنگلات تھے اور اُن سے پرے فصلیں تھیں۔ چوبرجی اور بیگم کے باغ کے تمام آس پاس فصلیں اُگتی تھیں اور کاشت ہوتی تھی۔ لاہور سے کوئی پندرہ کلو میٹر اُس طرف ٹھوکر اور شادی وال کے علاقے تھے۔ شادی وال میں کبھی اکبر بادشاہ کے خیمے لگتے تھے۔ آج کل یہ علاقہ جوہر ٹاون کا حصہ ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد کے وارفتگی کے زمانے کو لیجیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ یہاں ایک نئے روپ میں علم کے چراغ پاش زمانوں کے دیوں میں روغن دل جلاتے ہیں اور علم کے نئے استعاروں سے بات کرتے نظر آتے ہیں۔ اول ہمیں اُن کی زندگی کے اس دور میں جھانکنے کے واسطے ایک دوسری طرح کی قندیل سے کرنیں لینی ہوں گی اور اپنی فکر کو گھے بندھے اصولوں سے ہٹا کر تحقیق کے نئے پیمانوں کے اسطرلاب ڈھونڈنا ہوں گے۔ کم وبیش ۱۸۹۰ میں اُنھوں نے ادراک کے ظاہری پیمانوں کو خیر باد کہہ دیا تھا۔ یہ وہ دور تھا جب وہ اپنا تمام

وہ کام مکمل کر چکے تھے، جسے اردو نثر کے نایاب خزانوں کا ماخذ کہنا چاہیے۔ آبِ حیات سے لے کر دربارِ اکبری تک کا پورا کام حاشیوں تک اپنے قلم کی بوقلمونیوں سے گزار چکے تھے۔ اب اُنھیں اپنے فن کو منوانے یا عامہ سے داد پانے کی کچھ ضرورت نہ تھی۔ وارفتگی سے کہیں پہلے اُن کی راہ و رسم ہم نفسانِ جذب سے بڑھ چکی تھی۔ پھر وہ اِن جذب کی وادیوں میں اتنا آگے نکل گئے کہ واپس آنے کا امکان تک نہ تھا۔ اب وہ جو کچھ لکھنا چاہتے تھے، دل کا مدعا تھا اور دل کی زبان تھی اور جذب کا عالم تھا اور لاہور کے یہی مضافات تھے جہاں وہ سرگردان تھے۔ وہ تب جو کچھ لکھتے تھے، اُنھیں نہ تو اُس زبان کو سمجھانے کی ضرورت تھی، نہ متاثر کرنے کا شوق تھا، بس وہ کچھ کہتے چلے جاتے تھے، جو اُن کا دل ہی سُنے اور دل ہی سمجھے۔ اس کے لیے اول مولانا نے اپنی سیر گاہی کے مختصر لمحوں کو طویل کیا۔ کبھی لاہور کے مضافات کے قریہ و قصبات میں نکل گئے، کبھی دریا کے پانیوں سے ہم کلام ہونے راوی کے کنارے پہروں گزار دیے اور کبھی لاہور کے اطراف کے باغوں اور نہروں کی سیروں میں بھٹک گئے۔ فطرت اور کائنات کے خاموش زبان دانوں، درختوں اور پرندوں سے ہم کلام ہوئے۔ انسانوں سے جتنا دور نکل سکتے تھے نکل گئے۔ دن بھر کی بنجارگی یا کئی کئی روز کی آوارگی کے بعد شہر لوٹتے تو قلم دوات لے کر بیٹھ جاتے اور زبانِ دل سے احوالِ دل کہتے چلے جاتے۔ بہار میں درختوں کی سبزیاں، پھولوں کی باس اور پرندوں کی چہکاریں بڑھ جاتی تھیں۔ اِدھر مولانا کا جذب بڑھ جاتا تھا۔ ساون آتے تھے گزر جاتے تھے، موسموں کے رنگ ساونی ہوتے تھے، پھر آموں اور سنگتروں کی باس میں زردگی میں بدل جاتے تھے اور وہی رنگ مولانا آزاد پر چڑھ جاتے تھے، جیسے موسم بدلتے، مولانا کا دل بدلتا تھا اور یہی رنگ اُن کے قلم کو رنگتے تھے۔ اکثر محققین کا خیال ہے، اُس زمانے کی مولانا کی تحریریں بے معنی اور سر پیر کے بغیر ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق نے تو انتہائی دلیری کے ساتھ اُن تحریروں کو بے کار کہہ کر رد کر دیا ہے۔ یہی حالت ہماری یونیورسٹی کے دیگر پروفیسروں اور ادبی مورخین کی ہے۔ اُنھوں

ساپن کا پھنکارا جاتا ہے۔ سینے میں ایک جگہ کٹار ہے، وہیں سے پھر چل نکلا اور بہتا چلا۔ ناک نے باہر سے نیا سانس بھیجا، پہلا سانس کہیں کا کہیں پہنچا اور وہیں غائب ہو گیا۔ دوسرا جو آیا اُس نے اگلے سے نیچے جا کر کبھی تین ایسے کھٹکے باہر کو دیے جیسے سانپ پھنکارنے میں پف پف کر کے زہریلی بھڑاس نکالتا ہے، وہ بھی اندر غائب، پھر اوپر سے ایک سانس نیا اُٹھا، بڑی اُٹھان سے سینہ پھلا کر سینے میں وسعت پیدا کر کے، یہ بھی جلد سینے سے پھر کر آیا مگر آدھا، باقی نے اُس آہستگی سے لہرائے ہوئے اندر کا راستہ لیا اور کہیں کا کہیں جا نکلا۔ خدا جانے کہاں جاتا ہے پھر نیا سانس شروع ہوتا ہے، اس دیکھ کر کون پہچان سکتا ہے کہ وہی نفسِ مقدس ہوگا۔

اگر شروع ہوتے ہی اِسے عامل سنبھالے اور عمل شروع کرے یا اُستاد روحانی یا روحِ مقدس اشارہ کرے تو سبحان اللہ! یقین جانیے کہ جہاں تک چاہے سینے میں دم بھرتا چلا جائے ہرگز تنگی نہ کرے گا۔ اور جہاں تک امواجِ تمنا طولانی ہو، تمام نہ ہوگا۔ بندہ آزاد نے اس کی صورت حال دیکھ کر ''دم مار پیچ'' اُس کا نام رکھا۔ پھر اژدھے کو توڑنا شیر ہی کا کام ہے۔ اس لیے اس عمل کا نام شیر گانی فرمایا۔ ص نمبر ۴۸، عالمِ وارفتگی

اس تحریر میں آپ دیکھیں، مولانا نفس کو سانپ کہہ رہے ہیں جو سینے میں داخل ہو کر سینے کو زہر سے بھرنے کی کوشش کرتا ہے مگر مولانا کہتے ہیں کہ اسی سینے میں ایک جگہ کٹار ہے جو اس نفس کو کاٹ دیتی ہے یا یوں کہیں سانپ کو کاٹتی ہے اور اس طرح کاٹتی ہے کہ وہ سانپ سینے میں اپنا زہر پھیلا کر یا خود گنڈل مار کر آپ کو مرنے نہیں دیتی۔ دراصل وہ کٹار وہی دل ہے جس میں سے ایک ایسا نفس نکلتا ہے جو باہر سے نہیں اندر ہی سے پیدا ہوتا ہے اور یہ نفس مقدس ہے۔ یہ نفس مقدس خارجی نفس کو کاٹنے کا کام کرتا ہے۔ اب دیکھتے ہیں کہ یہ نفس مقدس کون ہے جو سینے کے اندر جانے والے خارجی نفس یعنی سانپ کو کاٹ کر ضائع کر دیتا ہے اور انسان کو مرنے نہیں دیتا۔ اس کی وضاحت پہلے مولانا عمل شیر گانی کے

نے مولانا کو اِس بیس سال کے زمانے میں ایک ایسا آدمی خیال کر لیا، جسے دل و دماغ سے کوئی سروکار نہ تھا اور فقط ایک حواس باختہ شخص قلم گھسیٹتا تھا۔ مَیں کہوں گا ایسا خیال کرنا اُن جاہلوں کی بہت بڑی حماقت ہے۔ وہ مولانا کی طبیعت کو اپنی طبیعت پر قیاس کر کے اِس طرح کی توہین کرتے ہیں۔ جب ایسا معاملہ پیش آ جائے کہ کسی نابغے کی تحریریں آپ کی حیطۂ فکر سے باہر ہو جائیں تو اُن کو سمجھنے کے روایتی پیمانے توڑ دینے چاہئیں۔ مولانا کے بارے میں تمام لوگ جانتے ہیں کہ اُن کی مذہبی وابستگی اور دل بستگی کی راہیں آئمہ اہلِ بیت کی طرف کھلتی تھیں۔ وہ اُن کی اِس دور میں لکھی گئی تحریروں کے الفاظ کی نفسیات سمجھنے کی ضرورت ہے۔ وہ الفاظ دراصل اُن کے ایسے کوڈ ورڈز ہیں جنھیں سمجھنے کے لیے جہاں ایک طرف ادبی شناسائی ضرورر ہے وہیں مولانا کے متعلق تاریخی اور مذہبی شناسائی کا پورا ادراک چاہیے۔ کچھ عرصہ سے میرا آغا سلمان باقر سے بہت اُٹھنا بیٹھنا ہوا۔ وہ مولانا محمد حسین آزاد کے پڑپوتے بھی ہیں اور میرے ہم مشرب بھی۔ اُنھوں نے مولانا کی بعض ایسی تحریروں کو اکٹھا کیا ہے جو مُہمل ہونے کے ساتھ انتہائی معنی خیز بھی ہیں۔ مَیں نے جب انھیں پڑھا تو مجھ پر حیرت کے باب کھلنے لگے۔ میرے لیے اُنھیں سمجھنا بالکل بھی مشکل نہیں تھا۔ جبکہ یہی وہ تحریریں تھیں جنھیں اکثر نقاد بے معنی قرار دے کر رد کر چکے ہیں۔ مَیں آپ کو سرِ دست یہاں اُن کی اِسی زمانے کی دو تحریروں کو ذکر کرتا ہوں۔ مثلاً پہلے آپ مولانا کی یہ تحریر پڑھیں۔

''رحمت کی سوت جاری ہے۔ فیض کا نٹے کی تول چل رہا ہے۔ وہی خاص و عام کی جان ہے اور اُس کا نامِ مبارک سانس ہے۔ سانس اجزا کی کمی بیشی اور مختلف کیفیتوں میں بیشمار اقسام رکھتا ہے۔ ہر قسم کی متعدد تاثیریں رہیں۔ اس کی تقریر حدِ تحریر سے باہر ہے۔

ایک سانس تمھارے سینے میں دکھاتے ہیں کہ عجائب قدرت کا کرشمہ ہے۔ دیکھو سینے میں کچھ ہے۔ مجھے معلوم ہوا کہ سانس ہے مگر نیچے بہا جاتا ہے (بہت آہستگی سے) جیسے کسی

ذریعے کرتے ہیں کہ اُس کا نام شیر گانی رکھ کر بتاتے ہیں کہ وہ اندرونی نفس مقدس دراصل ایک شیر ہے جو سانپ کو پھاڑ کر اُسے ختم کر دیتا ہے۔ یہ شیر کون ہے؟ وہی شیر ہے جو اژدھے چیرتا ہے۔ اژدھے کو کس شیر نے چیرا ہے۔ اس بات کو شیعہ مکتبہ فکر کی تاریخ بتائے گی۔ جس میں ایک روایت بہت مشہور ہے۔ آیئے پہلے اُس روایت کو پڑھ لیں۔ وہ یہ ہے کہ ایک بار مولا علی السلام جب دو سال کے تھے اور پنگھوڑے میں لیٹے تھے، اُسی لمحے ایک اژدھا اُن کے پنگھوڑے میں داخل ہو گیا۔ مولا علی کی والدہ نے جب یہ ماجرہ دیکھا تو بہت گھبرائیں اور بھاگیں کہ کسی طرح اژدھے سے بیٹے کو نقصان نہ پہنچ جائے، نزدیک آئیں تو دیکھا مولا علی اپنے دونوں ہاتھوں سے اژدھے کے جبڑوں کو پھاڑ کر دو کر چکے تھے۔ اُدھر مولانا کا فرمانا کہ اژدھے کو پھاڑنا شیر ہی کا کام ہے، دوسری طرف شیر خدا علی علیہ السلام کا لقب ہے۔ اور اُسی شیر نے اژدھے کو پھاڑا۔ یہ واقعہ تمام شیعہ روایات اور اکثر سُنی تواریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ اب آپ کو سمجھ جانا چاہیے کہ وہ اندرونی نفس مقدس جو خارجی نفس یعنی سانپ کو پھاڑ کر ختم کرتا ہے، دراصل ہر سانس کے ساتھ علی کا اسم ہے اور یہ اسم سب کے لیے نہیں مولانا محمد حسین آزاد اپنے لیے قرار دے رہے ہیں۔ اس پوری تحریر میں مولانا اپنی ہی سانس اور اپنے ہی نفس کے متعلق انکشاف کر رہے ہیں جو اُن کے سینے میں زہر پیدا نہیں ہونے دیتا، یہ نفس کا زہر ایک حسد کا سانپ بھی ہے، خواہشات کا سانپ بھی ہے، جسے علی کا نام کاٹ کے رکھ دیتا ہے۔ اب یہ بات وہی سمجھے جسے مولانا کی اندرونی واردات کا علم ہو۔ اور شیعہ تارک کی رمزوں سے واقف ہو۔

اب اُن کی ایک اور تحریر کو دیکھیے جسے اکثر احباب پڑھ کر ہنستے ہیں اور بالکل یہ سمجھ رہے ہیں کہ مولانا تو یہاں اپنی طفلانہ سوچ کی عکاسی کر رہے ہیں۔ پہلے تحریر پڑھیں۔

"میں نے اپنی عمل داری میں حکم دیا کہ مُرغ کوئی نہ لڑے۔ ہم نے اُس کے باب میں بہت باتیں بتائیں۔ جب مرغ لڑنے کو کھڑا ہو تم بیچ میں آ کر کہا کرو، پنچم پنچم، پنچم پنچم

پنچم پنچم، کوئی بیس دفعہ۔ اس کی تاثیر یہ ہوگی کہ دونوں وہیں ڈ میں ڈال کر اپنی اپنی طرف ہو جائیں گے اور اسی طرح جہاں دو شخص لڑتے ہوں وہاں کہو، پنچم پنچم، پنچم پنچم، لڑائی بند ہو جائے گی۔

سب سے پہلے تو آپ دیکھیں کہ مولانا نے اپنی ایک حکومت فرض کی ہے۔ جس میں کچھ فرامین نافذ کیے ہیں، اُن فرامین میں ایک فرمان یہ ہے کہ مُرغ کوئی نہ لڑے، جس کے لیے وہ طاقت کا استعمال نہیں کرتے بلکہ ایک وظیفے کا استعمال کرتے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ جب حکومت مولانا کی ہے تو کسی بُرے فعل کو روکنے کے لیے طاقت کا استعمال کیوں نہیں، وجہ وہی تشدد ہے جو کسی حکومت میں اہلِ حکومت انجام دیتے ہیں۔ اور اسی تشدد کے مولانا مخالف ہیں یعنی وہ اگر مرغوں کی لڑائی، جو کہ بے مقصد ہے، کو سختی سے نہیں بلکہ بے ضرر عمل سے ختم کرنا چاہتے ہیں، اور یہ بے ضرر عمل کیا ہے؟ پنچم۔ اب دیکھتے ہیں یہ پنچم سے مولانا کی کیا مراد ہے۔ پہلے ہم اس کے حروفِ تہجی کے اعداد نکالتے ہیں اور اُس کے بعد اس کا مطلب خود بخود سامنے آجائے گا۔

پ ---------- ۲

ن ---------- ۵۰

چ ---------- ۳

م ---------- ۴۰

کل اعداد ---------- ۹۵

ہم جب اِن اعداد کو جمع کرتے ہیں تو اِن کی صورت ۱۴ بنتی ہے اور یہی چودہ جب آپس میں جمع کیے جائیں تو ۵ کا عدد نکلتا ہے، یعنی وہی پانچ جو پنجم بھی ہے، پنچم بھی ہے اور پانچ بھی ہے۔ چنانچہ یہ وہی پنج تن پاک ہیں جس کے اصل ۱۴ بھی ہیں۔ یعنی مولانا آزاد یہاں بھی اپنی اُس ڈگر کو نہیں چھوڑتے، وہ کہتے ہیں، جو بھی بے مقصد لڑے اور ظلم پر اپنی بنیاد رکھے

اُس کے سامنے پنج تن پاک اور چودہ معصوموں کا وظیفہ پڑھو کیونکہ وہی عدل کے امام ہیں اور یہ بات وہ اپنے یقین کامل کو گواہ بنا کر کرتے ہیں۔ یہ اس لیے ہے کہ انھی پنج تن پاک سے اُن کی تحریروں کی رمزیں پڑی ہیں جنھیں عوام الناس مہمل سمجھ کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ ان تحریروں کا کوئی سر پیر نہیں ہے۔

یہ دو مثالیں دینے کا مقصد آپ سے یہی ہے کہ مولانا اپنے وارفتگی کے دَور میں نہ تو بے مقصد لکھتے تھے، نہ بے مقصد ہانکتے تھے۔ اگر وہ کسی پر اپنا غصہ نکالتے تھے تو بھی اپنے کوڈز میں، اگر کسی سے پیار کرتے تھے تو بھی کوڈز میں اور اگر وہ کچھ زمانے کو نصیحتیں کرنا واجب جانتے تھے تو بھی انھی کوڈز میں۔

مولانا خلیل الرحمٰن آزاد کی وارفتگی کے زمانے میں بہت چھوٹے تھے، اور اُن کا آزاد کے گھرانے میں خاصا آنا جانا تھا۔ وہ ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو اُن کی موجودگی میں پیش آیا۔

اُن دنوں آزاد امام باڑہ میں رہتے تھے۔ میں مولانا سے ڈرنے لگا تھا کیونکہ سخت سُست کہہ بیٹھتے تھے۔ اب ایک لطیفہ یہ ہوا۔ کہ صحن میں دو چارپائیاں بھی تھیں۔ ایک پر آزاد بیٹھے تھے مولوی ممتاز از راہِ ادب چارپائی کے پائنتی بیٹھ گئے تو۔ میں بھی دوسری خالی چارپائی پر پائنتیہ بیٹھ گیا۔ مجھ سے مولانا نے کہا میاں کس لیے وہاں بیٹھے ہو، سرہانے ہو بیٹھو۔ میں نے فوراً تکمیل کی۔ مولوی ممتا علی سے انھوں نے دو تین مرتبہ کہا کہ آگے ہو بیٹھے، اُنھوں نے ہر مرتب یہی جواب دیا کہ اچھا بیٹھا ہوں۔ آخر مولانا کو غصہ آ گیا۔ کہنے لگے بے وقوف، گدھا، احمق میری ادوائن ٹوٹی جا رہی ہے اور یہ کہتا ہے کہ اچھا بیٹھا ہوں۔ مولوی ممتاز علی صاحب جھٹ اوپر ہو بیٹھے مگر بہت شرمندہ۔ اسی وقت چوہڑی آئی اور وہ جھاڑو دینے لگی۔ اس سے بڑی گرد اڑی۔ اب کیا تھا آزاد چیخ اٹھے اور با آواز بلند فرمانے لگے، ابرو کی ماں، کتنی دفعہ تم سے کہا کہ چوہڑی کے آنے سے پہلے یہاں چھڑکاو کروا دیا کرو۔ اُنھوں نے کہا ابھی بہشتی نہیں آیا، چوہڑی سے کہہ دو کہ جھاڑو نہ دے۔ اس کا جواب مولانا

نے یہ دیا کہ بہشتی نہیں آیا تھا تو تم ہی نے ذرا کھڑے ہو کر پیشاب کر دیا ہوتا کہ گرد بیٹھ جاتی۔ آگا صاحب کی والدہ ماجدہ پر جو اثر ہوا، اُس کا اندازہ آپ کر لیجیے۔ انھوں نے پان دینے کے لیے مجھے بلایا تو آنسوؤں سے رو رہی تھیں۔ مجھ سے صرف اتنا کہا کہ پڑھے ہو کر ان کی عقل بالکل خراب ہوگئی۔ جو کچھ منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔ میرا سفید چونڈا رہا کہ گیا۔

مولانا خلیل الرحمٰن کی زبانی ایک واقعہ اور، جو واقعہ بھی ہے اور حادثہ بھی۔ فرماتے ہیں کہ مولوی صاحب کی صبح کی ہوا خوری ایسی حالت میں بھی بند نہ ہوئی۔ ایک روز میں دفتر جا رہا تھا، ہائی کورٹ کے سامنے جو نکا سڑک پر ہے وہاں دُور سے مولانا آتے ہوئے نظر آئے۔ مَیں سخت پریشان ہوا کہ برسوں سے نہیں ملا ہوں، دیکھیے کیسی بنتی ہے۔ مولانا نے مجھے دیکھ لیا اور کھڑے ہو گئے، مجھ سے کہنے لگے تم بہت عرصے سے نہیں ملے، کہیں باہر گئے تھے کہ یہیں ہو۔

میں نے غور کیا کچھ باتیں بالکل ہوش کی کرتے رہے، میرے ایک ایک لڑکے کی نام بنام خیریت پوچھی، پڑھنے لکھنے کا پوچھا، مَیں نے کہا کہ فلاں فلاں نے ایم اے کیا ہے، ایک بی اے میں ہے۔ سُن کر بہت خوش ہوئے، مبارک باد دی، عربی پڑھنے پر زور دیا۔ آدھا گھنٹا گرفتار رکھا، مجھے دفتر کی جلدی تھی، شامت جو آئی تو پوچھ بیٹھا کہ آپ کی بھی بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی، بس پھر کیا تھا، کہنے لگے:

تو ایسا بے ایمان پاجی ہے کہ تو نے میری کب خبر لی، میرے اوپر کیا کیا بن گئی، تو نے کروٹ نہیں لی، پاجی پوچھتا ہے کہ بہت دنوں سے زیارت نہیں ہوئی، ارے تجھے خبر بھی ہے کہ میرے ساتھ کیا دغا کی۔ اُس کی ماں کی چوت، ایک روز میں ہوا خوری میں دلی پہنچ گیا۔ ذکا اللہ نے بڑی خاطر سے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے مکان میں ٹھہرایا۔ مجھے کیا معلوم کے اُس کے دل میں دغا ہے۔ اُس کے مکان کے نزدیک ایک برات آکے ٹھہری۔

مجھ سے کہنے لگے کہ آزاد تو بھی برات دیکھ آ۔ میں گیا، برات والوں نے جو مجھے دیکھا تو شور مچایا، آزاد آیا، آزاد آیا، مجھے بڑی خاطر سے دُلہا کے پاس بٹھایا، مجھے کیا خبر کہ وہ ذکا اللہ نے، اُس کی ماں ۔۔۔۔ کیا فریب کیا۔ اب جو نکاح بندھنے لگا تو نکاح اور مہر کے ساتھ مجھے بھی باندھ دیا اور ایسا جکڑا کہ رسوں کے بندھنوں سے اب تک میرے بدن میں درد ہوتا ہے۔ جس طرح ہو سکا، میں رسوں کو تڑا کر ابھی چلا آتا ہوں۔ نہ پوچھیے کہ مجھے کتنی ہنسی آئی۔

---

۶ فروری ۱۹۱۰ کو بزم اردو لاہور کی جانب سے آزاد کی یاد میں ایک جلسہ ہوا۔ اُس جلسے میں مولوی ممتاز علی نے، جو آزاد کے حاضر باشوں میں سے تھے، ایک مفصل تقریر کی۔ مولوی ممتاز علی نے آزاد کے وارفتگی کے زمانے پر بہت سے واقعات سنائے۔ ایک واقعہ جو عالمِ وارفتگی کے آغاز سے قبل کا تھا، بیان کرتے ہوا کہا۔

عالمِ دیوانگی کے دورے سے پہلے بھی مولانا پر روحانی جذبات کا غلبہ رہتا تھا۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ مولانا بہ عارضِ فتق بیمار تھے۔ آپ اس وقت گورنمنٹ کالج لاہور میں عربی پروفیسری کی خدمت انجام دیتے تھے، رات کے وقت، غلبہ مرض کی وجہ سے شدید تکلیف ہوئی۔ آدھی رات کے بعد مجھے اپنے مکان میں بلا بھیجا۔ میں اُسی وقت گیا اور ردی حالت دیکھ کر مایوس پژمردہ خاطر ہوا۔ بالآخر دوا دارو کا انتظام کر کے اپنے گھر چلا آیا۔ صبح کو کچھ دن چڑھے مولانا نے مجھے پھر بلوا بھیجا، میں نے جا کر دیکھا تو بالکل تندرست پایا۔ مولانا نے کہا میری صحت یابی عجیب واقعہ ہے۔ دل لگا کر سنو

اس کرب اور تکلیف کی حالت میں مجھے آسمان پر کچھ آدمیوں کے بولنے کی آواز آئی، مَیں نے بہت زور سے سنا تو اس مجمعے مین میرے والد مولوی محمد باقر بھی گفتگو کرتے معلوم ہوئے۔ اک اور شخص کسی دوسرے آدمی کو کوئی بات سمجھا رہا تھا مگر وہ اُس کی سمجھ میں نہ آتی تھی، مَیں نے اپنے والد سے کہا، کہ یہ کیا مشکل معاملہ ہے جو اُس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مولوی

محمد باقر نے پوچھا، کیا تم سمجھ گئے ہو؟ میں نے کہا ہاں سمجھ گیا ہوں، چنانچہ میں نے اُن کو اُس کا مطلب اچھی طرح سمجھا دیا۔ وہ آدمی جو مسئلہ سمجھا رہا تھا، میرے والد سے پوچھنے لگا کہ یہ کون شخص ہے، انہوں نے جواب دیا، بندہ زادہ ہے۔ یہ سُنتے ہی اُس نے کہا تو اِسے بھی ساتھ کیوں نہیں لے لیتے مگر میرے والد نے کچھ عذر کر دیا۔ اُس کے بعد میں نے اپنے والد سے دریافت کیا کہ مجھے پوچھنے والا کون شخص ہے، اُنہوں نے جواب دیا، حضرت علیؑ ہیں، پھر حضرت علیؑ نے فرمایا، تم اِس کا علاج کیوں نہیں کر دیتے۔ مولوی محمد باقر نے جواب دیا، میں کس طرح علاج کر سکتا ہوں۔ حضرت علیؑ نے تدبیر بتائی کہ تم اِس کے پیٹ میں اُتر کر اِس کی انتڑیوں کو اپنے ہاتھ سے ٹھیک کر دو۔ چنانچہ اُس کے بعد مجھے ایسا محسوس ہوا کہ گویا مولوی محمد باقر میرے پیٹ میں اُتر گئے۔ جب اُن کو یہاں دیر لگی تو حضرت علیؑ نے آواز دی، مولوی صاحب نے جواب دیا، کہ انتڑی درست کر رہا ہوں آتا ہوں، یہ آواز اِس طرح آئی ہوئی محسوس ہوئی، گویا مولوی صاحب میرے پیٹ میں بول رہے ہیں۔ اُس کے بعد مین نے اپنے والد صاحب سے کہا، علاج تو ہو گیا مگر کوئی پرہیز، اپنہوں نے حضرت علیؑ سے پوچھا، آپ نے فرمایا، ہمارے علاج میں کسی پرہیز کی ضرورت نہیں مگر میں اِس پر اصرار کرتا رہا۔ آخر اُنہوں نے کہا، دہی کے ساتھ تربوز کھایا کرو۔

مولوی ممتاز علی نے کہا اُس کے بعد ہم نے مولانا آزاد کے مکان میں تربوز کے چھلکے اور دہی کے دونے اکثر پڑے دیکھے۔

آزاد کے شاگرد ناصر نذیر فراق، آزاد سے آخری ملاقات کا حال لکھتے ہوئے وہ تصویر کشی کرتے ہیں جس سے آزاد کی ذاتی حالت کا ایک اچھا عکس نظر آتا ہے۔ لیکن اُنہوں نے جا بجا مبالغہ آرائی بھی کی ہے جس کے باعث آزاد ایک جنونی نظر آتے ہیں۔ آزاد کی وارفتانہ کیفیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، یہ بیان حقائق سے دور بھی لے جاتا ہے، لکھتے ہیں۔

۱۹۰۹ میں یکایک خیال آیا کہ ایک بار لاہور چل کر مولانا کی زیارت پھر کرلو، ایسا نہ ہو خدانخواستہ مولانا اس جہان سے رحلت کر جائیں اور یہ آنکھیں آخری دیدار سے بھی محروم رہ جائیں۔ اس خیال کا آنا اور میرا بارہ مارچ ۱۹۰۹ کو لاہور چل دینا۔ انارکلی، محمد شفیع کی سرائے میں ٹھہرا۔ ۱۳ مارچ اکبری دروازے مولانا آزاد کی دولت سرا پر پہنچ گیا۔ ایک پنساری مولانا کے امام باڑے کے نیچے ہی دکان میں بیٹھتا ہے۔ میں نے اُس سے پوچھا آغا ابراہیم صاحب کہاں ہیں، اُس نے کہا وہ تو گجراوں میں ہیں۔ میں نے کہا اُن کے کوئی صاحب زادے، کہا آغا صاحب یوسف گھر میں ہیں۔ پھر میرے دستک دینے پر آغا محمد یوسف مرحوم کوٹھے پر نیچے اُتر آئے۔ وہ مجھے کیا پہچانتے۔ دیکھا نہ بھالا، پھر میں نے اپنا مدعا سنایا کہ آپ کے دادا جان کی قدم بوسی کے لیے دہلی سے آیا ہوں۔ فرمایا امام باڑے میں بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ ہم دونوں ساتھ ساتھ گئے۔ اُستاد امام باڑے کے برآمدے میں بیٹھے تھے۔ اور جس ہیئت سے بیٹھے تھے، اُسے دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آ گیا۔ ایک میلی سی اچکن گلے میں تھی، جس کی چولی میں پورے بٹن بھی نہ تھے۔ ایسا ہی میلا کچیلا ڈبل زین کا پاجاما تھا۔ سر پر مغلیہ وضع کی چکٹ ٹوپی اور پاؤں میں بہت ہی بوسیدہ جوتی تھی۔ ایک بوریے پر بیٹھے تھے۔ ایک مٹی کی رکابی میں شوربا تھا اور ایک چنگیر میں چپاتیاں تھیں۔ چپاتی کا نوالا بنا کر شوربے میں ڈبوتے اور اُسے منہ میں رکھ لیتے اور دیر تک چبا کر مشکل سے نگل جاتے تھے۔ بوریے کے اِدھر اُدھر کچھ راکھ، کچھ کوئلے اور کچھ کوڑا پڑا تھا۔ میں نے کہا سبحان اللہ یہ وہی منظر ہے جو حضرت نے آبِ حیات سید انشاء اللہ خان انشا کے آخری دور کا لکھا تھا۔ مجھے دیکھ کر فرمایا تم کون ہو۔ میرے نام بتانے پر فرمانے لگے۔ بھئی ہم تمھیں نہیں پہچانتے، میں نے کہا، میں آپ کا شاگرد ہوں، فرمایا اچھا، اگر تم میرے شاگرد ہو تو گرما گرم جلیبیاں تو لے آؤ۔ میں نے اسے بڑی سعادت سمجھا، دوڑا دوڑا گیا، گرم جلیبیاں تو نہ ملیں، ٹھنڈی لایا اور سامنے رکھ دیں۔ ایک جلیبی اُٹھائی اور فرمایا بھلا میرے ہلتے ہوئے دانتوں سے ٹھنڈی

جلیبیاں کب کھائی جائیں گی۔ اچھا اُٹھالو۔ میں نے اصرار کیا تو بگڑنے لگے۔ آغا محمد
یوسف نے کہا، نزاده نہ کہیے، نہیں تو بُرا بھلا کہیں گے۔ پھر کہا اچھا جاؤ یہاں سے۔ مَیں اور آغا
صاحب امام باڑے کے صدر دروازے میں آ کر ایک تخت پر بیٹھ گئے۔ آغا صاحب نے
پان سے تواضع فرمائی، پھر مَیں نے مولانا کی حالت پر اظہارِ افسوس کیا، اُس پر آغا صاحب
نے فرمایا، حضرت گور کا حال مردہ ہی خوب جانتا ہے۔ اگر دستر خوان میں روٹی لائی جاتی ہے
تو دستر کوان جلا دیتے ہیں۔ چینی کی رکابیوں میں سالن دیا جائے تو انہیں توڑ کر پھینک دیتے
ہیں۔ تانبے کی رکابیاں دیجیے تو بازار میں جا کر بیچ آتے ہیں یا کسی راہ چلتے کو دے دیتے ہیں
۔سینکڑوں برتن غارت ہو چکے۔ اچھے اور صاف ستھرے کپڑوں سے بیر ہے۔ اِدھر پہنائے
اُدھر پھاڑے۔ اتنے میں کیا دیکھتا ہوں کہ خلال کرتے ہوئے امام باڑے میں چلے آتے
ہیں مجھے دیکھ کر فرمایا، ہیں بھئی، تم کب دلی سے آ گئے۔ واللہ میں نے تمھیں اُس وقت نہیں
پہچانا تھا۔ یہ کہہ کر تخت کے تکیے کا سہارا لے کر بیٹھ گئے، مسکرانے لگے۔ مَیں نے کہا آپ
نے مجھے پہچان لیا؟ فرمایا ہاں میاں، تمھارا نام سید ناصر نذیر ہے۔ اِس بات کو سُن کر مَیں
نہایت خوش ہوا اور آغا یوسف بھی حیران ہو گیا۔ مَیں نے حضرت کے مزاج کو راہ پر دیکھ کر کہا
مَیں نے ایک تازہ سلام کہا ہے، وہ سنانا چاہتا ہوں، فرمایا پڑھو، میں نے سلام پڑھنا شروع
کیا۔ جو شعر پسند آتا تھا، اُس پر خوش ہو کر فرماتے تھے، یہ خوب کہا ہے اور جو پسند نہ آتا تو
فرماتے، یہ کچھ نہیں۔ جب میں نے سلام کا مقطع بھی پڑھ دیا تو فرمایا، تمھارا سلام تو بہت ہی
اچھا ہے مگر کہیں کہیں جو میں نے یہ کہہ دیا تھا کہ یہ کچھ نہیں، یہ شعر کی بندش کے لحاظ سے کہا تھا
مَیں نے کہا درست ہے، دیر تک باتیں کرتے رہے مگر کبھی کبھی بے ڈھنگے پن کی بھی کہہ
جاتے تھے پھر یکا یک اُٹھے اور بازار کی طرف چل دیے، پھر زندگی میں مولانا کو دیکھنا
نصیب نہ ہوا۔

موت مجنوں کو بھی یہیں آئی

کوہکن کل ہی مر گیا ہے یاں

ایک شخص کی زبانی مولانا کے جنازے کی کہانی

اللہ جانے کون سے عجائب ہیں کہ آپ جس شخص سے محبت کا رشتہ رکھیں، اُس کی باتیں اطراف وجوانب سے یوں آپ تک پہنچتی ہیں کہ معجزے لگتے ہیں۔ وہ خبریں دراصل خدا کی طرف سے آپ پر نازل ہوتی ہیں جن سے زندگی کے بہت رُخ وا ہو جاتے ہیں اور جو کچھ عالم کی نظر دیکھ نہ پائی ہو یا پہلے کبھی بیان نہ ہو سکا ہو وہ ظہور میں آ جاتا ہے۔ میری مولانا سے عقیدت اور محبت کا رشتہ جو ہے وہ ہے مگر ایسے لوگ جنھیں اُن سے کوئی پہچان نہ تھی، نہ وہ کچھ جانتے تھے اُن کی زبان سے مَیں نے وہ دریافت کیا کہ تعجب ہوتا ہے خدا کی قدرتوں پر۔ یہاں مَیں آپ کو ایک ایسے شخص کی زبانی لاہور اور اِس کے مضافات کے منظر نامے کے احوال ایک کہانی سنانا چاہوں گا جسے مَیں خود ملا ہوں۔

یہ شخص نہ صرف ہمارے گاؤں کا تھا بلکہ کہیں دُور سے رشتہ داری کا تانا بانا بھی اُن سے ملتا تھا۔ نام اِن صاحب کا محمد علی تھا اور ایک ۱۲۴ سال اُن نے عمر پائی تھی۔ پہلے فیروز پور کی تحصیل مکھسر میں ہوتا تھا، وہاں سے تقسیم کے وقت اوکاڑا چلا آیا اور میرے گاؤں میں ۲۰۱۰ میں وفات پائی۔ آپ یہ سمجھیں یہ آدمی ۱۸۸۶ میں پیدا ہوا تھا۔ مَیں اکثر گاؤں میں اِس کی صحبت میں بیٹھتا تھا اور طرح طرح کے قصے سنتا تھا۔ یہ حضرت یوں بنجارہ قسم کے آدمی تھے۔ اپنی نوعمری، جوانی، اور ادھیڑ بسری میں زمانہ پھرے تھے۔ نگری نگری چلے تھے، لاہور

اور دہلی تو اکثر جاتے تھے اور وہ یہ سفر گھوڑے پر کرتے تھے۔ ایک بار کسی تھیٹر والی عورت پر عاشق ہو لیے اور تھیٹر ہی کے پیچھے پیچھے ایک زمانہ تک ہندوستان گھوم گئے۔ اپنی باتوں میں نون مرچ لگا کر قصہ ایسے سناتے تھے کہ وقت لمحوں میں بیت جاتا اور پتا نہ چلتا تھا۔ ہمارے گھر کے بالکل ہمسائے میں بستے تھے۔ سانپ کاٹے کا علاج ایسا کرتے کہ آدمی دنوں میں درست ہو جائے۔ کھری چارپائی پر بیٹھتے۔ سفید کرتہ اور سفید چادر سر پر جماتے تھے، پگڑی ان کی بہت نفیس ہوتی تھی۔ میری صحبت اِن سے اکثر رہتی تھی اور سینکڑوں قصے اِن سے سُنے۔ مَیں اُن کے سامنے بیٹھ جاتا اور کوئی کہانی پچھلے زمانوں کی چھیڑ دیتا۔ بس پھر چل نکلتے اور ہمیں دو چار گھنٹے میں سیر کر دیتے۔ لاہور شہر انھوں نے ۱۹۰۴ میں پہلی بار دیکھا جب ۱۹ سال کے تھے بقول اُن کے اُنہوں نے لاہور کے بڑے تین جنازے اپنی آنکھوں سے دیکھے ہیں۔ پہلا جنازہ جو اُنہوں نے بیان کیا وہ مولوی محمد حسین آزاد کا تھا، دوسرا غازی علم دین کا تھا جس کا وہ اکثر ذکر کرتے تھے اور تیسرا جنازہ اقبال کا تھا، جسے اُنھوں نے دیکھا تھا مگر پڑھا نہیں تھا۔ محمد حسین آزاد کے جنازے کے بارے میں محمد علی صاحب بیان کرتے ہیں۔

میری عمر بیس سال ہو گی، میرے پاس ایک گھوڑی تھی، زندگی موت کی ساتھی۔ اُس وقت لاہور اور ہمارے گاؤں کے درمیان سوائے اللہ کے نام کے کچھ نہیں ہوتا تھا۔ اِدھر دوسری طرف منٹگمری تک بھی یوں سمجھ لو، دھوپ کے بادل تھے کہ سر کو چڑھتے تھے اور اُترتے تھے، اور گرد کے غبار تھے جو کسی راہی پاندھی کے سیوا کار ہوتے ہیں دوسری طرف یعنی ہمارے چڑھتے رُخ دہلی ایک بڑا شہر تھا۔ کئی بار لدھیانہ سے ہوتے ہوئے گڑگاؤں اور وہاں سے دہلی تک ماری اور گھر والوں کو کان وکان خبر نہ کی۔

ایک دفعہ کی بات ہے، خدا بہشتی کرے، نور بخش نے لاہور ہائی کورٹ کی تاریخ پر جانا تھا، کہنے لگا، بھائی مھندے خاں چل لاہور سے ہو آئیں، تیرا ساتھ رہے گا تو سفر تھکن سے نہ گزرے گا۔ پھر ایک اکیلا اور دو گیارہ ہوتے ہیں، چور ڈاکو جنگل بیلوں میں راہ روکتے ہیں

،دن دہاڑے راہی پاندھی کا منکا توڑ کر لوٹ لے جاتے ہیں۔ لاہور ساتھ چلے گا تو تجھے دہلی کے دروازے سے شیرا پہلوان کے پیڑے کھلاؤں گا اور کشمیری بازار سے کشمیر کی گرم لوئی بھی خرید دوں گا۔ آگے سردیاں آنے والی ہیں۔ اِدھر میں پہلے ہی سیر کو تیار رہتا تھا، میں نے کہا بھائی چلتا ہوں پر سانڈنی پکڑلو، گھوڑے پر نہیں جانا ہوتا۔ اُس نے یوں کیا، تاج دین سے دو روپے کرایہ پر سانڈنی پکڑلی اور ہم لاہور کی طرف جا نکلے۔ محرم کے دن تھے۔ ارادہ یہ تھا نو محرم کو شاہ عالمی میں اعظم خاں کی سرائے میں بستر کھولیں گے، دس محرم کو جلوس اور کربلا گاہے شاہ میں ماتم دیکھ کر گیارہ محرم کو تاج بھگتیں گے اور گیارہ کی سہ پہر لاہور سے نکل پڑیں گے۔ رات قصور کے قصبے میں رشید بابے کے پاس رات گزار کر اگلے دن گھر پہنچ جائیں گے۔

لو جی آٹھ محرم کو ہم دونوں سانڈنی پر بیٹھے اور دو منزلیں مارتے نو محرم کو لاہور پہنچ گئے۔ لاہور اُن دنوں بس یوں سمجھ لو، داتا کے دربار سے پرے پرے ہی ہوتا تھا۔ کچھ اِدھر اُدھر دُور پار گوروں کی کوٹھیاں اور اُن کے بابوؤں کے دفتر ہوتے تھے۔ یا پھر کھلی کھلی جگہیں چھوڑ کر نئے کچھ بازار بنا دیے تھے۔ مال روڈ اُس وقت شیر شاہ سُوری کی بیس لائن سمجھ لو، ایسی ہی ہوتی تھی اور کربلا گاہے شاہ سے اکبری دروازے تک، تمام علاقہ آم اور سنگترے کے باغوں سے مہکتا تھا۔ چیتر سے اُس کے سفید پھول ایسی باس مارتے تھے کہ جی اُس میں ڈوب ہی جاتا تھا۔ پرانے لاہور کے گرداگرد نہر چلتی تھی جس کا پانی باغوں کو سیراب کرتا ہوا داتا صاحب کے عقب میں سے ہو کر راوی کی طرف نکل جاتا تھا۔ اِدھر چوبرجی کے پاس تو کچھ بھی نہیں تھا۔ ایک گاؤں نواں کوٹ تھا یہاں اور بس باقی اللہ کا نام تھا۔ دھوپ اُن دنوں لاہور میں آگ سے زیادہ پڑتی تھی اور سردی بھی ایسی ہی کڑاکے کی ہوتی تھی مگر یہ زمانہ کچھ بہار ہی کا تھا۔ شیخ اعظم خاں کی سرائے پر ہم نے سامان کھول دیا۔ تھوڑی دیر آرام کیا پھر نکل گئے نثار حویلی کی طرف۔ شاہ عالمی سے اُن دنوں لاہور تک کوئی دو میل کی راہ بن جاتی تھی

اور سب قدموں کے بوتے پر تھی۔ ہم گوالمنڈی سے ہوتے ہوئے نثار حویلی پہنچ گئے۔ وہاں اُن دنوں ماتم بڑے زور کا ہوتا تھا۔ جونہی ہم موچی دروازے سے وہاں پہنچے رات کے آٹھ بج گئے تھے۔ لالٹینیں بازاروں میں اور چوکوں میں اتنی لٹکی تھیں کہ رات جو تھی وہ دن کا گلا پکڑے بیٹھی تھی۔ ہم دونوں نے چادروں کے کمر بند مارے، ڈنگوریاں کمر بندوں میں اڑسیں اور مجلس میں جا پہنچے۔ شیعہ ہم نہیں تھے، پر مولا حسین کو اُن دِنوں مسلمان سب شیعوں کی طرح مانتے تھے۔ آج کل جیسی بے ایمانی نہ تھی۔ رات آدھی تک دونوں نے مجلس سُنی۔ دہلی دروازے کے باہر اور ادھر موچی تک ماتم دیکھا۔ بھائی زنجیر ایسے چلتی تھی جیسے بارش کے اولے برستے ہیں۔ یہ لاہور والے قزلباشے بڑے دین والے جوشیلے تھے۔ لنگر بھی پورے محرم صفر آدھے شہر کو کھلاتے تھے۔ پہلے بھی کئی دفعہ مَیں یہاں کی مجلس اور ماتم دیکھنے فیروز پور سے آتا تھا۔ ماتم تو فیروز پور میں بھی ہوتا تھا پر وہاں کا وہ زور نہیں تھا جو یہاں تھا۔ شہر کی زیادہ آبادی میں ہندووں اور سکھوں کا سماج ہوتا تھا۔ سکھ وہاں کے بڑے زمیندار تھے اور شہر کا کاروبار ہندووں کے ہاتھ میں تھا۔ مسلمان اول تو بہت کم شہر میں بستے تھے، زیادہ آبادی دیہاتوں میں ماری پھرتی تھی۔ اگر شہر میں کچھ تھے بھی، تو وہ غریب پیشہ ہوتے تھے۔ گاڈی بان یا گدھے ہانکنے والے۔ مالدار لوگ وہاں بس یوں سمجھ لو ہندو ہی تھے۔ یہ بات اُن وقتوں میں بہت مشہور ہوتی تھی کہ حکومت انگریز بہادر کی، پیسہ ہندو بنیے کا اور لڑائی بھڑائی کا حصہ سکھ مسلمان کے ہاتھ آیا تھا۔ مگر میرا یہ ماننا ہے آج کے زمانوں کی نسبت وہی زمانہ زیادہ سُکھ سکون کا تھا۔ مار پھینٹ اگر ہوتی تھی تو انگریز بہادر کے خوف سے خون خرابے تک نہ جاتی تھی۔ خیر میاں اُسی وقت، جب رات کے بارہ کا وقت سر پہ تھا، کسی نے اونچی آواز میں کسی کے مرنے کی خبر دی۔ یہ پکار اُس نے تین دفعہ دی، پہلی بار تو مجھے سمجھ نہ آئی، کون مرگیا ہے، اور شاید کوئی ماتم کرتے مرگیا ہے مگر جب پکارنے والے نے دوسری بار اعلان کیا تو نام میں دماغ میں اٹک گیا، اُس کا نام محمد حسین تھا۔ اور وہ آزاد تھا، کہ یہ بھی اُس

کے ساتھ ساتھ کہتے تھے، اللہ جانے جیل سے آزاد ہوا تھا یا کہاں سے پر یہ نام بھی اُس کے
ساتھ لگاتے تھے۔ ہمیں اُس پر کوئی تعجب یا افسردگی نہیں تھی پر ہم نے دیکھا، کچھ لوگ بہت
افسوس کر رہے تھے۔ رات ایک رات کے تیسرے پہر ہم دونوں سرائے پر آ گئے اور اگلا سرا
دن جلوس میں پھرتے رہے اور کربلا گامے شاہ میں دوبارہ ماتم دیکھا، اللہ معافی دے
قیامت کا ماتم تھا۔ اِن دو دِنوں میں ہم نے ایک تو امام کے احترام میں نہ تو کوئی چیز خریدی،
نہ میٹھی شے کھائی۔ یوں بھی لنگر اتنا کھایا کہ کچھ حرص باقی کھانے کی نہ رہی۔ گیارہ محرم کو خبر ہو
ئی کہ سرکار کے تمام دفتر بند ہیں۔ ہائی کورٹ کا دفتر بھی بند پڑا تھا۔ ہم اپنے وکیل چندن لال
سے ملے۔ اُس کا دفتر انار کلی کے سامنے ایک چوبارے میں ہوتا تھا، اُس سے پوچھا کہ میاں
یہ کورٹ کیوں بند ہوا، ہم اتنا سیاپا کر کے فیروز پور سے آئے ہیں۔ کہنے لگا، نور بخش میاں
یہاں ایک بڑے آدمی کا ماتم ہو گیا ہے۔ شمس العلما محمد حسین آزاد کا۔ اِس وجہ سے سرکار نے
آج کے دن چھٹی کر دی۔ آج اُس کا جنازہ ہے۔ شاہ محمد غوث کے مزار کے پاس۔ اب یوں
کرو آج کا دن یہیں گزار لو۔ کل تمھیں نئی تاریخ لے دوں گا، اب تو اگلی کوئی تاریخ ہی پڑے
گی۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے یوں ہی سہی۔ نور بخشے نے مجھے کہا، میاں ممندے چل پھر کشمیری
محلے دہلی گیٹ کے اندر سے تیری لوئی تو لے دوں جس کا وعدہ کیا تھا۔ تب ہم نے اپنی
سانڈنی اُسی کی طرف پھیر دی۔ اب جو شاہ محمد غوث کی درگاہ کے قریب پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں
زمانے بھر کی خلقت کا سیلاب وہاں جمع ہے۔ پاؤں دھرنے کو جگہ نہیں ملتی۔ لوگوں سے پوچھا
تو خبر ہوئی کہ اُسی آزاد کا جنازہ جاتا ہے۔ ہم نے یہ حالت دیکھی تو اپنی سانڈنی گوالمنڈی
کے ایک کنوے کے پاس پیپل کے سائے میں باندھ دی اور پیدل ہو لیے۔ مَیں نے نور
بخش سے کہا میاں نورے، شاید اللہ کو یہی منظور تھا، یہ کوئی بھلا آدمی ہے، چل ہم بھی جنازہ
پڑھ لیں۔ تو میاں اُسی جنازے میں ہم بھی چلے آئے اور کھڑے ہو گئے۔ تم یوں سمجھ لو موچی
دروازے سے دہلی دروازے تک سارا علاقہ بھر گیا تھا۔ یہ جگہ اُن زمانوں میں کھلے باغوں

اور میدانوں کی سی تھی ۔ نہ کوئی یہاں تانگہ تھا، نہ بس کا بکھیڑا تھا۔ نہر کے ساتھ ساتھ قلفی والوں اور فالودے والوں کی ریڑھیاں ضرور لگتی تھیں مگر آج تو وہ بھی نہیں تھیں ۔ باغ کے کنارے اور نہر کے کنارے کہیں بیل گاڑیاں، گھوڑے اور سانڈنیاں بندھی کھڑی تھیں۔ مَیں نے پہلی بار دیکھا کسی مسلمان کے جنازے میں ہندو، سکھ، یہاں تک کہ گورے بھی شریک تھے۔ جنازہ شیعہ مولوی نے پڑھایا، وہ کچھ ایسا تھا کہ ہمیں نہ آتا تھا، ہمیں تو سُنی جنازہ بھی نہ آتا تھا۔ لوگوں کو جنازہ آتا ہو یا نہ آتا ہو، شریک تو ہوے، جنازہ تو اُن وقتوں میں کسی کو بھی نہ آتا تھا۔ ہجوم بہت تھا، ہم مرنے والے کا منہ نہ دیکھ سکے تھے۔ پل بھر میں جنازہ نمٹ گیا ۔تب خلقت تو جنازے کے ساتھ کسی طرف نکل گئی، اِدھر ہم کشمیری بازار کو مُڑ گئے۔

لاہور کے بازاروں کا حال اُن وقتوں میں بہت دل کو بھانے والا ہوتا تھا۔ ہجوم اور بھیڑ کا تنکا نہ تھا۔ گاڈی بان اپنے گڈے شہر کے دروازوں سے باہر رکھتے تھے۔ چارہ بیچنے والوں نے سبز چارے کی ٹالیں فصیل کے ساتھ ساتھ لگائی ہوتیں۔ سواریوں کے جانور آن کرُکتے تو اِن ٹالوں سے چارہ مول لے کر اُن کے آگے ڈال دیتے، جانور چارہ کھاتے اور مسافر شہر میں داخل ہو جاتے۔ آج تو جس کا جی چاہتا ہے بازار کے رُخ مکان کا در کھول کر اُسے دکان بنا رکھتا ہے۔ اُس وقت اِسے بڑی عیب اور ذلت کی بات سمجھا جاتا تھا۔ دکان صرف بازار ہی میں ہوتی تھی اور مکان سے نہیں کھلتی تھی۔ دہلی دروازے سے اندر ہو کر ہم سیدھے کشمیری بازار میں نکلے۔ دہلی دروازے میں داخل ہوتے ہی سامنے بڑا چوک ہوتا تھا۔ وہاں ایک کنواں بھی تھا۔ اُس کا پانی ایسا میٹھا اور ٹھنڈا ہوتا کہ اللہ اللہ۔ مسجد وزیر خاں کے پہلو سے گزر کر ہم سیدھے کشمیری بازار میں پہنچے۔ ایک بنیے کی دکان سے کشمیری لوئی خریدی۔ پوری پانچ روپے میں پڑی۔ اُس کے بعد سنہری مسجد کے سامنے سے ہو کر دوبارہ موچی دروازے کی طرف چل دیے اور تھوڑی دیر میں واپس ایک باغ میں نکل آئے۔ یہ وہی باغ تھا جو لاہور کے چار طرف بھرا ہوا تھا۔ سارا جہان سڑکوں سے غائب تھا۔ اِدھر سے

ہماری منزل حضرت داتا گنج بخش کی خانقاہ کی طرف تھی۔ یہ بزرگ اُدھر کہیں ولایت سے آ
کر جم گئے تھے اور کربلا گاے شاہ کے پہلو میں اِن کا مزار تھا۔ تب تو یہ جگہ بہت ویران تھی۔
ایک عام سی قبر تھی اور ارد گرد کچے پکے برآمدے تھی۔ قبر پر ایک گنبد تھا اور اچھا بنایا ہوا تھا۔ ہم
تھوڑی دیر کے لیے وہاں رُکے قبر والے کو فاتحہ سنائی اور باہر نکلل آئے۔ یہاں بھنگ
گھوٹنے والے اتنے تھے کہ دل اوبنے لگا۔ خانقاہ کو اللہ جانے کیا بنا دیا تھا۔ پاس ہی ایک مدرسہ
تھا اور تھوڑی بہت مٹھائی کی دوکانیں تھیں۔ ہندو لوگ یہاں مٹھائی بناتے اور بیچتے تھے۔
عقیدت مندت یہ مٹھائی خرید کر داتا صاحب کے مجاوروں یا خانقاہ پر آنے والوں میں تقسیم کر
دیتے تھے۔ اگلی منزل ہماری کربلا گاے شاہ تھی۔ یہاں پہنچے تو ایک مجلس ہو رہی تھی۔ کوئی
پانچ چھ سو لوگ اُس میں سُننے کو جمع تھے۔ ہم نے تمام زیارتوں کو سلام کیا۔ ایک نئی قبر پہلو میں
بنی تھی، یہ قبر شاید وہی موچی دروازے میں فوت ہونے والے مولوی صاحب آزاد کی تھی۔
اُس پر بھی فاتحہ پڑھی اور چلے آئے۔ اُس کے بعد میرا لاہور میں جانا ۵ سال بعد ہوا۔

اُلٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوا نے کام کیا
دیکھا اِس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا

موت اور تدفین

مولانا کا معمول اُن زمانوں میں بھی کہ جب اُن کی عمر اَسی برس ہونے کو آئی تھی، یہ تھا ، صبح گھر سے نکلتے، کبھی دہلی دروازے سے ہوتے ہوئے شاہ محمد غوث، جہاں اُن کی لائبریری ہوا کرتی تھی، کو سلام کر کے اُن باغوں کی سیر پہ چلے جاتے جو لاہور کی فصیل کے ساتھ ساتھ تھے۔ جہاں آج کل سرکلر روڈ ہے، یہ نہر ہوا کرتی تھی جو راوی سے نکال کر لاہور کے گرد پھیری گئی تھی۔ وہ باغوں میں چلتے ہوئے پرندوں سے باتیں کرتے جاتے، شاخوں کو ٹھہر ٹھہر دیکھتے جاتے، کبھی نہر کنارے بیٹھ جاتے اور پانی کی طرف دیکھ دیکھ اُستاد مرحوم کے شعر گنگناتے، انسان نظر آتا تو اُس سے آنکھ چرا کر نکل جاتے، کوئی آگے ہو کر سلام کرتا تو اُسے کھڑے ہو کر دعائیں دیے جاتے۔ اِنھی باغوں کی سیر کرتے، آنکھوں میں نیل بھرتے بھاٹی دروازے تک چلے آتے، یہاں کربلا گامے شاہ اُن کے بہت قریب تھا، اپنا رُخ سیدھا اُسی طرف پھیر لیتے اور گامے شاہ آن کر ایک ایک زیارت کے سامنے کھڑے ہو کر زیارتیں پڑھتے۔ کربلا گامے شاہ میں اُن کا جانا بہت ہوتا تھا۔ یہاں کے بزرگ سے اُنھیں خاص رغبت تھی۔ گھنٹوں اُن کی صحبت میں مودت کے گُل پھول اُگاتے، سلام اور منقبت کے ہدیے سناتے۔ گامے شاہ کی حاضری سے فارغ ہوتے تو نواں کوٹ کی طرف کوچ کر جاتے اور سید دھیان شاہ کی بارگاہ میں حاضر ہوتے۔ یہ سید دھیان شاہ دراصل سید بڈھن

شاہ کے مزار کے مجاور تھے اور بہت کچھ مجذوب تھے۔ آزاد اپنے آپ کو سید دھیان شاہ کے حکم میں سمجھتے تھے، اُن کی باتوں کو بے چون وچرا تسلیم کرتے تھے۔ سید بڈھن شاہ کا زمانہ گرو نانک کا تھا اور دھیان شاہ کا زمانہ مولانا آزاد کا تھا۔ مجذوب وہ ۹۶ برس کا تھا۔ دنیائے دوں سے مولانا آزاد کا سلسلہ قریباً نکل گیا تھا، وہ ایک ایسے عالم میں تھے جہاں سود و زیاں کی منزلیں ختم ہو جاتی ہیں اور حوادث زمانہ کے گلے جاتے رہتے ہیں۔ زندگی اور موت کا امتیاز نہیں رہتا ہے اور فرداؤ دی کا تفرقہ یک بار مٹ جاتا ہے۔ عامۃ الناس کے لیے مولانا اِن دِنوں کمل استغراق میں تھے جو بالآخر حکمِ الٰہی سے انجام کو یوں پہنچا کہ وہ وہاں سے سیدھے مولا علی کی بارگاہ میں پہنچے۔

قصہ اُن کے وصال کا کچھ ایسے ہے کہ بواسیر کی تکلیف اُنھیں گاہے گاہے رہتی تھی ، جسے وہ تربوز اور دہی کھا کر دُور کیے رکھتے تھے اور یہ تربوز اور دہی کا نسخہ بھی بقول اُن کے مولا علی کا دیا ہوا تھا۔ جسے اُنھوں نے ایک وقت میں تب مولوی ممتاز علی کو بتایا تھا جب ابھی وہ کالج میں پڑھاتے تھے۔ اس خواب کی تفصیل پہلے گزر چکی ہے۔ اب اُن کو بواسیر کے مرض نے پکڑا یعنی حکمِ قضا آنکلا۔ مرنے سے چھ ماہ قبل بواسیر کی تکلیف بہت بڑھ گئی تھی اور مسلسل خون بہے جاتا تھا۔ آخر بہت دوائیں لیں اور بواسیر رفع ہوا لیکن اُس کے بعد مولانا کی کمزوری طاقت نہ لائی۔ آغا محمد سلمان باقر لکھتے ہیں:

> ”بواسیر کا مرض دور ہونے کے بعد کمزوری بڑھتی گئی اور ایک وقت وہ آیا کہ انھوں نے کھانا پینا بالکل ترک کر دیا۔ محض چائے پیا کرتے تھے۔ ایک مہینہ اس حال میں گزرا۔ جسم خشک ہو گیا۔ پیٹ کمر سے لگ گیا۔ یہاں تک کہ یکم محرم سے چائے پینی بھی چھوڑ دی۔ آخر 22 جنوری 1910ء کو عاشورے کی شب تھی کہ 82 سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

مولانا آزاد چلے گئے، اُن کے جانے کی خبر ہواؤں کی سواری کو نکلی اور کوچہ عالم میں پھیل گئی، پتّے پتّے کو خبر ہوئی کہ ایک بندہ آزاد قیدِ صیاد سے رہا ہوا ہے اور فطرت کون و مکان میں نفوذ ہوا ہے۔ یہ نو محرم کا روز تھا، حسین علیہ السلام کی عزاداری کے دن تھے۔ تمام مسلمانوں کی سوگواری کے دن تھے۔ جس مبارک حویلی میں آزاد سلام پڑھا کرتے تھے، آج اُسی کے قُرب میں یہ عزادار اٹھ گیا تھا۔ مولانا کے عقیدت مند چہار شہر سے جمع ہونے لگے۔ آگے عاشور کی صبح تھی، طے ہوا کہ مولانا کی تدفین کو موخر کیا جائے، پہلے عاشور کا سوگ گزار لیا جائے تب تدفین کے قرض کو ادا کیا جائے گا۔ اِسی موقع پر یہ بھی ہوا کہ دو دن تک مولانا کی موت کی خبر کسی طرف سے نہ رہ گئی۔ لاہور سے باہر کے دیوانے بھی پہنچ گئے۔ جنازے کو کندھا دینے کے واسطے دُور دُور سے خلقت آ بسی۔ یہاں تک کہ عاشور کا روز گزر گیا۔ اگلے دن مولانا کا جنازہ اُٹھا۔ درگاہ شاہ محمد غوث میں جنازہ ہوا۔ دہلی دروازے سے لے کر بھاٹی تک تمام عالم جنازے میں اُمڈ آیا۔ کمشنر شہر سے اُمرائے شہر نے درخواست کی کہ مولانا کو کربلا گامے شاہ میں دفن کرنے کی اجازت دیں۔ اُنھوں نے اجازت دی۔ آغا سلمان باقر اُن کی تدفین کے متعلق لکھتے ہیں۔

> اس عرصے میں دفن کرنے کے مقام کا بھی فیصلہ ہوا۔ چنانچہ کمشنر پنجاب سے عمائدین نے درخواست کی اور مولانا کو گامے شاہ کے قریب جسے کربلا بھی کہتے ہیں، دفن کرنے کی اجازت مل گئی۔ یہ مقام مزار داتا گنج بخش سے بالکل قریب ہے کہ ان بزرگ سے مولانا کو کمال ارادت تھی۔

تیسرے دن جنازہ اٹھا۔ ہزاروں کی تعداد میں مخلوق ساتھ تھی۔ اس دن لاہور کے تمام سرکاری دفاتر اور سرکاری وغیرہ سرکاری مدارس اور کالج بند ہو گئے اور سب لوگ جنازے میں شریک ہوئے۔

"مولانا کے اکلوتے بیٹے آغا محمد ابراہیم صاحب جو اس وقت منصف تھے

،انہوں نے سوئم کی فاتحہ لے لئے تمام شہر کو مدعو کیا اور تمام امراء اور غربائے شہر کو کھانا کھلایا۔اس کے بعد کئی ہزار صرف کر کے ان کا مقبرہ بنایا۔اس پر سونے کا کلس لگوایا اور مقبرہ کا اندرونی حصہ سنگ مرمر سے بنوایا جو ابھی تک موجود ہے"

شہرتِ عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملکِ فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں، جنہوں نے اپنے ملک کے نام پر میدانِ جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں، جنہیں اُسی ہاتف غیبی کا خطاب زیبا ہے، جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزمِ تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے۔ جس سے ملک فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے، ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں، دوسری وہ عالم یادگار کی بقا، جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا ثوابِ آخرت کے لیے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے، لیکن میں اس دربار میں انہی لوگوں کو لاؤں گا جنہوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت اور نام وری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال دیتا ہوں، مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں ان کی حق تلفی نہ ہو جائے، کیوں کہ جن بیچاروں نے ساری جان فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا، ان کے حصے میں

کسی طرح کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چناں چہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں کہ انہوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی، اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری۔ نامورانِ موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انہوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چوں کہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں اس لیے عرض کرتا ہوں۔

خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدانِ وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں۔ جس کی وسعت اور دل فزائی میدانِ خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدانِ مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انہیں محاسب فکر شمار کرسکتا ہے نہ قلم تحریر فہرست تیار کرسکتا ہے اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کررہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو، ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستے کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں، مگر بڑی ناانصافی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کر لے تو ان بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گزریں، وہی جانیں۔ یکایک قلعہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی، بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی، جس سے انسان مرتبہ انسانیت سے بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے میں انبوہ کثیر میں تھوڑے ہی اشخاص تھے، جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا اور وہ تعجب فوراً ہی جاتا رہا، یعنی

دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوب صورت عورتیں ہیں، اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں، مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پری زاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں غفلت، کوئی عیاشی ہے، کوئی خود پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انھی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیے تھے، رنگ برنگ کے پھول کھلے تھے، گوناگوں میوے جھوم رہے تھے، طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں، اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے لڑا رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے اُلجھاوے بلندیٔ کوہ کے اُدھر ہی اُدھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں، وہ اگرچہ اقوامِ مختلف اور عہد ہائے متفرقہ، عمرہائے متفاوت رکھتے ہیں مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحب ہمت، عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندیٔ کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے، اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آیند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندیٔ کوہ پر چڑھ جائیں اور جس طرح ہو سکے پاس جا کر اس نغمۂ آسمانی سے قوتِ روحانی حاصل کریں۔ چناں چہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی، ایک ہاتھ میں نشان تھا، کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزا تھے، کسی کی بغل میں ایک کمپاس تھی، کوئی پنسلیں لیے تھا، کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا۔

بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا، بعضوں کے تن پر لباسِ جنگی آراستہ تھا۔ غرض کہ علم ریاضی اور جرثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتہ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقے فرقے میں تقسیم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑ لی۔ چناں چہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لیے۔ وہ تھوڑی ہی دور چڑھے تھے کہ ان کا رستہ ختم ہو گیا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دست کاری کی راہ لی تھی کہ روپے کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے تھا، جنہوں نے دلاوروں اور جاں بازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پا لیے، مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے، مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھے تھے۔ میرے فرشتہ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی رستے ہیں جہاں عقلِ صادق اور عزمِ کامل کام دیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے، مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے، اتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو روزگار سے ترقیاں حاصل کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعتہً گر پڑتے ہیں اور آیندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اتنے عرصے میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں، اوپر آ کر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چناں چہ وہاں آ کر تمام صاحب ہمت دو گروہوں میں تقسیم

ہو گئے۔ ان دونوں شاہراہوں میں ذرا ذرا آگے بڑھ کر ایک بھوت ڈراؤنی صورت، ہیبت ناک مورت، کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک ہاتھ میں ایک درخت خاردار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاکت تھا اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے، جو اولوالعزموں کو راہِ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چناں چہ جو سامنے آتا تھا، ٹہنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت کے بھاگ بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ "ہے ہے موت! ہے ہے موت" دوسرے رستے پر جو بھوت تھا اس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا، لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اُس کی زبان سے نکلتے تھے اس لیے اس کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اُڑائے جاتا تھا اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے بے دل ہو کر رہ گئے اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور قدم آگے نہ اُٹھتا تھا۔ اتنے میں اس شہنائی کی آواز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اُٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اُڑتے گئے۔ چناں چہ بہت سے جان باز، جو شمشیریں علم کیے ہوئے تھے، اس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے، گویا حریف سے میدانِ جنگ مانگتے ہیں، یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا، یہ اس دہانے سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے وہ اس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا۔ مگر اس آواز کے ذوق شوق نے انہیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے، کیچڑ میں نہاتے، مر پچ کر یہ بھی اس کی حد سے نکل گئے۔ چناں چہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں، وہ بھی ان

بھوتوں ہی تک تھیں، آگے دیکھا تو ان کی دسترس سے باہر ہیں اور رستہ بھی صاف وہموار بل کہ ایسا خوش نما ہے کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدانِ روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی، جس سے روح اور زندگانی کو قوتِ دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان، جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا، اس کا رنگ کبھی نورِ سحر تھا اور کبھی شامِ شفق، جس سے قوسِ قزح کے رنگ میں کبھی شہرتِ عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوانِ عالی شان دکھائی دیا کہ اس کے چار طرف پھاٹک تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی بجا رہی ہے جس کے میٹھے میٹھے سروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین وشاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم، خیر مقدم، خوش آمدید، صفا آورید" اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چناں چہ مورخوں کا گروہ ایک دروازے پر استادہ ہوا تا کہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکا یک وہ شہنائی جس سے کبھی شوق انگیز، جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سر نکلتے تھے، اب اس سے ظفریابی اور مبارک بادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا، معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا راجا مہاراجا ہے۔ چاند کی روشنی کے گرد ہالہ کیے ہے، سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کی حیوانوں کو جاں

نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایے میں لیے آتے ہیں۔ فرقے فرقے کے علما اور مورخ اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور سے لینے کو بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا، مگر ایک شخص کہن سال، رنگت کا کالا، ایک پوتھی بغل میں لیے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور بآواز بلند چلایا کہ ''آنکھوں والو! کچھ خبر ہے؟ دیکھو! دیکھو! ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو اور زنگار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ'' یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزاری۔ اس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا تو معلوم ہوا اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا۔ اس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوادار آیا، وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اُڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں اور یہ والمیک ہے جس نے ''رامائن'' نذر دی۔

سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو بتیس پریاں اُڑائے لیے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور رنجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقے فرقے کے علما اور مورخ لینے کو نکلے، مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ رنجہ تو مہارنجہ بکرماجیت تھے اور تخت ''سنگھاسن بتیسی'' پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے، نہ آپ کا منہ ہٹے گا نہ سکہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انہیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجا کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل وقال ہوئی، کیوں کہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزارا نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں۔ چناں چہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجا نے مسند پر قدم رکھا، ایک پنڈت آیا، دونوں ہاتھ اُٹھا کر اشیر باد کہی اور

بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا، جس میں ہیرے اور پنے کے نو (۹) دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ راجہ بھوج تھے اور بتیس پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب ''سنگھاسن بتیسی'' تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی اور جس نے تاج سر پر رکھا اور وہ کالی داس شاعر تھا، جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھا، اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا، دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فرش، جھاڑ فانوس سے بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ ایک جوان بیل پیکر، ہاتھ میں گرز گاؤ سر، نشہ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہانِ کیانی اور پہلوانانِ ایرانی موجود ہیں کہ درفش کاویانی کے سایہ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حب قوم اور حب وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا اور سر پر کلہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مورخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے بہ چشم تعظیم دیکھا۔ ان ہی میں سے ایک پیر مرد، دیرینہ سال جس کے چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے۔ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا اور ایک کرسی پر بٹھایا، جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور شور سے پڑھے۔ نہیں، بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی، جو قیامت تک باقی رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اُٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گل فردوس کا طرہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ ''الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ و شاداب رہے'' تمام اہل محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی، شیر سیستانی رستم پہلوان ہے اور کہن سال مایوس فردوسی ہے جو ''شاہنامہ'' لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا، جس کا حسن شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا، سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہو گئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مورخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے، مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چناں چہ ایک شخص، جس کی وضع اور لباس سب سے علاحدہ تھا، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مورخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھایا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آ جاؤ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمھیں کوئی نہ دیکھ سکے۔ یہ سکندر یونانی ہے، جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اس پر درفش کاویانی جھومتا تھا۔ مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو بچائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا، اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی، وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی ''انھیں لاؤ!'' جو شخص داخل ہوا، وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا جس وقت وہ آیا، سکندر خود اٹھا۔ اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں ''خمسہ'' کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا ''اب یہ کبھی نہ کملائیں گے۔''

بعد اس کے جو شخص آیا، اگر چہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا جو لوگ اب تک آ چکے تھے، ان سب سے زیادہ عالی رُتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چناں چہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے اُستاد، یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا، مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے اور یہ کہہ کر اول سکندر کو آئینہ دکھایا اور پھر نظامی (گنجوی) کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کے ذیل میں آیا۔ سب جبہ وعمامہ اور طبل ودمامہ رکھتے تھے، مگر باہر رہ گئے، کیوں کہ ہر چند اُن کے جبے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے۔ مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چناں چہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علما وفضلا کا ہو لیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اُتارے اُن کے ساتھ تھے۔ بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیر باد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور تاج دار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندستان کے بہت سے گراں بہا زیور اس کے پاس تھے، مگر چوں کہ ناواقف تھا، اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھا، کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آب داری سے پانی ٹپکاتے تھے، مگر جہاں قدم رکھتا تھا، بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اُٹھتے تھے، وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے، مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم دیتا تھا۔ چناں چہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور

شکر گزاری سے ہاتھ اس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا۔ وہ ایاز تھا۔ اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا۔ مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعرا تو الگ ہو گئے، مگر تمام علما و فضلا میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا، ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی، اس پر آ کر بیٹھ گیا، وہ بو علی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے۔ مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کے بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گل زار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصور ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو، مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیا کے مصور ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں۔ البتہ انتخاب ہو سکتا ہے۔ یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چناں چہ انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی وغیرہ، چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے، باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا، اس میں سے آب حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں، مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں بھی لہراتی نظر آتی تھیں۔ اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لیے تلوار دی ہے، مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بدنہاد ہمارے خونِ عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔

چناں چہ یہ عذر ان کا قبول ہوا۔ یہ انوری تھا جو باوجود گل افشانی فصاحت کے بعض موقعے پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملے میں اس کے استاد کی طرف سے دعوے پیش ہوئے۔ چوں کہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی،

اس لیے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔ اسی عرصے میں چنگیز خاں آیا۔ اس کے لیے گو علما اور شعرا میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اُسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مورخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی، جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اُس نے فوراً شمشیر جوہر دار سند کے طور پر پیش کی، جس پر خونیں حرفوں سے رقم تھا: "سلطنت میں میراث نہیں چلتی" علما نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہے، بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعرا نے کہا جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو، اُسے اس دربار میں نہ آنے دیں۔ اس بات پر اس نے بھی تامل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون نے حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا، تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اُٹھاتا۔ اتنے میں چند مورخ آگے بڑھے، انہوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورہ چنگیز خاں یعنی ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو، مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا، اس کا نام ہلاکو خاں تھا۔ اس کے لیے چند علما نے بھی مورخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا، مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا، جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی، لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب، دوسری طرف اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں، بغل میں فلسفے اور حکمت کے چند اجزا تھے، ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چناں چہ انہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اُسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو بوعلی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آب دار موتی ٹانکے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مورخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا، کیوں کہ وہ مورخ تھا، رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اُٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض خدا نے جو تمہیں قلم تحریر دیا ہے، اسے اظہار واقفیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور بدزبانی میں؟ تمام مورخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ اس پر امیر تیمور نے "ابن عرب شاہ کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چناں چہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ اک بزرگ، آزاد وضع، قطع تعلق کا لباس بر میں، خاکساری کا عمامہ سر پر، آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علما و صلحا مورخ و شاعر سر جھکائے اُن کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آ کر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا "معذور رکھو، میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے" اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے، اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے، ایک طلسمات کا شیشہ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں کسی کو دودھ، کسی کو شربت، کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انہیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشہ مینائی ان کا دیوان تھا، جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا، بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے، بیچ میں ان کے ایک پیر مرد، نورانی صورت، جن کی سفید ڈاڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اگر چہ مختلف فرقوں کے

لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے مگر انہیں دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیوں کہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور ان کی گلستان اور بوستان کو نہ جانتا تھا۔ انھوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بے چارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی، لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر ان سے واقف تھے اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے، وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے:

"دنیا دیکھنے کے لیے ہے، برتنے کے لیے نہیں۔"

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چناں چہ ایک اولوالعزم شخص آیا۔ جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علما کی نہیں تو مورخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مورخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اس نے باوجود اس کے ایک کرسی، جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا، گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکا لیا، مگر پھر تاج شاہی پر انداز کج کلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے۔ اس نے ڈاڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن اور ان کی اولاد میرے رستے پر قدم بہ قدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر ایرانی، تورانی اور ہندستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا، تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور رضامندی عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے، ہندو اسے ہندو جانتے تھے، آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا، نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے، مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا، اور وہ فتح یاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ

ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا، نیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجا معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اُس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اُس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اُسی کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے، مگر چوں کہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہ جہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مورخ، اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لیے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضا مندیٔ عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا، مگر ایک جوان آنکھوں سے اندھا، چند بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہر یار، شاہ جہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اُس وقت وزیر اُس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا، بدنیتی اور خودغرضی سے نہیں کیا، بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہرحال اُسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

ایک تاج دار آیا کہ جبہ اور عمامے سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا، دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی اس میں غرق تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتاتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انھیں خانقاہ میں لے جانا چاہیے، اس دربار میں ان کا کچھ کام نہیں، لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا۔ وہ دونوں ہاتھ اُٹھا

کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے ارا کین دربار! ہمارے ظلِ سبحانی نے اس کم بخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا، اس پر بھی تمہارے اعتراض اس دربار میں اسے جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اس نے اس مسخرہ پن سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انہیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اس کے ساتھ ہی ایک بینڈا جوان، دکھنی وضع، جنگ کے ہتھیار لگائے، راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے بلکہ عالم گیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب! ہمت کو جگہ دو یا نہ دو، وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے، یہ شیواجی تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے بجانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندستانی تھی۔ مصنفوں اور مورخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرہ نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آئے تھے کیوں کہ ایک ولایتی ولا وران کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندستان کا تاج شاہی نصب تھا، اور اسپ بخارائی زیر ران تھا۔ وہ ہندستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو، ان کا یہاں کچھ کام نہیں۔ چناں چہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا، جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندستان سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندستانیوں کا پیدا ہوا۔ ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا، کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ انہیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چناں چہ چند اشخاص

انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا، اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے، لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے، مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے پھر بھی مشتاق زمین پر گرنے نہ دیتے تھے، کوئی نہ کوئی اُٹھا ہی لیتا تھا، وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بدماغی اور بے پروائی سے آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحر بیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشا اللہ خاں قدم قدم پر نیا بہروپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم، ذی وقار متقی و پرہیز گار، دم میں ڈاڑھی چٹ، بھنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا، مگر جب وہ میٹھی زبان سے ایک تان اُڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اُسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم بخت تھے، مگر جب کچھ کہتے تھے، جرات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد، دیرینہ سال، محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے، کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے، مگر ایک لکھنؤ کے بانکے پیچھے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریباں ہو جاتے، لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا۔ یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی چار درویش کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور فسانہ عجائب والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انھوں نے اندر آ کر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا، مگر سب واہ وا اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس، اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے، مگر پھر وہیں کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بٹھا دو گے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے، اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمے پر قیل وقال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے اُلٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادیِ ہمدم یعنی فرشتہ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مردوں سے زندوں میں تو آیا۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد

مصادر و منابع

بنیادی ماخذ:

۱- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۹۱۰)، دیباچہ کلیات ابراہیم ذوق، آزاد بک ڈپو لاہور

۲- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۹۵۵)، نظم آزاد، آزاد بک ڈپو لاہور

۳- آزاد، محمد حسین، مولانا (۲۰۰۹)، آب حیات، علم و عرفان لاہور

۴- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۹۸۷)، مکتوبات آزاد، مرتب آغا طاہر، اردو اکادمی دہلی۔

۵- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۹۸۸)، مکتوبات آزاد (مرتب فاضل لکھنوی)، مجلس ترقی ادب لاہور

۶- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۸۸۳)، مکتوبات آزاد جلد دوئم، اردو اکادمی دہلی، مکتوبات محرر

۷- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۹۱۸)، مولانا، قند پارسی، کوچہ چیلاں دہلی

۸- آزاد، محمد حسین، مولانا (۱۹۵۵)، نظم آزاد، مثنوی حب وطن، آزاد بک ڈپو لاہور

ثانوی ماخذ:

۹- آغا طاہر (۱۹۲۳)، سفر ایران محمد حسین آزاد دہلی اردو اکادمی

۱۰- آغا محمد باقر، ادبی دنیا، خاص نمبر، دورہ پنجم، شمارہ ہشتم، دہلی

۱۱- ابو علی امام مالک، (۲۵۵) المسند، ۱۳، ۲۰۱، رقم ۷۳۳۱، ۲۷۱، ۷

۱۲- أزرق (۱۷۳۱)، اخبار مکہ وما جاء فیہا من الآثار،

۱۳- ابو نعیم (۱۲۳۸)، حلیۃ الاولاد طبقات الصفا ۳،

۱۴- انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا ۲۷ ستمبر 2018

۱۵- انور سدید، ڈاکٹر (۲۰۱۴)، اردو ادب کی مختصر تاریخ، عالمی میڈیا پرائیویٹ لمٹڈ، دہلی

۳۷- محمد اشرف، آغا، سفر ایران، اردو اکادمی دہلی

۳۸- موپساں چوائس دی کاونٹس، کیمبرج، ۱۹۴۵

۳۹- نورالحسن نقوی (۱۹۹۷)، پروفیسر، تاریخ ادب اردو، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ۔

۴۰- اے ٹیل آف ٹورائیٹرز (۱۹۸۰)

۴۱- آزاد، مولانا محمد حسین، نیرنگ خیال

۱۶- اسلم فرخی، ڈاکٹر (۱۹۶۵) محمد حسین آزاد، حصہ اول، انجمن ترقی اردو پاکستان

۱۷- بلوغ الارب، جلد چہارم اردو، اردو سائنس بورڈ لاہور

۱۸- نکس راگ انسائیکلوپیڈیا (۲۰۰۳)، سیکنڈ ایڈیشن

۱۹- جمیل جالبی ڈاکٹر، تاریخ ادب اردو، جلد چہارم ۲۰۱۵ مجلس ترقی اب لاہور

۲۰- جہاں بانو نقوی (۱۹۳۹) محمد حسین آزاد، حیدر آباد دکن، یونیورسٹی، مقالہ ایم اے

۲۱- دی کریٹیکل ہیری ٹیج (1995)، کلائیڈ ہارڈر

۲۲- دی لبریشن آف ٹالسٹائی (۱۹۱۰)، ماسکو

۲۳- رام بابو سکسینہ (۱۹۸۸)، تاریخ ادب اردو، دہلی اردو اکادمی

۲۴- راشد الخیری، علامہ (۲۰۱۵)، دہلی کی آخری بہار، مرتب سید ضمیر حسن دہلوی، اردو اکادمی دہلی

۲۵- سلمان باقر آغا محمد حسین آزاد کا عالم وارفتگی، مکتبہ عالیہ لاہور، ۱۹۸۷

۲۶- سلمان باقر (اکتوبر ۲۰۱۰)، آغا، سینٹرل ایشیا کا سیاسی سفر، صحیفہ، کتاب مولانا محمد حسین آزاد
مجلس ترقی ادب لاہور

۲۷- طبران (۱۸۷۰)، المعجم الکبیر جلد دوم، جامعہ الازہر، مصر

۲۸- عبد الحمید یزدانی (۲۰۱۰)، مولانا محمد حسین آزاد گورنمنٹ کالج میں، راوی آزاد نمبر، جی سی
یونیورسٹی لاہور

۲۹- عبد الحمید یزدانی (۹۸۳)، محمد حسین آزاد نمبر، راوی، گورنمنٹ کالج لاہور

۳۰- عبد المومن، فاروقی (۲۰۰۳)، مقدمہ کلیاتِ نظیر، کتابی دنیا دہلی

۳۱- لطف اللہ، گوہر (۲۰۱۰)، راوی آزاد نمبر، منتخب مضامین، جی سی یونیورسٹی لاہور

۳۲- محمد اکرام، چغتائی (۲۰۱۱) محمد حسین آزاد، (تنقید و تحقیق کا دبستانِ لاہور) اورینٹل کالج میگزین

۳۳- محمد اکرام، چغتائی (۲۰۱۰) محمد حسین آزاد اور خانوادہ آزاد، پاکستان رائٹرز کوآپریٹو سوسائٹی لاہور

۳۴- محمد باقر، آغا (۱۹۳۹) شمس العلما، مولانا محمد حسین آزاد، ضمیمہ اورینٹل کالج لاہور، میگزین

۳۵- محمد باقر، آغا، ادبی دنیا، خاص نمبر لاہور، دورہ پنجم شمارہ ہشتم

۳۶- محمد صادق، ڈاکٹر (۲۰۱۷) محمد حسین آزاد، احوال و آثار، مجلس ترقی ادب لاہور